Dr. MUGHNI TABASSUM
HAYAT AUR KARNAMAY
(Dr. MUGHNI TABASSUM LIFE & ACHIEVEMENTS)

THESIS

Submitted to the **UNIVERSITY OF HYDERABAD** in partial fulfillment of the requirement for the award of the degree of **DOCTOR OF PHILOSOPHY** in Urdu.

SUBMITTED
BY

SHAHEDA TASNEEM
M.A., M. Phil,

SUPERVISED
BY

DR. RAHMAT YOUSUFZAI
Professor & Head Department of Urdu,
University of Hyderabad.

DEPT. OF URDU,
SCHOOL OF HUMANITIES,
UNIVERSITY OF HYDERABAD, HYDERABAD - 500 046

December 2002

DEPT. OF URDU,
SCHOOL OF HUMANITIES,
UNIVERSITY OF HYDERABAD, HYDERABAD - 500046

CERTIFICATE

This is to certify that I, SHAHEDA TASNEEM, have carried out the research embodies in the present thesis **entitled "DR. MUGHNI TABASSUM HAYAT AUR KARNAMAY"** (DR MUGHNI TABASSUM LIFE & ACHIEVEMENTS) for the full period prescribed under Ph D ordinance of the University

I declare to the best of my knowledge that no part of this thesis was earlier submitted for the award of research degree of any University

31.12.02

(Signature of the candidate)
Name: SHAHEDA TASNEEM
M. A., M. Phil,
Enrolment No.98HUPH07

(Signature of the supervisor)
Prof. RAHMAT YOUSUFZAI

HEAD DEPARTMENT OF URDU,
University of Hyderabad

7/1/03

DEAN, SCHOOL OF HUMANITIES,
University of Hyderabad

ڈاکٹر مغنی تبسم

حیات اور کارنامے

مقالہ برائے

ڈاکٹر آف فلاسفی (اردو)

دسمبر ۲۰۰۲ء

مقالہ نگار

شاہدہ تسنیم

ایم۔اے، ایم۔فل،

نگران

ڈاکٹر رحمت یوسف زئی

پروفیسر و صدر، شعبۂ اردو۔

شعبۂ اردو۔ اسکول آف ہیومانیٹیز۔

یونیورسٹی آف حیدرآباد۔

حیدرآباد۔ ۵۰۰۰۴۶

پروفیسر مغنی تبسم

فہرست

ترتیب و تزئین

۱۔ حیدرآباد کا سیاسی، تہذیبی اور ادبی پس منظر

۲۔ حیات : خاندان، پیدائش، تعلیم، سیاسی سرگرمیاں، ملازمت، احباب، شادی، اولاد، مختلف اداروں سے وابستگی وغیرہ۔

۳۔ شخصیت

۴۔ ترقی پسند تحریک، جدیدیت، مابعد جدیدیت اور مغنی تبسم

۵۔ شاعری ــ آغاز و ارتقا

غزل گوئی ۔ نظم نگاری

نوائے تلخ، پہلی کرن کا بوجھ، مٹی مٹی میرا دل

شاعری کا تجزیہ ــ مختلف اداروں اور رجحانات کے پس منظر میں ذات کا کرب، تنہائی

صوتیاتی تجزیہ ــ مغنی تبسم کی شاعری کا استعاراتی نظام

ــ مغنی تبسم کے ہاں تصوف

۶۔ تحقیق ــ فانی بدایونی حیات، شخصیت اور شاعری۔ فانی کی نادر تحریریں۔

۷۔ تنقید ــ مقالے ۔ آواز اور آدمی ۔ لفظوں سے آگے

تبصرے ۔ بازیافت ۔ پس لفظ

تنقیدی شعور کا تجزیہ ــ مختلف تنقیدی نظریات

مغنی تبسم پر ان کا اثر ۔ مغنی تبسم کے صوتیاتی تجزیے۔

۸۔ ادبی صحافت۔

شبستانِ ادب ، شعور ، صبا ، شعروحکمت
سوغات ، سب رس۔

اداریے۔

اداریوں میں مختلف ادبی تحریکوں اور رجحانات
پر مغنی تبسم کا ردِ عمل۔
تنقیدی نظریات اور ادب کے بارے میں مغنی تبسم کا تصور

۹ متفرقات

۱۰۔ نگاہِ بازگشت

۱۱۔ توقیت نامہ

۱۲۔ سوانحی سنین۔ تخلیقی کام کے سنین

۱۳۔ ضمیمہ

۱۴۔ کتابیات

پیش لفظ

میں کون ہوں

ڈاکٹر پروفیسر مغنی تبسم میرے لیے ایک جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ میں نے انھیں اخباروں، رسالوں اور کتابوں میں پڑھا تھا۔ میں ان سے ملی تو نہ تھی لیکن تحریروں سے شناسا تھی۔ ایم۔فل کا نتیجہ ابھی نہیں آیا تھا کہ ۲۶ / ۲۷ جنوری ۱۹۹۹ء کو مغنی تبسم کی خدمات کے اعتراف میں ایک جشن منعقد کیا گیا۔ اس محفل میں میں شریک تو نہیں تھی لیکن اخباروں میں پڑھ کر میں نے ٹھان لیا کہ مجھے ایسے ہی وائلڈ رپرپی۔ ایچ ڈی کرنا چاہیئے۔ ایم۔فل کا نتیجہ نکلا اور مجھے امتیازی کامیابی حاصل ہوئی۔ اب میں پی۔ایچ ڈی اور خاص کر اس عنوان کی طرف متوجہ ہوئی پھر پی۔ایچ ڈی میں میرا داخلہ ہوگیا۔ میں نے سن رکھا تھا کہ کئی طلبا نے مغنی تبسم پر پی۔ایچ ڈی کرنے کی خواہش کی تھی لیکن مغنی صاحب نے انھیں منع کردیا۔ میں نے اپنے استاد پروفیسر سلیمان اطہر جاوید صاحب، حمایت اللہ صاحب اور ڈاکٹر صبیحہ نسرین کے سامنے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ ان لوگوں نے میری ہمت بندھائی اور کہا کہ مغنی تبسم صاحب

آپ کو ضرور کام کی اجازت دیں گے ۔ پھر ان اصحاب نے مجھے اطلاع دی کہ مغنی صاحب نے اجازت دے دی ہے پھر کیا تھا میری خوشیوں کا ٹھکانہ نہ رہا ۔ میرا خواب پورا ہو چکا تھا ۔ میں نے بارگاہِ تعالیٰ میں سجدۂ شکر ادا کیا ۔ اور دوسرے دن مغنی تبسم صاحب سے ملنے ادارۂ ادبیاتِ اردو پہنچا جہاں مغنی تبسم صاحب آفس میں بیٹھے کسی رسالے کے مطالعہ میں محو تھے ۔ میں اجازت لے کر اندر آیا تو انھوں نے مجھے بیٹھنے کے لیے کہا ۔ پھر میں نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے شکریہ ادا کیا کہ انھوں نے مجھے کام کرنے کی اجازت دی ۔ مغنی تبسم صاحب نے کہا آپ کل آکر بیاضیں ، مضامین اور دیگر مواد لے جا سکتے ہیں پھر میں نے دوبارہ شکریہ ادا کرتے ہوئے وہاں سے رخصت لی ۔ یونیورسٹی میں موضوع سے متعلق گفتگو ہوئی تو میں نے صدر شعبہ اردو پروفیسر انور الدین صاحب کے سامنے اپنے موضوع کا ذکر کیا تو انھوں نے کہا کیا آپ نے مغنی صاحب سے اجازت لی ہے میں نے کہا ہاں ، تو صدر شعبۂ اردو نے بھی اس بات کی اجازت دے دی ۔ یونیورسٹی کی رسمی کارروائیوں اور قواعد و ضوابط کی تکمیل کے بعد میں نے اس موضوع پر پروفیسر رحمت یوسف زئی کے زیرِ نگرانی کام کرنا شروع کیا ۔ کام کے دوران مجھے اندازہ ہوا کہ اُن کی تحریروں میں جو تہہ داری اور طرح داری ہے اُس کا تفصیل سے جائزہ ضروری ہے ۔ چنانچہ یہ مقالہ اسی زاویے سے سپردِ قلم کیا گیا ہے ۔ (۱۱) ابواب پر مشتمل اس مقالے کے پہلے باب میں حیدرآباد کے سیاسی ، سماجی ، اور ادبی پس منظر کا جائزہ لیا گیا ہے تاکہ یہ معلوم کیا جا سکے کہ مغنی تبسم کی ذہنی پرورش جس ماحول میں ہوئی وہ سیاسی ادبی اور تہذیبی اعتبار سے کن خصوصیات کا حامل تھی ۔

کسی بھی ادیب اور شاعر کے بارے میں پوری طرح جاننے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کی حیات کا احاطہ کیا جائے۔ دوسرے باب میں مغنی تبسم کی حیات اور ان کی ادبی مصروفیات اور اُن کے مختلف اداروں سے وابستگی کا ایک خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ حیات کے بارے میں جاننا اس لیے بھی ضروری ہوتا ہے کہ زندگی میں آنے والے نشیب و فراز سے آگاہی ہو سکے۔ اور یہ دیکھا جا سکے کہ ان نشیب و فراز کا ادیب و شاعر کی تحریروں پر کیا اثر پڑا ہے۔ مغنی تبسم کے خاندان کے بارے میں ایک بات حتمی طور پر کہی جا سکتی ہے کہ یہ بڑا ہی مذہبی قسم کا گھرانہ رہا ہے۔ اس لیے تصوف کا بھی عمل دخل اُن کے ہاں موجود ملتا ہے۔ پھر وہ ترقی پسند تحریک سے قریب ہوئے اور اس کے بعد غیر محسوس طریقے پر جدیدیت سے قریب ہوتے چلے گئے۔ زمانۂ طالب علمی میں معصوم حسین خاں کی تربیت نے انھیں سائنسی انداز میں ادبی تجزیے کے ہنر سے آگاہ کیا۔ تدریس کی وجہ سے اُن میں ایک بُردباری، خود اعتمادی، اور وسیع مطالعہ کی خوبیوں کا اجتماع ہوا۔ مغنی تبسم نے حیدرآباد کی علمی و ادبی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا وہ کئی اداروں سے وابستہ رہے ادارت کے فرائض سنبھالے اور اب بھی وہ ادارۂ ادبیات اردو کے معتمد عمومی کی حیثیت سے گراں قدر خدمات انجام دے رہے ہیں۔ کبھی نہ تھکنے والی اس شخصیت کی زندگی کا جائزہ ادب کے طالب علموں کے لیے کافی اہمیت کا حامل ہو سکتا ہے۔

شیرے باب میں مغنی تبسم کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ اور حیات کے ان عوامل سے

شخصیت میں پیدا ہونے والے نشیب و فراز کا اندازہ لگایا گیا ہے۔
ایک بات طے ہے کہ شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں سماج، ماحول،
خاندان، مطالعہ، مشاہدہ اور ان تمام کے ساتھ مزاج کی کیفیات
کا بھی دخل ہوتا ہے۔ اس باب میں مغنی تبسم کی شخصیت کے
پیچھے جو عوامل کارفرما رہے ہیں اُن کا تعین کیا گیا ہے۔

چوتھے باب میں ہندوستان میں رونما ہونے والی
ایک اہم ادبی تحریک یعنی ترقی پسند تحریک کے بارے میں چند
ابتدائی معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ حیدرآباد پر اس تحریک
کے اثرات کی نشاندہی کی گئی ہے۔ 1936ء سے لے کر 1948ء
تک ان بارہ برسوں میں حیدرآباد کی علمی و ادبی فضا میں
کافی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ سوچنے کے ڈھنگ بدلے، ترقی
پسند تحریک نے ذہین فنکاروں کو اپنی طرف راغب کیا۔ جن میں
مغنی تبسم بھی شامل تھے۔ لیکن بہرحال ان کا طالب علمی کا دور تھا۔
ریاست حیدرآباد کے ختم ہونے کے بعد بھی ترقی پسند خیالات اور
نظریات باقی رہے۔ مخدوم محی الدین، راج بہادر گوڑ، سلیمان
اریب اور کئی دوسرے اہم قلم کاروں نے اس تحریک کی چھاؤں
میں اپنے تخلیقی سفر کو جاری رکھا۔ ان میں مغنی تبسم بھی ایک تھے۔
پھر زندگی اور ادب کے نئے انداز فکر کی طرف اُن کی توجہ ہوئی۔
دنیا بھر میں ہونے والی تبدیلیوں اور ادبی رجحان کی کروٹوں
نے مغنی تبسم کو جدید طرز فکر کی طرف مائل کیا۔ جدیدیت کے
بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ اس کا آغاز سب فون کے اجراء
کے بعد ہوتا ہے۔ لیکن ہمیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ جدیدیت کا
اس سے پہلے ہی آغاز ہو چکا تھا اور حیدرآباد میں اس طرز
فکر کے بانیوں میں یقیناً مغنی تبسم بھی شامل کیے جا سکتے ہیں۔ اس لیے

ہندوستان میں جدیدیت کے فروغ کے ضمن میں جو کاوشیں ہوئیں
خصوصاً مغنی تبسم کے ہاں اس رجحان کی نشوونما کس انداز میں
ہوئی اس کا تجزیہ بھی کیا گیا ہے۔
اس مقالے کا پانچواں باب مغنی تبسم کی شاعری کے لیے
مختص کیا گیا ہے۔ اب تک ان کے تین مجموعے منظرِ عام پر
آ چکے ہیں "نوائے تلخ" "پہلی کرن کا بوجھ" "مٹی مٹی میرا دل"
اس کے علاوہ ان کی اور کئی غیر مطبوعہ اور مطبوعہ نظمیں
اور غزلیں ایسی ہیں جو ان مجموعوں میں جگہ نہ پا سکیں۔
اس باب میں مغنی تبسم کی شاعری کے مختلف ادوار کا تعین
کیا گیا ہے۔ اس میں پہلا دور تو واضح طور پر نظر آتا ہے جو
"نوائے تلخ" کی شاعری پر محیط ہے۔ اور جس میں تصوف،
مذہب، اخلاقیات، سماجی فکر اور اقبال کا لہجہ نمایاں ہے۔
اقبال نے نہ صرف ایک پوری نسل کو متاثر کیا بلکہ یہ پوری
صدی اقبال کی صدی کہی جا سکتی ہے۔ مغنی تبسم بھی اقبال کے
اس سحر سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ چنانچہ "نوائے تلخ"
میں اقبال کا تتبع واضح طور پر نظر آتا ہے۔ بعد میں ان کے
انداز نظر میں تبدیلی آئی جس کا اثر ان کی شاعری پر بھی پڑا۔
نئے کلام کو کتابی شکل میں مرتب کرنے کا خیال انھیں بہت بعد میں آیا۔
پہلی کرن کا بوجھ میں ان کی شاعری ایک نئی جہت کا احساس
ہوتا ہے جہاں قدرے ترقی پسندی کے ساتھ جدید لب و لہجہ اور
اس فن میں ان کا نقطہ نظر کھل کر سامنے آیا ہے۔ اس کے
ساتھ مغنی تبسم کی اپنی زندگی ذات کا کرب بھی اس مجموعہ میں
محسوس کیا جا سکتا ہے۔ ان کا تیسرا مجموعہ "مٹی مٹی میرا دل"
مغنی تبسم کی شاعری، شخصیت، مزاج اور ان کی مخصوص طرز،

فکر کو نمایاں طور پر پیش کرتا ہے۔ اس باب میں مغنی تبسم کی شاعری کا تجزیہ مندرجہ بالا قائم کیے گیے ادوار اور ادب میں موجود اس دور کے رجحانات کے پس منظر میں دیکھا گیا ہے۔ مغنی تبسم کی زندگی مختلف حوادث کا شکار رہی ہے۔ اس باب میں یہ بھی دیکھا گیا کہ ان کی اپنی ذات کا کرب اُن کی شاعری میں کس طرح داخل ہوا ہے۔ تنہائی کا کرب ایک ایسا مسئلہ ہے جو ایک ذہین اور دانشورانہ مزاج رکھنے والے فنکار کو بے چین رکھتا ہے۔ مغنی تبسم کے ہاں کرب، تنہائی کس طرح اور کیوں اظہار ہوتا ہے۔ اسباب کا بھی تجزیہ کیا گیا ہے۔ مغنی تبسم نے فانی کی شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے اُن کے ہاں مرتباتی نظام کو جدید علم لسانیات کی روشنی میں واضح کیا گیا ہے۔ اس بات کا امکان ہے کہ جس انداز سے انھوں نے فانی کا تجزیہ کیا ہے اس کا اثر ان کی شاعری میں در آیا ہو۔ مغنی تبسم کی شاعری کا مرتباتی تجزیہ ہمیں کچھ نئی جہتوں کی طرف نشاندہی کرتا ہے۔ ہر شاعر کے یہاں تشبیہ، استعارے اور علامتیں خاص انداز سے وقوع پذیر ہوتی ہیں۔ اس باب میں یہ بھی دیکھا گیا کہ ان کے استعاراتی نظام کو سمجھا جائے اور ان کے ہاں استعمال کی گئی علامتوں کا جائزہ لیا گیا۔ مغنی تبسم کو فرائڈ سے گہرا لگاؤ ہے۔ اس باب میں یہ بھی جائزہ لیا گیا ہے کہ شعوری یا غیر شعوری طور پر انھوں نے جو نظریات استعمال کی ہیں اس کی وجہ کیا ہے۔

اس مقالے کا چھٹا باب مغنی تبسم کی تحقیقی سرگرمیوں کا احاطہ کرتا ہے۔ پی۔ ایچ ڈی کے لیے ان کا

تحریر کردہ مقالہ فاں کی شخصیت اور شاعری اپنی نوعیت کا اہم مقالہ ہے۔ اس میں طالب علمانہ تحقیق کے ایک خاص منہج سے ہٹ کر اپنے منہج سے کام لیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ مغنی نبیم نہ صرف شاعر تھے اور شعر کو سمجھنے اور اس کے اندر اترنے کی بے پناہ صلاحیتوں کے حامل تھے۔ اور اس پر مستزاد حسین صاحب کی رہنمائی اور سرپرستی نے ان کے اندر چھپے ہوئے نقاد اور محقق کو اجاگر کیا ہے۔ مغنی نبیم کے اس مقالے کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس طرح کے تحقیقی کام شاذ ہی ہوں گے۔ اس باب میں مغنی نبیم کی تحقیق کے مختلف مراحل کا تجزیہ کرتے ہوئے ان کی تحقیقی بصیرت و بصارت کو متعین کیا گیا ہے اس کے علاوہ مغنی نبیم نے فانی بدایونی کی چند نادر تحریروں کو متعین کیا تھا اس کتاب کی روشنی میں تدوین متن کے سلسلے میں پیش آنے والی دشواریوں کا اندازہ لگایا گیا ہے۔

ساتواں باب مغنی نبیم کی تنقیدی صلاحیتوں کو اجاگر کرتا ہے۔ ان کے تنقیدی مضامین کے دو مجموعے "آواز اور آدمی" اور "لفظوں سے آگے" منظر عام پر آ چکے ہیں۔ اس کے علاوہ کافی عرصہ پہلے ان کی مختلف تحریریں جو تبصرے ہیں بازیافت کے عنوان سے شائع ہو چکی ہیں۔ بازیافت سے آواز اور آدمی اور پھر اس کے بعد لفظوں سے آگے کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ نقاد مغنی نبیم کا ذہنی سفر کن منزلوں سے ہمکنار رہا ہے۔ اس باب میں ان کے تنقیدی شعور کا جائزہ لیتے ہوئے تنقیدی

رجحانات اور فکر کو متعین کیا گیا اور یہ دیکھا گیا کہ اردو ادب میں نمودار ہونے والی مختلف رجحانات کا اثر مغنی تبسم پر کس طرح پڑا۔ تنقید کی ایک نئی جہت یہ بھی ہے کہ لسانی اعتبارات اور علم صوتیات کے نقطہ نظر سے بھی تخلیقات کا تجزیہ کیا گیا۔ مغنی تبسم نے اس نظریہ کو خاصا طور پر پروان چڑھایا ہے "آواز اور آدمی" میں شامل چند مضامین اس کی نشاندہی کرتے ہیں۔ اس باب میں ان تمام تنقیدی رویوں کا احاطہ کرکے مغنی تبسم کی ناقدانہ شخصیت کو متعین کیا گیا ہے۔ مغنی تبسم نے تخلیقی، تنقیدی اور تحقیقی سرگرمیوں کے علاوہ ادبی صحافت سے بھی اپنے آپ کو وابستہ رکھا۔ "شعر و حکمت" اور "سب رس" دو ایسے اہم رسالے ہیں جن کو انھوں نے اپنے خون جگر سے پروان چڑھایا، اس کے علاوہ سوغات کے لیے بھی مغنی تبسم نے گراں قدر خدمات انجام دیں ہیں۔ شبستان ادب اور شعور جیسے رسالے بھی مغنی تبسم کے مرہون منت رہے ہیں۔ کوئی مدیر جب رسالہ نکالتا ہے تو شعوری یا غیر شعوری طور پر اس کے تنقیدی نظریات اداریوں میں جھلکتے نظر آتے ہیں۔ اس باب میں مغنی تبسم کی ادبی صحافت کا احاطہ کیا گیا ہے۔ اور یہ معلوم کیا گیا ہے کہ مغنی تبسم کی تحریر کردہ اداریوں میں ادبی تحریکوں رجحانات اور متبع نظریات میں مغنی تبسم کے اپنے نظریات کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔ رسالے میں جو مشکلات ہوتے ہیں ان سے بھی مدیر کے تنقیدی شعور کا اندازہ لگایا گیا ہے۔ مختلف رسالوں میں شامل کیے گئے مضامین سے ہم اس بات کو بھی متعین کر سکتے ہیں۔ اس مقالے کا

نواں باب مجموعی محاکمے پر مشتمل ہے ۔ جس میں مغنی تبسم کی مجموعی خدمات تخلیق، تنقید، تحقیق کا محاکمہ کرتے ہوئے ان کے ادبی مرتبہ کا تعین کیا گیا ہے ۔ اس کے بعد ضمیمے کے طور پر ایک ایک توضیحی نامہ بھی شامل کیا گیا ہے ۔ جس میں سوانحی سنین اور تخلیقی کارناموں کے سنین کا اندراج کیا گیا ہے ۔

آخر میں کتابیات ہیں وہ ساری کتابیں اس میں درج کی گئی ہیں جن سے اس مقالے کی تسوید میں استفادہ کیا گیا ہے ۔

اس مقالے میں مجموعی طور پر میری کوشش یہ رہی ہے کہ معروضی انداز اختیار کروں ۔ کسی وابستگی سے صرف نظر کیا ہے اور یہی متاثر و مرعوب ہوئے بغیر محض تحریروں کی روشنی میں قلم اٹھاؤں ۔ میں اپنے طور پر مطمئن ہوں کہ میں نے یہ حق ادا کیا ہے اور یہی اطمینان میرے لیے اس مقالے کی تحریر کا بہت بڑا انعام ہے ۔

" آثار ابوالکلام " میں قاضی عبدالغفار نے مولانا ابوالکلام آزاد کے بارے میں لکھا ہے

" کتنا مشکل کام ہے کسی بڑی
شخصیت کی قومیت کا صحیح اندازہ
کرنا اور اس سے زیادہ مشکل
کام ہے اس اندیشہ کو دل سے
لگا لینا کہ کہیں ہم غلط اندازہ
نہیں کر رہے ہیں " [1]

---

[1] ۔ قاضی عبدالغفار " آثار ابوالکلام ایک نفسیاتی مطالعہ " ص ۷

اور حقیقت بھی یہی ہے کہ ایک بڑی شخصیت جس کے کارناموں سے نہ صرف اندرون ملک بلکہ بیرون ملک بھی متاثر ہے اس کی خصوصیات کو سمیٹنا مشکل کام ہے اور پھر لفظ مشکل بھی تو آسان ہا کی وجہ سے بنا ہے۔ رامتہ الحروف نے مشکل کام کو آسان کام کی شکل میں مدِ نظر رکھتے ہوئے اپنے دل سے غلط انداز کا اندیشہ نکال دیا ہے۔ اور اس سمندر کو ایک کوزے میں بند کرنے کی بھرپور سعی کی ہے۔

پروفیسر مفتی تبسم صاحب کی میں تہہ دل سے شکر گذار ہوں کہ انھوں نے تحقیق کے دوران مفید معلومات سے نوازا اور وہ تمام کتابیں فراہم کیں جو اس مقالے کے لیے ضروری تھیں۔

اس کام کے دوران مجھے اس بات کا شدید احساس رہا کہ اس قدر بلند پایہ ادیب، شاعر، نقاد، مدبر اور استاد کے شایانِ شان کام ہو سکے۔ اور میں پروفیسر مفتی تبسم کی تحریروں کی گہرائیوں تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکوں۔

استادِ محترم اور نگران پروفیسر رحمت یوسف زئی صاحب کی شفقت میرے لیے چراغِ راہ ثابت ہوئی اور ان کی رہبری مجھے تحقیق کی وادیوں میں بھٹکنے سے بچاتی رہی اور ان کا ہمدردانہ اور مشفقانہ سلوک علم نشان منزل ثابت ہوا۔ پروفیسر صاحب نے اپنی بے حد معمولی مصروفیات کے باوجود مجھے وقت دیا اور اس مقالے کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں ہر ممکنہ مدد کرتے ہوئے میری ہمت افزائی کی۔ دورانِ تحقیق جو موضوعات زیرِ بحث رہے، ہیں اس پر انھوں نے اہم معلومات سے مجھے روشناس کروایا۔ جس کی میں بے حد ممنون و مشکور ہوں۔ میں معراج آنٹی (اہلیہ ڈاکٹر رحمت یوسف زئی) کی بھی مشکور ہوں کہ دورانِ تحقیق آپ کا رویہ میرے ساتھ بہت ہی مشفقانہ رہا آپ

کی ہمت افزائی میرے لیے باعثِ فخر ہے۔

میں جناب پروفیسر انور الدین صاحب اور جناب پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ صاحب کی بھی شکر گذار ہوں کہ انھوں نے دورانِ تحقیق مجھے کتابیں فراہم کیں۔ ڈاکٹر میر محبوب حسین صاحب کی بھی شکر گذار ہوں کہ انھوں نے ہمیشہ اپنے مشوروں سے مجھے مستفید کیا۔ میں بصالت صاحبہ کی بھی شکر گذار ہوں۔

میرے والدِ محترم مرحوم سید علی صاحب کاشکار آج ہوتے اور مجھے اس مقام پر دیکھتے ۔۔۔ پھر بھی مجھے یقین ہے کہ اُن کی روح یہ سب دیکھ رہی ہوگی، رب العالمین ان کی مغفرت فرمائے۔ آمین

میں اپنی محترم المقام والدہ یعقوب بی صاحبہ کی قدم بوس ہوں جن کی سرپرستی، تربیت، ہمت افزائی اور دعاؤں نے مجھے اس مقام تک پہنچایا ہے اُن ہی کی بدولت یہ مقالہ لکھنے کی اہل بنی۔

میں اپنے بھائیوں سید احمد حسین صاحب، سید اطہر حسین صاحب اور سید مظہر حسین صاحب کی شفقتوں اور وسیع النظری پر مجھے فخر ہے اور بہنوں کی بے انتہا محبت اور چاہتوں کا دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کرتی ہوں۔ میں اپنے خالق کی ان نعمتوں سے سرفراز ہو کر اس کی بارگاہِ عظیم میں سربہ سجود ہوتے ہوئے اس کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔

میرے اس مقالے کی تکمیل میں میری بھتیجی شاہین سلطانہ میرے ہر قدم پر ساتھ رہیں اور ممکن حد تک میری مدد کی جس کے لیے میں ممنون و مشکور ہوں میں اپنی دوست مرزمیہ بیگم کی بھی شکر گذار ہوں جنھوں نے ہمیشہ میرے ساتھ تعاون کیا۔

میں جعفر جبری صاحب اور محمد عبدالغفار صاحب کی بھی شکرگذار ہوں
کہ انھوں نے ہمیشہ میری ہمت افزائی کی۔ میں نعیم بانو لکچرر کی بھی شکرگذار
ہوں کہ جن کی نیک خواہشات میرے ساتھ رہی۔ ٹوٹی قسمت سے جب
میرا کام آخری مراحل میں تھا اس وقت میں ایک حادثے سے دوچار ہوئی
میرا داہنا ہاتھ شدید زخمی ہوگیا اور میں خود لکھنے سے وقتی طور پر معذور
ہوگئی۔ لیکن میری بھتیجی شاہین سلطانہ نے اس موقع
پر مدد کی اور مقالے پر نظر ثانی کرنے کے دوران جہاں جہاں حذف و اضافہ
ہوا اس کی تسوید کر کے انھوں نے میرا ہاتھ بٹایا۔ یہی وجہ ہے کہ اس
مقالے میں جا بجا مختلف قسم کی تحریریں نظر آرہی ہیں۔

کوئی چیز حرف آخر نہیں ہوتی اور نہ ہی کمال کے درجے
کو پہنچ سکتی ہے اس مقالے میں اگر کچھ خامیاں ہیں تو وہ میری کم مائگی
پر محمول کیا جائے۔ اور اگر کوئی خوبی ہے تو اس کا سہرا میرے اساتذہ،
معاونین اور نیک خواہوں کے سر ہے۔

شاہدہ تسنیم

حیدرآباد کا سیاسی،
تہذیبی اور ادبی پس منظر

زمانۂ قدیم ہی سے حیدرآباد علم وفن اور شعروسخن کا مرکز رہا ہے جس کے دامن میں کئی نامور ادبا، شعرا، علما وفضلا نے جنم لیا۔ حیدرآباد دکن کو یہ فخر حاصل ہے کہ اردو زبان اس کے گود میں پلی پروان چڑھی۔ اُردو زبان کے آغاز کا سہرا بزرگان دین کے سر ہے۔ یہی وہ سرزمین ہے جہاں اُردو ادب نے پہلے پہل جنم لیا علاوہ ازیں زبان اردو میں تصنیف و تالیف کی ابتدا کا فخر بھی اسی خطہ ارض کو حاصل رہا ہے۔ جنوبی ہند کے اس عظیم ترین شہر حیدرآباد کی بنیاد، تعمیر وتشکیل میں نہ صرف سنگ وخشت استعمال ہوئے بلکہ اس میں عشق ومحبت کے مسالے کے علاوہ علم وادب کی آمیزش بنیادی واہم کردار کی حامل ہے۔ اس شہر کی رواداری اور مخصوص گنگا جمنی تہذیب نہ صرف ہندوستان بلکہ اقصائے عالم میں ممتاز ہے۔ اپنے قیام کے زمانے ہی سے شہر حیدرآباد علم وادب کا گہوارہ رہا ہے۔ سلاطین دکن نے بھی اردو ادب کی سرپرستی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ چنانچہ محمد قلی قطب شاہ نے اردو شعروادب کو ترقی کی راہ پر گامزن کیا۔ اور روز اوّل ہی سے قطب شاہی سلطنت اردو ادب کا گہوارہ بنی رہی۔

محمد قلی نے تقریباً اکتیس سال تک نہایت شان و شوکت کے ساتھ حکومت کی۔ وہ نہ صرف علم و ادب کا رسیا تھا بلکہ خود صاحب دیوان شاعر بھی تھا۔ اس کے علاوہ وہ محمد قلی قطب شاہ ایک حسن پرست، عاشق مزاج اور اولوالعزم بادشاہ ہونے کے ساتھ ساتھ علم دوست، ادب نواز، اہل کمال و فن کی قدر دان، عزت کرنے والا اور تمام مذاہب و عقائد کا احترام کرنے والا درد مند انسان بھی تھا۔ اس کی مبارک و ادب نوازی سے سرزمین حیدرآباد نہ اعتبار شعر و ادب کافی درخیز ہوئی۔ جس کی وجہ سے شعر و ادب کی فصل آج بھی یہاں سرسبز و شاداب نظر آتی ہے۔

قطب شاہی دور کے شعرا کے شعری کارناموں کے متعلق جناب نصیر الدین ہاشمی اپنی تصنیف "دکن میں اردو" میں لکھتے ہیں کہ:

"وجہی کی "قطب مشتری" غواصی کی "سیف الملک و بدیع الجمال" ابن نشاطی کی "پھول بن" جنیدی کی "ماہ پیکر" طبعی کی "بہرام و گل اندام" علام علی کی "بدماوت" اور لطف کا "طرنامہ" شاہکار ہیں"[1]

محمد قلی قطب شاہ کے بعد اس کا بھتیجا اور داماد محمد قطب شاہ تخت نشین ہوا یہ ایک متقی اور پرہیزگار بادشاہ تھا اس کو فنون لطیفہ سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے دور حکومت میں اعلا درجہ کے شعرا بھی پردۂ گمنامی میں چلے گئے اور شاعری کا بازار سرد رہا۔ اس میں شک نہیں کہ یہ بادشاہ بھی علم و فضل کا دلدادہ تھا۔ لیکن چونکہ یہ مدہبی مزاج کا حامل تھا

---

[1] ۔ نصیر الدین ہاشمی۔ دکن میں اردو، ص ۲۹۶۔

اس لئے علم وفن کے تمام شعبے مذہب کے زیرسایہ پروان چڑھنے لگے۔
چنانچہ اس نے شاعروں سے بھی مذہبی موضوعات پر فارسی اور
اردو میں کتابیں لکھوائیں ۔ اُس کے مذہب سے لگاؤ کی وجہ سے
بڑے بڑے مذہبی عالم وفاضل اس وقت حیدرآباد میں جمع ہوگئے تھے۔
ان میں علامہ ابن خاتون ، مولانا حسین آملی، شیخ جعفر علی، عشرتی،
یزدی ، میرمومن اور ملا عبدالحکیم قابل ذکر ہیں ۔

اس بادشاہ کے آخری زمانے میں البتہ چند شعری کارنامے وجود میں
آئے ۔ چنانچہ غواصی نے اپنی مشہور مثنوی سیف الملک وبدیع الجمال
اسی بادشاہ کے آخری عہد میں تصنیف کی ۔ اس کا دورِ حکومت سولہ
سال پر مشتمل ہے ۔ ۱۰۳۵ میں اس کی وفات ہوئی۔ اس سولہ سال
کے عرصہ میں دکن میں علمی اور عمرانی ترقی ہوئی مکہ مسجد کی تعمیر بھی
اسی بادشاہ کا ایک عظیم کارنامہ ہے

محمد قطب شاہ کے بعد اس کا فرزند عبداللہ قطب شاہ تخت نشین
ہوا ۔ یہ بادشاہ خود شاعر تھا اور شعروشاعری سے دلچسپی رکھنے
والوں کو عزیز رکھتا تھا ۔ چنانچہ اس کے دورِ حکومت میں اصحاب
کمال اور شعرائے نامدار کی سرپرستی رہی ۔ خوشنود ، جنید،
غواصی ، ابن نشاطی اور وجہی جیسے اعلیٰ پائے کے شعرا جو محمد قلی
قطب شاہ کے عہد میں گوشہ نشین ہوگئے تھے پھر ایک بار پوری
آب وتاب کے ساتھ اس بادشاہ کے دور میں نمودار ہوئے۔ ان
قدیم شعرا کے علاوہ ملک خوشنود اور جنیدی کا شمار بھی اسی دور
کے مشہور شعرا میں کیا جاتا ہے ۔ اس بادشاہ کے دور میں شعروشاعری
کو جو اہمیت دی گئی اس کے بارے میں ڈاکٹر زور اپنی تصنیف
"داستانِ ادب حیدرآباد" میں لکھتے ہیں :

" جب عبداللہ قطب شاہ حیدرآباد کا بادشاہ

ہوا تو قطب شاہی دربار میں علم و فضل اور فارسی
شعر و سخن کے مقابلہ میں پھر اُردو شاعری کو
ترجیح حاصل ہوگئی اور اُردو شاعری کی
بن آئی ۔[1]
وجہی اور غواصی جیسے اساتذۂ سخن جو محمد قلی کی وفات کے بعد زیادہ تر
خانہ نشین ہوگئے تھے پھر دربار میں بلائے گئے اور شاہی قدردانی سے
نوازے جانے لگے۔

اردو زبان و ادب کی ترقی میں عادل شاہی حکمرانوں کا بھی
نمایاں حصّہ رہا۔ چنانچہ ان کا دور بھی اردو دوستی اور علماء و شعراء
کی سرپرستی سے عبارت رہا۔ یہی وجہ ہے کہ آسمانِ اردو پر
کتنے ہی آفتاب و مہتاب ضوفشاں نظر آتے ہیں۔ محمد قلی، وجہی، غواصی
اور ابن نشاطی جیسے ممتاز شعراء کے بعد شعر و سخن کی اس زلف
گرہ گیر کو ولی نے سنوارا نکھارا اور ہمہ گیری عطا کی۔ شمالی ہند
میں اردو شاعری کا آغاز ولی کی تقلید میں ہوا۔ مختلف تذکرہ نگاروں
کا بیان ہے کہ ولی نے ۱۷۰۰ء کے لگ بھگ شمالی ہند کا سفر کیا تھا۔
یہ وہ زمانہ ہے جبکہ شمالی ہند میں شعر و ادب کی زبان فارسی تھی۔
شرفا اور اہلِ علم کے محفلوں میں فارسی کا چرچا تھا۔ اردو زبان
صرف بازار میں استعمال ہوتی تھی۔ ولی نے جب اپنا کلام وہاں کے
شاعروں میں سنایا تو اہلِ شمال کو اس بات کا احساس ہوا کہ
اردو زبان جسے وہ ایک "گنوارو" زبان سمجھتے تھے اس میں
اتنی وسعت ہے کہ اس میں شاعری بھی کی جا سکتی ہے۔ چنانچہ
ولی کی تقلید میں شمالی ہند کے دورِ اول کے شاعروں نے

---

[1] ۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ داستان ادب حیدرآباد ۔ ص ۲۶

جن میں نائز آبرو، ناجی، حاتم، یکرنگ وغیرہ نے اردو میں غزل گوئی کا آغاز کیا۔ اس لیے یہ دور غزل گوئی کا دور کہلاتا ہے۔ شمالی ہند کی شاعری کے دورِ اول میں یہاں کے سماجی اور سیاسی حالات اور ذہنی انتشار کے باعث کوئی بڑی مثنوی نہیں لکھی گئی البتہ دوسرے دور کے ابتدا میں صرف سودا اور میر ہی ایسے نظر آتے ہیں جنھوں نے مثنوی کی صنف میں نہ صرف طبع آزمائی کی بلکہ اس صنفِ سخن میں چند بلند پایہ مثنویاں بھی تصنیف کیں جو ابتدائی دور کی مثنویوں سے زیادہ ضخیم بھی ہیں اور تعداد میں بھی زیادہ۔ اورنگ زیب نے دکن فتح کیا تو صورت حال یک لخت بدل گئی۔ اورنگ آباد پایہ تخت بنا دیا گیا اور دکن کی ادبی صورتِ حال قدرے ماند پڑ گئی۔ چنانچہ وہ شعرا اور ادیب جو قدر دانیٔ کمال کی خاطر حیدرآباد میں مقیم تھے ان میں سے اکثر نے نقل مقام کیا لیکن بعض ایسے بھی تھے جنھوں نے دکن کے اجڑنے کے بعد بھی اس کو خیرباد نہیں کہا بلکہ وہ آخر وقت تک دکن کی بربادی پر آٹھ آٹھ آنسو روتے رہے۔ چونکہ وہ فاتح حیدرآباد شہنشاہ اورنگ زیب اور ان کے کارندوں کے ڈر سے اپنے جذبات و خیالات کو صاف ظاہر کرنے سے قاصر تھے اس لیے مرثیہ گوئی کو انہوں نے اپنا شعار بنا لیا تھا اور اپنے غم زدہ دلوں کی بھڑاس مرثیہ لکھ کر نکال لیتے تھے۔ غرض اس دورِ انتشار میں بہت سے مرثیے لکھے گئے۔ جب ۱۰۹۸ھ میں اورنگ زیب نے گولکنڈہ فتح کر کے اورنگ آباد کو اپنا مستقر بنا لیا تو اس کے ساتھ ہی اورنگ آباد کو سیاسی اہمیت کے ساتھ ساتھ اردو شعر و ادب کا مرکز بننے کا بھی فخر حاصل ہو گیا۔ اس کی شہرت جب ملک گیر ہو گئی تو دوسرے شہروں کے شاعر و ادیب بھی یہاں جمع ہونے لگے

اور وہ سلطنیں جو اُجڑ گئیں وہاں کے اہلِ کمال بھی یہیں آکر بس گئے۔

یہ پہلا موقع تھا کہ جب شمالی ہند اور دکنی زبان کے شاعروں نے اپنی زبانوں کے اختلاف اور لب و لہجہ کے فرق کو محسوس کیا تھا ابتدا میں اورنگ آباد کے شعرا کے کلام میں دکنی زبان کا اثر زیادہ پایا جاتا ہے لیکن شمال والوں کی آمد کے بعد سے یہ اثر رفتہ رفتہ کم ہونے لگا۔ بالآخر اورنگ آباد کی ادبی زبان شمال والوں کی زبان سے متاثر نظر آنے لگی۔

دوسری طرف شمالی ہند کے شعرا نے بھی دکنی ادب کی روایت کو اپنا لیا۔ دلّی کے وہ شعرا جنھوں نے دکنی زبان کے اثرات کو قبول کیا ان کے نام یہ ہیں۔ حاتم، آبرو، ناجی، مضمون اور بعد میں میر و سودا نے بھی ان اثرات کو قبول کیا۔ جس طرح شمال والوں نے دکنی زبان کے اثرات کو قبول کیا اسی طرح دکن کے شعرا نے بھی شمال والوں کا تتبع شروع کیا۔ ڈاکٹر لئیق صلاح "عہدِ ارسطو جاہ" میں لکھتی ہیں:

> "اورنگ آباد کے سب سے بڑے شاعر لچھمی نارائن شفیق، انعام اللہ خاں یقین کے کلام بہت متاثر کن تھے۔ ایک اور شاعر اسد اللہ خاں تمنا نے سوز کی پیروی کی اور جمال اللہ عشق نے درد کی تقلید کی۔ اس طرح شمال و دکن کے شعری روایات میں ردّ و بدل

ہوتا رہا"[1]

لیکن آنند ؒ کچھ ایسے حالات پیدا ہوگئے تھے جس کی وجہ سے اورنگ آباد میں شعروشاعری کا چرچا کچھ تھم گیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اورنگ زیب کی وفات کے بعد اس کے بیٹوں میں خانہ جنگی شروع ہوگئی جس میں شاہ عالم بہادر شاہ کو فتح ہوئی اور وہ دہلی کا بادشاہ ہوگیا۔ اس نے چار سال حکومت کی اور اس کے بعد جہاں دار شاہ اور فرخ سیر کے بعد دیگرے بادشاہ ہوئے فرخ سیر نے نظام الملک آصف جاہ اوّل کو دکن کی صوبہ داری پر مامور کیا۔ فرخ سیر کے بعد جب محمد شاہ نے اقتدار سنبھالا تو اس نے آصف جاہ اوّل کو دکن سے سنبھل اور پھر مراد آباد منتقل کر دیا پھر اس کے بعد انھیں مالوہ بھیج دیا گیا۔ پھر یہاں سے دہلی بلوا کر انہیں وزارت کے عہدے پر مامور کیا۔ اسی دوران نادر شاہ نے دہلی پر حملہ کیا جس کی وجہ سے مغلیہ سلطنت کی اینٹ سے اینٹ بج گئی۔

مرکزی سلطنت کے کمزور ہوتے ہی نظام الملک آصف جاہ اوّل نے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ آصف جاہ ایک بلند پایہ ادیب بھی تھے وہ نہ صرف امورِ سلطنت اور نظم ونسق میں ماہرانہ قدرت رکھتے تھے بلکہ اقلیم شعروسخن کے بھی بادشاہ تھے۔ مرزا عبدالقادر بیدل سے انھوں نے شعرگوئی میں اصلاح لی۔ تخلص شاکر تھا۔ لیکن بعد میں آصف اختیار کیا۔ آصف جاہ کے شعری سرمایہ میں فارسی کے دو ضخیم دواوین کے علاوہ نثر میں خسرو نامی مثنوی اور

---

[1] ڈاکٹر لیق صلاح ۔ عہدِ ارسطو جاہ ، ص ۲۶

احسن اشتمائل بھی آپ کی تصانیف ہیں ۔ فارسی کے علاوہ
اردو میں انھوں نے طبع آزمائی کی ہیں ۔

"شاعر سے قطع نظر آپ کا ایک نثری کارنامہ
(تاریخی وصیت نامہ) بھی ہے جو اُردو نثر میں ایک
شہ پارہ کی حیثیت رکھتا ہے ۔ آپ کے دورِ حکومت
میں اورنگ آباد شعروسخن کا مرکز بن گیا تھا ۔
ملک کے کونے کونے سے اہل کمال یہاں جمع ہو رہتے تھے
چنانچہ مولانا غلام علی آزاد بلگرامی ان ہی کے
عہد میں اورنگ آباد آئے اور یہیں پیوند خاک
ہوئے"[1]

آصف جاہ اول کے درباری شعراء میں درگاہ قلی خاں ۔ درگاں خواجہ
حوزوں ۔ علی نقی خاں ا-جاد اور مرزا داؤد وغیرہ قابلِ ذکر ہیں ۔
وہ شعراء جو برہان پور سے اورنگ آباد آئے تھے ان کے نام یہ ہیں ۔
نور محمد عامی ، میر یحییٰ خاں عاشق ، عظیم اور ابدال وغیرہ اور وہ
شاعر جو دکن کے اطراف واکناف سے یہاں آئے تھے ان میں
نوازش علی خاں شیدا ، میر محمد علی صبا ، میر جعفر سید رضا ،
غضنفر حسین غضنفر اور میر عاشق علی آیما وغیرہ وغیرہ ۔

"میر احمد علی خاں "عہد عثمانی میں اردو
خدمات" رسالہ دربار "آصفی" کے حوالے
سے لکھتے ہیں آصف جاہ اوّل کے دربار میں
یہ تمام شعراء عصر اور مغرب کے درمیان
جمع ہوتے اور بزمِ سخن آراستہ ہوتی جس

---

[1] ۔ سلام سندیلوی ۔ اُردو رباعیات ص ۔ ۲۰۹

میں آپ خود بھی دلچسپی لیتے اور جب
کبھی کوئی شعر پسند آجاتا تو بے ساختہ
اس کی داد دے کر شاعر کی حوصلہ افزائی
انعام و اکرام کے ساتھ فرماتے "[1]

آصف جاہ اوّل کے بعد ان کے فرزند ناصر جنگ تخت نشین ہوئے۔ انہوں نے صرف اردو زبان میں درس و تدریس کا آغاز کیا بلکہ تصنیف و تالیف کے میدان میں بھی کارہائے نمایاں انجام دیئے۔

ناصر الدولہ کے بعد اُن کے بڑے بیٹے افضل الدولہ نے حکومت سنبھالی۔ اس زمانے میں انگریزوں کے ساتھ حکومت حیدرآباد کے تعلقات میں اضافہ ہوا۔ یہی وہ زمانہ ہے جب حیدرآباد میں دارالعلوم اور مدرسہ عالیہ قایم ہوئے۔

۱۸۶۹ء میں میر محبوب علی خاں تخت نشین ہوئے اس وقت اُن کی عمر صرف تین سال تھی۔ چنانچہ نواب شمس الامراء اور نواب سالار جنگ اوّل کی نگرانی میں معاملات حکومت انجام پاتے رہے۔ محبوب علی خاں نے چالیس سال سے کچھ زیادہ حکومت کی اور 1911ء میں انتقال کیا۔ اور اُن کے بعد آصف سابع میر عثمان علی خاں تخت نشین ہوئے۔ اس دور کو بلاشبہ دکن کا سب سے تابناک دور کہا جاسکتا ہے۔

ان ہی کے عہد میں دستور ساز ہوئی معتمدی کے دفاتر قایم ہوئے جنھیں بابِ حکومت کا نام دیا گیا۔ اور جامعہ عثمانیہ کے نام سے ایک ایسا اعلیٰ تعلیم کا ادارہ وجود میں آیا جس کا ذریعہ تعلیم اُردو تھا۔ حصولِ علم کے بارے میں اُن کی

---

[1] ۔ میر احمد علی خاں ۔ عہد عثمانی میں اُردو خدمات ص ۔ ۴۴

دور رس نگاہوں نے یہ محسوس کرلیا تھا کہ یہی وہ واسطہ ہے جس سے قوم کی ترقی ممکن ہے۔ چنانچہ جامعہ عثمانیہ کے طریقہ تدریس میں ایسے نئے راستے اختیار کیے گئے جن کی وجہ سے یہاں کے تعلیم یافتہ طلبا نے دنیا بھر میں اپنی قابلیت کا لوہا منوایا۔ عثمان علی خاں خود شاعر بھی تھے اور شعرا کی سرپرستی بھی کیا کرتے تھے۔

۱۹۴۷ء میں ملک آزاد ہوا لیکن ریاستِ حیدرآباد ایک خود مختار ریاست کی حیثیت سے باقی رہی یہ بات ہندوستان کے سیاسی رہنماؤں کو پسند نہ تھی۔ چنانچہ ستمبر ۱۹۴۸ء میں حکومتِ ہند کی فوجوں نے ریاستِ حیدرآباد پر حملہ کر کے اسے ہندیونین میں شامل کرلیا اور اس طرح خاندانِ آصفیہ کی حکومت کا خاتمہ ہوگیا۔

۱۹۵۲ء میں عوامی انتخابات منعقد کیے گئے اور اس طرح ایک نئی دستوری حکومت سارے ہندوستان میں وجود میں آئی۔
ریاستِ حیدرآباد ایک سہ لسانی ریاست تھی اس میں تلگو، مراٹھی اور کنڑ آبادی والے علاقے شامل تھے اور صوبوں کی تقسیم اسی اعتبار سے کی گئی تھی یعنی تلنگانہ، مہاراشٹرا اور کرناٹک۔ ۱۹۵۶ء میں ہندوستان کی لسانی تقسیم عمل میں آئی منجملہ اور وجوہات کے ایک سب سے اہم پہلو یہ بھی تھا کہ ریاستِ حیدرآباد کی مخصوص لسانی ہم آہنگی کی روایات اور معاشرتی سطح پر رواداری کی بنیادی خصوصیات ہو ختم کردیا جائے چنانچہ ریاستِ حیدرآباد بھی تقسیم کردی گئی اس کا ایک حصہ آندھرا میں شامل کیا گیا مراٹھی بولنے والوں کے علاقے مہاراشٹرا میں ضم کر دیے گئے۔ اور کنڑی علاقہ ریاست کرناٹکا میں

شامل کرلیا گیا۔

سچ بات تو یہ ہے کہ مذہبی اور لسانی عصبیت دراصل انگریزوں ہی کی دین ہے۔ جب تک انگریز ہندوستان میں رہے تب تک انھوں نے عصبیت کے ہتھیار استعمال کر کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نفاق کی دیوار کھڑی کردی اور اپنی حکومت کو مضبوط کرتے رہے۔

جامعہ عثمانیہ کے قیام سے حیدرآباد میں ایک علمی انقلاب آگیا۔ نئے نئے علوم کے حصول سے عوام میں سائنٹفک اور جمہوری نقطۂ نظر پیدا ہوگیا۔ پڑھے لکھے نوجوان نئی تحریکوں اور نظریات سے متاثر ہونے لگے۔

۱۹۲۲ء تک حیدرآباد کے سیاسی حالات معمول کے مطابق رہے۔ کوئی شورش ہنگامہ یا فساد وغیرہ کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ بلا لحاظ مذہب و ملت تمام شیر و شکر کی طرح رہتے اور ایک دوسرے کے مذہبی احساسات و جذبات کا خیال رکھتے تھے۔ جب برطانوی ہند میں خلافت تحریک کمیٹی قائم کی گئی تو اس کے اغراض و مقاصد کو دیکھتے ہوئے حیدرآباد میں بھی ایک مرکزی خلافت تحریک کی داغ بیل ڈالی گئی جس کے معتمد اصغر یار جنگ تھے اراکین میں پنڈت کیشو رائو، مسٹر وامن نائک، عبدالحئی، آریہ سماج کے پنڈت کرشنا راؤ، عسکری حسن، محمد مرتضیٰ، ہمایوں علی مرزا وغیرہ شامل تھے۔ اس خلافت کمیٹی سے وابستہ افراد کو دیکھتے ہوئے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ ریاست حیدرآباد میں ہندو مسلم اتحاد کس قدر مضبوط مستحکم تھا۔

اس تحریک کے زیر اثر ہندوؤں اور مسلمانوں میں اتحاد

ویکجہتی کے جذبات کو اس قدر فروغ ہوا کہ
انھوں نے مشترکہ طور پر حکومت سے پُر زور مطالبہ
کیا کہ گائے ذبح کرنے پر قانونی پابندی لگائی
جائے جس کو حکومت نے تسلیم بھی کر لیا۔ مسلمانوں
کی طرف سے اس اظہار یگانگت اور فراخ دلی کا
مقامی ہندوؤں پر گہرا اثر پڑا جس کے نتیجے میں ۱۴ مئی
۱۹۲۰ء کو ویویک وردھنی تھیٹر میں جلسہ اظہار تشکر
رکھا گیا اور اسی تھیٹر میں اگست ۱۹۲۲ء میں
عید الضحیٰ اور راکھی پونم کا تیوہار مشترکہ طور پر
منایا گیا"[1]

جامعہ عثمانیہ کے قیام نے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو احساس کمتری
سے باہر نکالا، جس کی وجہ سے وہ شعر و ادب کے میدان میں
خود اعتمادی کے ساتھ تخلیقی کارنامے انجام دے سکے۔ اسی
زمانے میں ڈاکٹر زور، پروفیسر عبدالقادر سروری، پروفیسر نصیر الدین
ہاشمی اور اُن کے ساتھیوں نے ادارۂ ادبیات اُردو
کی بنیاد رکھی۔ جس کا مقصد حیدرآباد کے دانشوروں، عالموں،
ادیبوں اور شاعروں کو ایک مرکز پر مجتمع کرنا اور ان
کی علمی اور تحقیقی صلاحیتوں کو پروان چڑھانے میں مدد دینا تھا۔
چنانچہ بہت سے نوجوان قلم کاروں کی ابتدائی کاوشیں ادارۂ
ادبیات اُردو کی جانب سے ہوئیں۔ اس کے علاوہ ادارہ
کے ترجمان ماہنامہ "سب رس" نے ادبی تخلیقات کی اشاعت
کے ساتھ ادبی ذوق کی تربیت میں نمایاں حصّہ ادا کیا۔

---

[1] ۔ علی جواد رضوی، ریاست حیدرآباد کی جدوجہد آزادی، مطبوعہ روزنامہ سیاست
مورخہ ۲۶/ جنوری ۱۹۹۸ء

اس وقت اتفاق سے جوشؔ، علی اخترؔ اور علی منظورؔ جیسے بلند پایہ نظم نگار، امجدؔ جیسے عظیم رباعی گو شاعر اور فانیؔ، یگانہؔ، صفیؔ اور نجم آفندیؔ جیسے اساتذۂ غزل حیدرآباد میں داد سخن دے رہے تھے۔ ان کے علاوہ اقبالؔ، اختر شیرانیؔ، حفیظ جالندھری، جگرؔ مرادآبادی نوجوانوں کے مقبول اور پسندیدہ شاعر تھے۔ اسی زمانے میں جب سجاد ظہیر نے ۱۹۳۵ء میں اپنے ہم نواؤں اور ہم خیالوں کے ساتھ ہندوستان میں ترقی پسند تحریک کی بنیاد ڈالی تو بہت جلد نوجوان جوشیلے ادباء و شعراء نے اپنے آپ کو اس تحریک سے وابستہ کرلیا۔ اس تحریک سے وابستہ شعراء و ادباء نے جاگیرداری، سرمایہ داری اور بادشاہت کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ اس کے ذریعہ عوام میں بیداری کی لہر پیدا کی گئی جس سے جمہوریت کی راہ ہموار ہوئی۔

وہ ترقی پسند تحریک سے متاثر ہوکر مخدوم محی الدین نے حیدرآباد میں ۱۹۴۳ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی شاخ قائم کی۔ ویسے ۱۹۳۵ء ہی سے ترقی پسند تحریک کے اثرات حیدرآباد کی شعری فضا پر مرتسم ہو رہے تھے۔ چنانچہ جب مخدوم محی الدین نے انجمن ترقی پسند مصنفین کی شاخ قائم کی تو حیدرآباد کے بیشتر نوجوان شعراء و ادباء نے نہ صرف اس میں خصوصی دلچسپی لی بلکہ اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ بھی لیا اور ترقی پسندانہ خیالات و نظریات

کو فروغ دینے میں کلیدی رول ادا کیا"[1]
ان تمام پرجوش اور جذبۂ عمل سے سرشار نوجوان شعراء و
ادباء نے حیدرآباد میں ترقی پسند تحریک و رجحان کو مستحکم کیا
جس کے زیر اثر یہاں کے شعری مزاج میں روایت پسندی
سے ترقی پسندی کی طرف کوج کرنے کا متوازن میلان نظر
آتا ہے۔ اور پھر لاہور میں حلقۂ ارباب ذوق کا قیام عمل میں
آیا۔ حیدرآباد کے نوجوان شاعر نہ صرف ان فکری رجحانات
سے متاثر ہوئے بلکہ انھیں آگے بڑھانے کے عمل میں بھی حصہ لیا۔
حیدرآباد میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی شاخ نہایت سرگرم تھی
۱۹۴۴ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی کل ہند کانفرنس
حیدرآباد میں منعقد ہوئی۔ آزادی سے قبل مخدوم محی الدین،
سلیمان اریب، ابراہیم جلیس، اختر حسن، سلم ضیائی،
عالم خوندمیری، عابد علی خاں، راج بہادر گوڑ، فضل الرحمٰن،
امجد یوسف زئی، محبوب حسین جگر، وحید اختر، سری نواس
لاہوٹی، میکش، ع احمد، تحسین سروری، نظر حیدرآبادی،
مغنی تبسم، حامد قادری، شاذ تمکنت، حسینی شاہد اور کئی
ادیب و شاعر تنظیم سے وابستہ تھے۔ پھر اتحاد المسلمین کے
پرچم تلے رضاکار تحریک ہوئی تو ادیبوں اور شاعروں کا
ایک گروہ علیحدہ ہوگیا۔ اور انجمن مصنفین کے نام
سے اپنی ایک الگ تنظیم قائم کرلی۔
آزادیٔ ہند کے بعد انگریز ہمارے ملک کو چھوڑکر
چلے گئے۔ لیکن جاتے جاتے بھی وہ سازشوں سے باز نہیں آئے

---

[1] صلاح الدین نیر "حیدرآباد میں انجمن ترقی پسند مصنفین" مشمولہ "کہکشاں" ص ۹۷-۹۸

اور بڑی عیاری کے ساتھ پُرامن سرزمین پر علاقائی ،
لسانی اور مذہبی عصبیت کے بیج بو گئے جسے ہمارے نام نہاد
لیڈروں کی خودغرضی ، مفاد پرستی اور سیاسی فوقیت
کی تمنا نے اور ہوا دی۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ اس
جزیرہ نما کے رہنے والوں کی قابلِ لحاظ تعداد باہمی نفرت کے
اس تیز رَو اور بلاخیز دھارے کی زد میں آگئی۔

ان انسانیت سوز حالات کا تجزیہ کر کے کچھ
سنجیدہ ، شریف النفس اور انسان دوست دانشوروں ،
مدبّروں ، ادیبوں ، شاعروں نے ان کے پیچھے کارفرما
سازش کو جان لیا اور یہ حقیقت ان پر روشن ہو گئی کہ
بغض و عناد ، کینہ کپٹ ، غیض و غضب اور آپسی نفرت
کسی مسئلہ کا حل نہیں ، بلکہ انسانیت کی روشن جبیں پر
ایک بدنما داغ ہے۔ اس لیے انھوں نے اتفاق و اتحاد ،
پیار و محبت ، بھائی چارگی اور حب الوطنی کے جذبات کو
عام کر کے اس ملک کو جنت نشان بنانے کا بیڑا اٹھایا۔
یوں تو اس خطہ ارض کی خاک میں روزِ اوّل ہی سے محبت
و الفت ایثار و قربانی اور عفو درگذر کی خوشبو
پوری بسی ہے۔ چنانچہ کبیر داس کے دوہے اور شاعرِ
مشرق علامہ اقبال کے ترانے آج بھی اس بات کی غمازی
کر رہے ہیں ؎

سکتی بھی ٹانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

زمانے کو کسی حال پر چین نہیں ۔ اس کی فطرت انقلاب
سے عبارت ہے۔ زیر و زبر ہونا ہی وقت کی فطرت ہے۔

نور و ظلمت، غم و مسرت، عسرت و عشرت، ناکامی و کامیابی اور امید و ناامیدی حیاتِ انسانی کے نشیب و فراز ہیں۔ لیکن یہ بھی فطرت انسانی ہے کہ وہ مایوسی سے امید کی طرف پستی سے بلندی کی طرف پریشان حالی سے خوش حالی کی طرف اور مصیبت سے راحت کی طرف لپکنا چاہتا ہے۔ اس مقصد کے حصول اور تمنا کہ بر آنے کے لیے جس عزم و حوصلے جس شوق و لگن اور جس محنت و جستجو کی ضرورت ہے اس کا عرفان و ادراک ہر شاعر کے پاس مل جائے گا۔

آزادی کے بعد کے حالات نے جو کروٹ لی اس میں قومی یکجہتی کے احیاء کی پھر سے پوری شدت کے ساتھ ضرورت محسوس کی گئی۔ اور امن و آشتی کے فضاء پیدا کرنے کے لیے رنگ و نسل، علاقہ و زبان اور دھرم و مذہب کی تفریق سے بالاتر ہو کر صاف دل اور سیدھے سادے لوگوں میں حقیقی انسانی شعور کے بیدار کرنے میں صوفیوں اور سنتوں کے ساتھ شاعروں نے بھی نمایاں رول ادا کیا ہے۔ تاکہ یہ ذیلی براعظم ہر نظر بد سے محفوظ ہو کر امن، چین، سکون اور طمانیت کا ایک ایسا چمن زار بن جائے جس میں ہر کلی اور ہر پھول کو اپنی مہک سے اور رنگ سے ماحول کو دلکش بنانے کی اور ہر بلبل کو اپنی لے میں چہچہانے کی پوری آزادی حاصل ہو۔

اردو کے تعلق سے رواداری اور خیر سگالی کو جو عام فضاء پیدا ہوئی اس نے اردو شعر و ادب کی تخلیقی سرگرمیوں کو آگے بڑھانے میں مدد دی۔ شہر حیدرآباد شعر و ادب کا ایک اہم مرکز رہا ہے اردو ادب کی جو بھی تحریکیں ابھریں

ان کو پروان چڑھانے میں ادیبوں اور شاعروں کی خدمات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

تلنگانہ کی جد وجہد کے دوران ترقی پسند تحریک حکومت کے زیر عتاب آگئی اور انجمن سے تعلق رکھنے والے بہت سے ادیب اور شاعر گرفتار کر لیے گئے۔ اسی زمانے میں "محفل علم و ادب" کے نام سے جدید و قدیم نظریات رکھنے والے ادیبوں کو ایک مشترکہ پلیٹ فارم پر جمع کرنے کی کوشش کی گئی۔ پھر سلیمان اریب، سری نواس لاہوٹی اور دوسرے ترقی پسند ادیب جیل سے رہا ہو کر آئے تو اس "محفل علم و ادب" کو "عوامی مصنفین" کا نام دیا گیا یہ وہ زمانہ تھا جب ترقی پسند تحریک انتہا پسندی کا شکار ہو چکی تھی۔ جس کی وجہ سے انجمن ترقی پسند مصنفین کا شیرازہ بکھرنے لگا اور جب تحریک کے رہنماؤں کو اپنی غلطیوں کا احساس ہوا اور وہ تلخ حقائق پر مائل ہوئے تو سر پانی سے اونچا ہو چکا تھا۔ حیدرآباد میں انجمن ترقی پسند مصنفین پر بھی یہی بیتا پڑی اور بعد ازاں ترقی پسند مصنفین کے احیاء کی جو کوشش کی جاتی رہیں بار آور نہیں ہو سکیں۔ ترقی پسند تحریک کے اس آخری دور میں شاعروں کی جو نئی نسل سامنے آئی اس میں عزیز قیسی، مغنی تبسم، انور معظم، شاذ تمکنت، مغنی تبسم، وحید اختر، تاج مہجور، راشد آزر، ابن احمد تاب، قمر ساحری، امان اللہ، کلیف رضوان، اکمل حیدرآبادی، شور مینائی وغیرہ شامل ہے۔ ترقی پسند تحریک میں جو نظریاتی تبدیلی ہوئی تھی وہ اوپری سطح پر بھی شعر و ادب کو جانچنے کے معیار اور پیمانے بدلے ہیں تھے۔ جس کی وجہ سے نئی نسل کے شاعر اور ادیب اپنی پیشرو نسل سے ذہنی مطابقت

پیدا نہیں کر سکے اور ان نسلوں کے درمیان ایک نظریاتی جنگ شروع ہوئی اس سلسلے میں علی گڑھ میں خلیل الرحمٰن اعظمی نے ہماری زبان کے "رفتار" کے کالم میں اور حیدرآباد میں وحید اختر نے ماہنامہ "صبا" میں "سخن گسترانہ بات" کے عنوان سے جو مضامین لکھے وہ اس تحریک کا پیش نامہ سمجھے جا سکتے ہیں جو جدیدیت کے نام سے موسوم ہوئی۔ مخدوم محی الدین اور سلیمان اریب جو حیدرآباد میں ترقی پسند تحریک کے رہنماؤں میں تھے ان کے انداز فکر اور تخلیقی رویے میں نمایاں تبدیلی آگئی ان کی نظمیں زیادہ علامتی رنگ کی حامل ہوگئیں اور وہ نئے انداز کی غزلیں کہنے لگے۔ انہیں دنوں اریب نے اپنے ماہنامہ "صبا" میں نئے شاعروں کو متعارف کرانے کا سلسلہ شروع کیا۔

آندھرا پردیش کی تشکیل کے بعد آندھرا پردیش ساہتیہ اکیڈیمی کا قیام عمل میں آیا ابتدا میں اس اکیڈیمی نے اردو کی ترویج و اشاعت سے دلچسپی لی۔ ادیبوں اور شاعروں کی مالی امداد بھی کی اور حیدرآباد کے شاعروں اور ادیبوں کے تذکرے مرتب کروا کر شائع کیے جن میں بہت سے نئے لکھنے والوں کا تعارف کروائے ہوئے ان کی منتخب تخلیقات بھی شائع کی گئی تھیں لیکن کچھ عرصہ بعد وہ اردو کے تعلق سے بے نیاز سی ہوگئی۔

شاعری میں جدید رجحانات کے ساتھ غزل گوئی اور غزل سرائی کی روایت بھی آگے بڑھتی رہی۔ جلیل اور حفی کے معاصر اساتذہ کے بعد حیرت بدایونی، ناصر زیدپوری، حسرت ترمذی، حیدر پاشاہ قادری حیدر، شاہد صدیقی،

خورشید احمد جامی، قدر عریضی، علی احمد جلیلی، اوج یعقوبی، خاور نوری، خواجہ شوق، نظیر علی عدیل اور بعض دوسرے اساتذہ نے تلمذ اور اصلاح کے قدیم طریقے کو جاری رکھا اور کئی شاعروں کی تربیت کی ان کے علاوہ جو خوش گوار اور خوش فکر شعرا نے غزل کی صنف میں اپنی منفرد صلاحیتوں کا اظہار کیا۔

گذشتہ نصف صدی میں جدیدیت کی تحریک شعر و ادب کے بنیادی تخلیقی رویے اور اسالیب پر اثر انداز ہوئی ہے۔ جدید تر نسل کے بیشتر شاعر اس تحریک سے وابستہ ہیں پرانی نسل کے شعرا بھی ہمعصر میلانات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔ ہر تحریک کسی نہ کسی حد تک غلو اور بے اعتدالی کا شکار ہوتی ہے۔ جس کو تعمیری تنقید کے ذریعہ دور یا کم کیا جا سکتا ہے۔ حیدرآباد کے جدید شعرا بڑی حد تک افراط و تفریط بے اعتدالیوں اور انتہا پسندی سے محفوظ رہے اور انہوں نے اعتدال اور توازن کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ شاذ تمکنت، وحید اختر، مغنی تبسم اور راشد آذر کے بعد گذشتہ ۲۵ برسوں میں شاعروں کی جو نئی پود آئی اور جس سے مستقبل میں خوش آئند توقعات وابستہ کی جا سکتی ہیں۔ اس نے شاعری کی مختلف اصناف میں اظہار کے بعض قابل تحسین تجربے کیے ہیں۔

آزادی کے بعد سے آج تک شعری سرمایہ پر ایک طائرانہ نظر ڈالیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ حیدرآباد میں ترقی پسند اور جدیدیت کے دوش بہ دوش کلاسیکی مزاج کے حامل شعرا کا قافلہ بھی برابر رواں دواں ہے۔ جن میں قابل ذکر

شمس الدین تاباں، حمید الدین شاہد، سعادت نظیر، اوج یعقوبی، نظیر علی عدیل، رضی قادری، خواجہ شوق، ڈاکٹر علی احمد جلیلی، سعید شیدی، امیر احمد خسرو، صلاح الدین نیر، رئیس اختر، منور لعل بہار، قاضی انجم عارفی وغیرہ ہیں۔

ترقی پسندانہ اور جدید لب و لہجہ کے حامل شعراء شاعرات میں مخدوم محی الدین، سلیمان اریب، شاذ تمکنت، ڈاکٹر وحید اختر، خورشید احمد جامی، خیرات ندیم، رحمٰن جامی، غیاث متین، مضطر مجاز، راشد آذر، مغنی تبسم، شفیق فاطمہ شعریٰ، مصحف اقبال توصیفی، اسلم عمادی، قطب سرشار، رحمت یوسف زئی، علی الدین نوید، اقبال متین، راہی، علی ظہیر، رؤف خیر، بانو طاہرہ سعید، وقار خلیل، شاہد صدیقی، حسن فرخ، رؤف خلش، ستار صدیقی، عزیز قیسی، المظفر راہی، عقیل ہاشمی، محمد علی اثر وغیرہ کے علاوہ کئی دیگر شعراء و شاعرات ہیں۔

گذشتہ چند برسوں سے خواتین بھی شعر و سخن سے زیادہ دلچسپی لینے لگی ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ خواتین میں علم و ادب کا مذاق پیدا کرنے کی جو کوشش محب حسین نصیر الدین ہاشمی، عبد الرزاق بسمل، مغراء ہمایوں مرزا اور خورشید نذیر نے کی تھی وہ اب ثمر آور ہونے لگی ہیں۔ آج کل محفل خواتین کا ادارہ اس سلسلے میں بہت زیادہ سرگرم عمل ہے۔ ان خواتین شعراء میں جن کا مکالمہ اخباروں اور رسائل میں شائع ہوتا ہے اور جو شاعروں اور ادبی محفلوں میں داد سخن

لیتی ہیں ان میں چند قابلِ ذکر نام یہ ہیں ۔ امتہ الکریم، خورشید نذیر، عظمت عبدالقیوم، بانو طاہرہ سعید، زبیدہ تحسین، نایاب سلطانہ، سعادت جہاں رضوی شکر، عزیز النساء فہا، سیدہ مجید، اشرف رفیع، زبیدہ رعنا، ثریا مہر، قمر جمالی، مظہر النساء ناز، شاہدہ محبوب، انجم قمر سوز، بشریٰ عبدالواحد، نسیم نیازی وغیرہ ۔ ان کے علاوہ بشیر النساء بشیر ایک بلند پایہ شاعرہ تھیں ۔ شفیق فاطمہ شعریٰ جو جدید دور کے شعراء میں ایک اونچا مقام رکھتی ہیں ۔

آزادی کے بعد حیدرآباد کے شعری ماحول کو بنانے رکھنے اور شعر و شاعری کے ذوق کو پروان چڑھانے میں جہاں مختلف اکابرینِ ادب و اساتذۂ سخن نے انفرادی کوشش کی ہیں وہیں مختلف چھوٹی بڑی علمی و ادبی انجمنوں نے بھی اہم و مرکزی کردار ادا کیا ہے ۔ جن میں چند قابلِ ذکر انجمنیں حسبِ ذیل ہیں ۔

انجمن ترقی پسند مصنفین، انجمن ترقی اردو، اردو محفل، ادارۂ ادبیات اردو، ادارہ شعر و حکمت، سکریٹریٹ اردو اسوسی ایشن، مکتبہ شاداب، ادارہ ادب اسلامی، بزمِ نور، محفل خواتین، آندھرا پردیش اردو اکیڈیمی، ادارہ اقلیم ادب، مرکزِ ادب، ادارہ ذہنِ جدید، ایوانِ پرنس معظم جاہ شجیع، حیدرآباد اکیڈیمی، ادارہ میرا شہر میرے لوگ، بزمِ عالم، حلف، انجمن تہذیبِ ادب وغیرہ شامل ہیں ۔

یہ اور اس قسم کی کئی علمی، ادبی اور

تہذیبی انجمنیں اردو شعر و ادب کی ہمہ جہتی ترقی و فروغ کے لیے آئے دن مشاعرے، مباحثے، مذاکرے، سیمینار وغیرہ منعقد کرتی رہتی ہیں۔ ادبی ٹرسٹ، شنکر جی میموریل سوسائٹی اور زندہ دلانِ حیدرآباد کے سالانہ مشاعرے اپنی تاریخی حیثیت بنا چکے ہیں۔

ان انجمنوں کے علاوہ حیدرآباد سے شائع ہونے والے میقاتی رسائل اور اخبارات مثلاً سابقہ ماہی، سہ ماہی، ششماہی رسالوں میں "صبا"، "چراغ"، "خاتونِ دکن"، "شعور"، "سوغات"، "سب رس"، "شعر و حکمت"، "پیکر"، "رنگ و بو"، "نگوفہ"، "شاداب"، "خوشبو کا سفر" وغیرہ ہیں۔

روزناموں میں پیام، سیاست، رہنمائے دکن، منصف، اعوام، انگارے، آئینۂ حیدرآباد اور کثیر الاشاعت روزنامہ اخبارات نے اپنے ادبی صفحات کے ذریعہ حیدرآباد کی شعری روایت کو مضبوط و مستحکم بنانے میں قابلِ فراموش خدمات انجام دی ہیں اور دیتی آرہی ہیں۔

کسی بھی شخصیت کی تعمیر میں اس کے ماحول، سماجی، سیاسی، علمی، ادبی اور تہذیبی پس منظر کا اہم کردار ہوتا ہے۔ اسی لیے پچھلے صفحات میں حیدرآباد کا سماجی، سیاسی، معاشرتی اور علمی و ادبی پس منظر پیش کیا گیا ہے۔ تاکہ یہ اندازہ کیا جا سکے کہ پروفیسر مغنی تبسم کی

ذہنی نشوونما اور علمی، ادبی اور شعری صلاحیتوں
کی پرداخت میں کون سے عوامل کارفرما رہے
ہیں۔

حیات

سورت ہندوستان کی ایک بہت قدیم بندرگاہ ہے اور زمانۂ قدیم
میں سمندری سفر کے لیے اسی بندرگاہ کو استعمال کیا جاتا رہا تھا ۔ گجرات
اور سورت کا علاقہ تجارت کے لیے ہمیشہ مشہور رہا ہے بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے
کہ تجارت سندھ کے رگ وپے میں داخل ہے ۔ سات سو سال پہلے گجرات کے
جن مقامی باشندوں نے اسلام قبول کیا تھا انھیں مومن کہا جانے لگا اور
آہستہ آہستہ یہی لفظ میمن بن گیا ۔ مغنی تبسم اسی میمن خاندان کے
چشم وچراغ ہیں جن کے آبا واجداد کا پیشہ گجرات میں کھیتی باڑی تھا یہ
لوگ حلائی میمن کہلاتے تھے ۔ مغنی تبسم کے والد کا خاندان بوہرہ تھا
اور ماں کا سلسلہ نسب منڈھائی خاندان سے تعلق رکھتا ہے ۔ یہاں ایک
بات کی وضاحت ضروری ہے کہ گجرات کے رہنے والے میمنوں کو حلائی
میمن اور کچھ سے آنے والے میمنوں کو کچھی میمن کہا جاتا ہے ۔ گجرات کے
مسلمانوں اور خاص کر میمن خاندانوں میں سے زیادہ تر نے تجارت کو بطور پیشہ اپنایا ۔
اور ہندوستان بھر میں اپنی تجارت کا ایک طرح سے جال پھیلا دیا ۔ ان میمن گھرانوں
کی عام زبان بلکہ مادری زبان گجراتی رہی ۔ ان خاندانوں کی شاخیں ہندوستان
کے اکثر علاقوں میں مقیم ہوگئیں اور وہاں بھی تجارت ہی سے وابستہ رہے
لیکن ان کا طرز معاشرت گجراتی ہی رہا ۔ لیکن ظاہر ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ

طرزِ معاشرت پر مقامی اثرات غالب آنے لگتے ہیں

مغنی تبسم کے اجداد کا تعلق گجرات کے شہر سورت کے میمن خاندان سے ہے ان کے پردادا عبدالغنی سورت سے بغرض تجارت حیدرآباد آئے اور یہیں سکونت اختیار کرلی۔ انہوں نے میووں کا کاروبار کیا جب کہ عبدالغنی کے والد سورت میں میووں کی تجارت کرتے تھے چنانچہ میووں کی تجارت اگلی نسل میں منتقل ہوئی۔

عبدالغنی کے ایک بیٹے حاجی عبداللہ صدیق اور ایک بیٹی زلیخہ بائی تھیں۔ حاجی عبداللہ صدیق بھی اپنے والد کے ساتھ بچپن میں حیدرآباد آئے۔ یہیں حاجی عبداللہ صدیق نے عُلوم متداولہ کی تعلیم حاصل کی وہ خواجہ دکن حضرت سید محمد صدیق رحمت اللہ علیہ کے مرید اور خلیفہ تھے۔ انھوں نے بڑے پیمانے پر میووں کی فروخت کا کاروبار شروع کیا۔ حضور نظام ریذیڈنٹ اور حیدرآباد کے اکثر اُمراءِ عظام کے ہاں اُن ہی کے پاس سے میوہ جاتا تھا۔ حضور نظام نے ایک فرمان کے ذریعے اُن کے کاروبار کی سرپرستی کی۔ اُن کی کئی دکانیں تھیں خاص دکان چار کمان کے اندر واقع تھی جس پر اب تک ایک بڑا بورڈ لگا ہوا ہے جس پر نظام کا تاج بنا ہوا ہے اور یہ عبارت تحریر ہے

"بہ سرپرستی خاص اعلیٰحضرت قدر قدرت
بندگان عالی حضور پُرنور خلد اللہ ملکہ
و سلطنتہٗ ۔: حاجی عبداللہ صدیق
اینڈ کمپنی جنرل فروٹ مرچنٹ"

Haji Abdulla Sidick & Co
General fruit Merchant
By special appointment

To H.E.H. The Nizams
G. C. S. I "

وہ بہت مالدار تاجر تھے۔ جب اُن کا ۱۸ / مئی ۱۹۴۰ء کو
انتقال ہوا تو اخباروں میں یہ خبر شائع ہوئی۔

" ایک باخدا تاجر کا انتقال "

" حیدرآباد کی ایک میوہ کی مشہور دوکان جس
کو سرپرستی شاہانہ کا شرف حاصل ہے اس
کے مالک حاجی شاہ محمد عبد اللہ صدیق صاحب
قادری نے ایک طویل علالت کے بعد
بتاریخ ۱۰ / ربیع الثانی بعد ظہر انتقال
کیا۔ مرحوم کو حضرت خواجہ محمد صدیق محبوب
اللہ سے بیعت کی تھی۔ آپ نے بیس
پچیس سال سے گوشہ نشینی اختیار فرمائی تھی۔
دن رات ذکر الٰہی میں مشغول رہا کرتے تھے
دوکان کے سب کاروبار اپنے بڑے فرزند
حاجی محمد صدیق صاحب کے حوالے کردیا تھا۔
چھوٹے فرزند عبد الغنی صاحب بی۔ اے،
ال ال بی منصف تعلقہ یلدر ریڈی،
مرحوم کی بہترین یادگار ہیں۔ نماز جنازہ
مسجد النور قاضی پورہ میں حضرت
سید شاہ باقر حسین صاحب نے
پڑھائی جس میں عوام کے علاوہ
علماء کرام اور معززین و تجار
شریک نماز تھے۔ تدفین رات کے

دس بجے درگاہ شریف قادری چمن
میں عمل میں آئی۔ دوشنبہ کو فاتحہ سیوم
ادا کی گئی "[1]

حاجی عبداللہ صدیق کے دو لڑکے حاجی محمد صدیق اور
محمد عبدالغنی کے علاوہ تین لڑکیاں تھیں۔ میمنوں میں خواتین
کے لیے بیگم یا خاتون کے بجائے بائی کا لفظ استعمال کیا جاتا تھا۔
تین لڑکیاں عائشہ بائی، فاطمہ بائی اور خدیجہ بائی تھیں۔
اس زمانے میں میمن خاندان میں تعلیم کا زیادہ رواج
نہیں تھا تھوڑی بہت تعلیم دلانے کے بعد لڑکوں کو کاروبار پر
لگا دیا جاتا تھا۔ حاجی محمد صدیق بھی ابتدائی تعلیم حاصل کرنے
کے بعد والد کے ساتھ کاروبار میں ہاتھ بٹانے لگے۔ وہ اچھے
شاعر تھے اور صدیق تخلص کرتے تھے۔ اور مشاعروں
میں اپنا کلام سناتے تھے۔ اس زمانے کے دیگر اساتذۂ
سخن میں صفی اورنگ آبادی بھی شامل تھے۔ حاجی محمد
صدیق انہی کے تلامذہ میں شامل تھے۔ محمد عبدالغنی کو
تعلیم کا بہت شوق تھا۔ انھوں نے خاندانی رواج کے
برخلاف اعلا تعلیم حاصل کی۔ عثمانیہ یونیورسٹی سے
سائنس سے بی۔ اے کیا اس وقت بی ایس۔سی کی
ڈگری نہیں تھی۔ بعد ازاں ایل ایل۔بی کی ڈگری حاصل کی۔
حاجی عبداللہ صدیق اپنے بیٹے محمد عبدالغنی کو حضور نظام
کے پاس لے گئے۔ اور بتایا کہ وہ ایل ایل۔بی

---

[1] ۔ (دکن نیوز) ۔ پیام ۱۷ ۔ ۱۳۴۹ف روز چہارشنبہ
۲۲/مئی ۱۹۴۰ء / ۱۴ / ربیع الثانی ۱۳۵۹ھ ۔

کر چکے ہیں ۔ حضورِ نظام نے خوشنودی کا اظہار کیا اور فرمان جاری کیا کہ انھیں ان کی قابلیت کے مطابق ملازمت دی جائے ۔ محمد عبدالغنی سے دریافت کیا گیا کہ وہ کس محکمے میں جانا پسند کریں گے تو انھوں نے محکمۂ عدالت کو پسند کیا ۔ ابھی وہ یونیورسٹی میں زیرِ تعلیم تھے کہ ان کی شادی میمن تاجر اسمٰعیل دادا کی صاحب زادی حلیمہ بائی سے کر دی گئی ۔

محمد عبدالغنی کے تین لڑکے محمد عبدالمغنی، محمد عبدالمعطی، محمد عبدالمعی اور چھ لڑکیاں صدیقہ بیگم، کنیز فاطمہ بیگم، خیر النساء گلشنی، عائشہ گل جبیں، رقیہ بیگم اور رضیہ بیگم ہیں۔

محمد عبدالمغنی (مغنی تبسم) سب سے بڑے ہیں ۔ ان کی تفصیل آئندہ صفحات پر علٰحیدہ دی جا رہی ہے ان کے بعد محمد عبدالمعطی تھے جنھوں نے سائنس سے انٹر کیا اور پھر میڈیسن میں داخلہ لیا لیکن ان کے ایک دوست سردار بیگ نے انھیں گمراہ کیا اور عبدالمعطی نے نرس کی حیثیت سے عثمانیہ ہاسپٹل میں ملازمت کر لی ۔ پھر نرسنگ کی اعلیٰ ٹریننگ کے لیے Deputation پر امریکہ گئے اور وہیں مختلف دواخانوں میں کام کرتے رہے ۔ ان کی پہلی شادی سعدیہ سے ہوئی لیکن کسی وجہ سے طلاق ہو گیا ۔ سعدیہ سے ان کی ایک لڑکی نکہت اور دوسری لڑکی حمیرہ پیدا ہوئیں ۔ نکہت کی شادی ایک امریکن مسٹر رابرٹ سے ہو گئی ۔ اور حمیرہ حیدرآباد ہی میں بیاہی گئی ۔ سعدیہ سے علٰحیدگی کے بعد عبدالمعطی نے حیدرآباد ہی میں بشیر النساء بیگم سے شادی کی جن سے ایک لڑکا عبدالغنی جاوید دوسری لڑکی حمیرہ اور تیسری سمیرہ ہیں۔ جاوید نے کمپیوٹر کی تعلیم حاصل کی اور امریکہ میں مقیم ہو گیے ۔ حمیرہ اور سمیرہ نے میڈیسن کیا وہ بھی امریکہ چلی گئیں ۔ عبدالمعطی کی بشیر النساء سے بھی علٰحیدگی ہو گئی اس کے بعد امریکہ میں انھوں نے

تیسری شادی زبیدہ سے کی اُن سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ ان کا انتقال ہوگیا۔

۳۔ صدیقہ بیگم کی شادی عبدالقادر حبیب سے ہوئی جو حبیب حیدرآبادی کے نام سے مشہور ہیں۔ صدیقہ بیگم ادبی دنیا میں صدیقہ شبنم کے نام سے شہرت کی حامل ہیں۔ یہ بھی شاعرہ ہیں اور انگلستان کی ادبی سرگرمیوں کی روح رواں ہیں وہ حیدرآباد اسوسی ایشن (لندن) کی صدر بھی ہیں۔

ان کے بارے میں علی سردار جعفری لکھتے ہیں:

"حیدرآباد کی نفیس تہذیب کی آغوش میں پلنے والی
اور ایک نقاد شاعر بھائی کی بہن اور ادیب
شاعر کی شریک حیات ہے"[1]

صدیقہ شبنم ایک ایسی شاعرہ ہیں جن کے کردار، گفتار، صداقت اور شعور شعر گوئی سے نہ صرف برطانیہ کی اردو دنیا بلکہ برصغیر کا اردو داں طبقہ بھی اچھی طرح واقف ہے۔ ان کا پہلا مجموعہ کلام "تنہائی" کے عنوان سے نومبر ۱۹۸۶ء میں مکتبہ شعروحکمت کی جانب سے منظر عام پر آیا۔ اس کتاب پر پروفیسر گوپی چند نارنگ نے پیش نامہ کے عنوان سے مقدمہ لکھا۔ مقدمہ کے بارے میں مشتاق احمد یوسفی کہتے ہیں:

"پروفیسر گوپی چند نارنگ کا مقدمہ وہ بھاری
پتھر ہے جو چوم کر رکھنے کی بجائے ساتھ رکھنے
کے قابل ہے۔ اور جسے ہم لوگوں کی نظر بد
سے بچانا ہے"[2]

---

[1] ۔ علی سردار جعفری۔ صدیقی شبنم 'تنہائی' سیاست ۲۹ جون۔ ۱۹۸۷ء

[2] ۔ سید عاشور کاظمی (لندن) "تنہائی" کی رسم اجرا کے موقع پر پڑھا گیا مضمون۔ سیاست ۲۹/جون ۱۹۸۷ء۔

فیض احمد فیض کے دل پر یہ مجموعہ اس قدر اثر کر گیا کہ ان کی زبان سے بے ساختہ یہ دعا نکلی "جیتی رہو، اچھے شعر کہتی رہو"۔ سید عاشور کاظمی نے صدیقہ شبنم کی اس کتاب "تنہائی" پر اپنے خیالوں میں کہا

"صدیقہ شبنم وہ شاعرہ ہے جس نے کسی ادبی نظریاتی گروپ میں شمولیت کا واضح اعلان تو نہیں کیا لیکن اپنی شخصیت کی تکمیل کا بھرپور خیال رکھا ہے۔ اس کی گفتار صداقت اس کا کردار شرافت اور اس کے اشعار دیانت کے آئینہ دار ہیں۔" [1]

محمد عبدالقادر حبیب ۱۶ اپریل ۱۹۲۹ء میں دکن حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے نظام کالج سے گریجویشن کیا۔ اکتوبر ۱۹۵۷ء میں انگلستان گئے پھر وہیں مستقل سکونت اختیار کرلی اور بہ حیثیت چارٹرڈ اکاونٹنٹ فرائض انجام دیتے رہے۔ نوٹنگھم میں انھوں نے ایک مرکزی کتب خانہ قائم کیا اور وہاں اردو کی تعلیم کا بھی بندوبست کیا۔ ۱۹۷۲ء میں وہ کینٹ منتقل ہوگئے تھے اور وہاں اکیڈیمی آف اردو اسٹڈیز کی بنیاد رکھی۔ ۱۹۷۶ء میں انہیں اعزازی ڈاکٹریٹ بنایا گیا۔ ۱۹۸۱ء میں ان کی کتاب "انگلستان میں" شائع ہوئی جس میں انگلستان میں مقیم ایشیائیوں کے مسائل اور وہاں کی آبادی، تہذیبی زندگی کے بارے میں مضامین شامل ہیں۔

حبیب حیدرآبادی کی دیگر تصانیف میں "برطانیہ کی سیاسی جماعتیں اور پارلیمنٹ"، "رہ و رسم آشنائی" جو انشائیے اور

---

[1] سید عاشور کاظمی۔ "صدیقہ شبنم کی تنہائی" سیاست ۲۹ جون ۱۹۸۷ء

مضامین پر مشتمل ہے؟ ان کے علاوہ ان کا ایک اہم کام "رسول اللہ کا زمانہ اور زندگی" ہے جو انھوں نے انگریزی سے ترجمہ کیا۔ ان کی ایک اور کتاب "اسلام آباد سے کنیا کماری تک" بھی ہے لیکن نہ جانے کیوں ۱۹۸۸ء سے لے کر اب تک شائع نہ ہو پائی جبکہ اس کی اطلاع "برطانیہ کی سیاسی جماعتیں اور پارلیمنٹ" میں دی گئی ہے۔ حبیب حیدرآبادی کا ۷/مارچ ۱۹۸۹ء میں انتقال ہوا۔

۴۔ محمد عبدالمعی نے بے۔ اے تک تعلیم حاصل کی لیکن مکمل نہ کر پائے اور سعودی عرب چلے گئے جہاں انھوں نے سعودی ایرلائنس میں اٹھارہ سال کام کیا۔ ان کی شادی عذرا سلطانہ سے ہوئی جن سے دو لڑکے اور ایک لڑکی ہوئی۔ بڑا لڑکا عبدالمحسن ہے انھوں نے امریکہ میں کمپیوٹر سائنس میں ایم۔ ایس کیا اور وہیں ملازمت کر رہے ہیں ان کی شادی ہو چکی ہے۔ دوسرا لڑکا عبدالباری ہے انھوں نے میٹرک تک تعلیم حاصل کی اور اردو فاضل کا امتحان کامیاب کیا۔ یہ ابھی غیر شادی شدہ ہیں اس کے بعد رومانہ ہے جن کی دو سال قبل شادی ہوئی ان کے شوہر سعودی عرب میں انجنیر ہیں۔

۵۔ کنیز فاطمہ بیگم نے اردو سے ایم۔ اے کیا اور بعد ازاں بی ایل ایس سی بھی کیا اور نواجیون کالج میں لائبریرین مقرر ہوئیں۔ ان کی شادی عوض سعید سے ہوئی جو فوڈ کارپوریشن آف انڈیا میں اسسٹنٹ منیجر تھے۔ عوض سعید اردو کے ایک اچھے افسانہ نگار کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ ان کا تعلق عرب کے ایک یمنی نژاد قبیلہ "المصلی" سے ہے۔ ان کے اجداد تلاش معاش کے سلسلے میں حیدرآباد آگئے تھے۔

عوض سعید نے نظم و نثر کی ہر صنف سخن پر طبع آزمائی کی تھی۔ جس میں شاعری افسانے، ڈرامے اور خاکے وغیرہ شامل ہیں۔ ان کے پانچ افسانوں کے مجموعے اور ایک خاکہ شائع ہو چکے ہیں۔

۱۔ سائے کا سفر ۱۹۶۹ء

۲۔ تیسرا مجسمہ ستمبر ۱۹۷۳ء

۳۔ رات والد اجنبی۔جولائی ۱۹۷۷ء
۴۔ کوہ ندا ـــــ نومبر ۱۹۷۹ء
۵۔ بے نام موسموں کا نوحہ۔اگست ۱۹۸۴ء
۶۔ خاکہ ـــــ ۱۹۸۵ء

عوض سعید کی کتابوں پر میر ایوارڈ، اتر پردیش اردو اکیڈیمی اور آندھرا پردیش اردو اکیڈیمی کی جانب سے انعامات سے نوازا گیا۔ عوض سعید کے افسانے ہند اور پاکستان کے مختلف رسائل میں شائع ہوتے رہے ان کی ابتدائی افسانوں میں رومانیت کا اثر نمایاں ملتا ہے۔ چنانچہ پروفیسر مغنی تبسم ان کے افسانوں کے مجموعہ "سائے کا سفر" میں لکھتے ہیں:

"انھوں نے اس راہ میں پہلا قدم اس وقت اٹھایا جب اُردو افسانہ پختگی کی عمر کو پہنچ چکا تھا۔ مغربی ادب کی مختلف تحریکیں اور رجحانات ہمارے ادب میں بار پاگئے تھے۔ اظہار کے بہت سے اسالیب آزمائے جا چکے تھے۔ واقعات سے زیادہ کردار نگاری پر توجہ دی جانے لگی تھی۔ کردار کا ایک تصور یہ تھا کہ وہ اپنے طبقہ کا نمائندہ ہوتا ہے اور مخصوص سماجی اور معاشی عوامل اس کی تعمیر میں اہم حصّہ ادا کرتے ہیں اس کے مقابل دوسرا تصوّر یہ پیش کیا تھا کہ کردار ایک فرد ہوتا ہے جس کی ـــــ اور جنسی محرومیاں سماجی زندگی میں اپنے اظہار و انعکاس کی راہ ڈھونڈتی ہیں

اور یہی چیز اس کے انفرادی رویّہ کو
متعین کرتی ہے"[1]

عوض سعید کے افسانے گہرے فکری اور سماجی شعور کے آئینہ دار ہیں.
انھوں نے اپنے افسانوں میں جو زبان استعمال کی ہے اس کے بارے میں
اقبال متین لکھتے ہیں :

" وہ جو زبان استعمال کرتے ہیں وہ ان
کے تخلیق کردہ کرداروں کے لیے ایک
ایسے صیقل شدہ آئینے کا کام دیتی ہے جس
میں ان کے افسانوی کرداروں کا ایک
ایک نقش بنتا، سنورتا، ٹوٹتا اور پھر
اُبھرتا ہے۔ عوض سعید نہ بیدی کی کھردری
زبان کے قائل ہیں نہ کرشن چندر کی ترشی
ہوئی صاف ستھری زبان کے، ان کے پاس
زبان کا مسئلہ افسانہ کے منی دروبست
میں اظہار کے وسیلہ کے طور
پر سیکنڈری پارٹ ادا کرتا ہے۔
یہی وجہ ہے کہ ان کی برتی ہوئی
زبان بجائے خود کہانیوں میں
تخلیقی رول ادا کرتی ہے اور یہ بڑی
بات ہے"[2]

عوض سعید کے افسانوں کے متعلق ڈاکٹر عالم خوندمیری اس طرح

---

[1] ۔ پروفیسر مغنی تبسم ۔ مجموعہ "سائے کا سفر" ۔
[2] ۔ اقبال متین ۔ "تیسرا مجسمہ" ۔

رقم طراز ہیں :

"عوض سعید ان چند افسانہ نگاروں میں سے ہیں جنھوں نے اردو میں مختصر کہانی کی سطح کو بلند کیا۔ کہانی کے من پر قدرت رکھنے کے علاوہ زبان کو تخلیقی انداز میں برتنے کی اعلیٰ صلاحیت رکھتے ہیں۔ وہ اپنی مخصوص علامت نگاری کے ذریعہ ہم عصر انسانی صورت حال کو تخلیقی انداز میں پیش کرتے ہیں۔ جدید دور میں اردو افسانے کو ایک نیا موڑ دینے میں انھوں نے نمایاں حصہ لیا ہے"[1]

عوض سعید کے افسانوں کے کردار اپنی شخصیت کے دو پہلو رکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں وزیر آغا اپنی رائے اس طرح دیتے ہیں :

"عوض سعید کے افسانوں کی خاص بات کردار نگاری ہے۔ اس کے ہر کردار کے اندر ایک کردار چھپا ہوتا ہے جو باہر نکلنے کے لیے بالائی چھلکے کو برابر ٹھونگے مارتا رہتا ہے اور جہاں زمین گداز پاتا ہے وہیں سطح کو توڑ کر ایک دھماکے کے ساتھ باہر آجاتا ہے"[2]

---

[1] ۔ ڈاکٹر عالم خوندمیری ۔ عوض سعید کی کہانیاں مشاہیر کی آرا میں "آخر رات والا اجنبی" جولائی ۱۹۷۷ء

[2] ۔ وزیر آغا ۔ سرورق "سات کا سفر" (مجموعہ) ۱۹۶۹ء

فاطمہ اور عوض سعید کے دو اولادیں ہوئیں ایک لڑکا اوصاف سعید ہے جس نے آئی ایف ایس کا امتحان پاس کیا اور سرکاری ملازمت اختیار کی کچھ عرصہ وہ حیدرآباد میں بھی پاسپورٹ آفسر رہے پھر سعودی عرب کے ہندوستانی سفارت خانہ میں خدمات انجام دیں آج کل وہ ڈنمارک کے ہندوستانی سفارت خانہ میں فرسٹ سکریٹری ہیں۔ فاطمہ اور عوض سعید کی لڑکی سیمانتا طہٰ ہے جس نے ایم۔ بی بی ایس اور ایم۔ ڈی کیا۔ اُن کے شوہر وجاہت علی کمی ڈاکٹر ہیں اور دونوں اس وقت فلوریڈا امریکہ میں قیام پذیر ہیں

۶۔ خیر النساء گلشنی نے بی۔ اے پاس کیا اُن کی شادی حاجی سلیمان سے ہوئی جن کا مدورائی میں Raymond کا شوروم ہے ان کے ایک لڑکا شکیل سلیمان اور دو لڑکیاں مصباح بیگم اور شبنم ہیں۔ مصباح بیگم کی شادی معز شبنم کے بڑے لڑکے محتشم نوید سے ہوئی اور شبنم کے شوہر ڈاکٹر ہیں اور دونوں حیدرآباد ہی میں مقیم ہیں۔

۷۔ عائشہ گل جنہوں نے لنگوسٹک میں ایم۔ اے کیا ان کی شادی ڈاکٹر نعیم سے ہوئی جو دمام میں ہیں ان کے تین بیٹے ہیں جن میں سے دو آصف اور عاصم امریکہ میں مقیم ہیں اور تیسرا عادل ریاست کرناٹکا کے ایک میڈیکل کالج سے میڈیسن کی تعلیم حاصل کر رہا ہے۔

۸۔ رقیہ بیگم نے فارسی سے ایم۔ اے کیا ان کے شوہر یرو میر شیخ جیلانی امریکہ کی Tuskegee یونیورسٹی کے وائس پریسیڈنٹ ہیں۔ (امریکہ میں وائس چانسلر کو پریسیڈنٹ کہا جاتا ہے) ان کے ایک لڑکی اور دو لڑکے ہیں۔ لڑکی صدف نوشین اور لڑکا کامران میڈیسن کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں اور چھوٹا لڑکا عمران ابھی اسکول میں تعلیم پا رہا ہے۔

9 ۔ رضیہ بیگم بی۔ اے اور پھر بی ایل ایس سی کیا ان کے شوہر علام نورالدین ڈیرائن انجینیر ہیں اور امریکہ میں مقیم ہیں ان کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں بڑی لڑکی وسیمہ جرنلزم میں ایم۔ ایس کر رہی ہے ثمینہ نے بھی گریجویشن کیا۔ جب کہ عامر اور عرفان تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔

پیدائش اور تعلیم

محمد عبدالمعنی قلمی نام معنی تبسم۔ ۱۳/جون ۱۹۳۰ء کو آبائی مکان شکر کوٹھ میں پیدا ہوئے۔ چار سال کی عمر میں انھیں مدرسہ تحتانیہ چیلاپورہ میں داخل کیا گیا۔ والد کا تبادلہ جوگی پیٹ ہوا تو مدرسہ تحتانیہ جوگی پیٹ اور پھر مدرسہ تحتانیہ یلاریڈی میں تعلیم حاصل کی۔ یلاریڈی میں مڈل اسکول نہیں تھا اس لیے انھیں تعلیم کے لیے تایا کے پاس حیدرآباد بھیج دیا گیا۔ والد کا تبادلہ میدک ہوا تو میدک ہائی اسکول میں ساتویں جماعت میں داخلہ دلوایا گیا۔ ساتویں جماعت تک عبدالمعنی کا مضمون اختیاری فارسی تھا۔ پھر آٹھویں جماعت میں انھوں نے اعلیٰ ریاضی مضمون اختیاری لیا۔ وہ نویں جماعت میں زیرِ تعلیم تھے کہ والد کا تبادلہ حیدرآباد بہ حیثیت ناظم فوج داری بلدہ ہوا تب عبدالمعنی نے دارالعلوم ہائی اسکول میں داخلہ لیا۔ میٹرک میں بھی ان کا مضمونِ اختیاری اعلیٰ ریاضی تھا۔ میٹرک کامیاب کرنے کے بعد وہیں انھوں نے دارالعلوم کالج میں انٹرمیڈیٹ آرٹس کالج میں داخلہ لیا۔ ڈاکٹر زور اس کالج کے پرنسپل تھے۔ محمد عبدالمعنی سائنس یا ریاضی کی تعلیم حاصل کر سکتے تھے لیکن ٹھہرا دلچسپی کی بنا پر انٹرمیڈیٹ میں انھوں نے اردو، فارسی

اور معاشیات اختیار کیے۔ ۱۹۴۹ء میں انہوں نے جامعہ عثمانیہ میں بی۔ اے میں داخلہ لیا۔ بی۔ اے میں ان کے مضامین اُردو، سیاسیات اور معاشیات تھے۔ ۱۹۵۰ء میں بی۔ اے کامیاب کرنے کے بعد انہوں نے ۱۹۵۱ء میں ایم۔ اے اُردو میں داخلہ لیا اور ۱۹۵۲ء میں ایم۔ اے کامیاب کیا۔ ایم۔ اے کے بعد انھوں نے پی۔ ایچ ڈی میں داخلہ لیا۔ پہلی مرتبہ عنوان نظیر اکبر آبادی تھا۔ چونکہ اس وقت معنی تبسم عثمانیہ یونیورسٹی لائبریری میں بہ حیثیت کلرک کام کر رہے تھے۔ اس لیے پی۔ ایچ ڈی کا داخلہ روک دیا گیا۔ کیوں کہ کوئی کلرک بہ حیثیت خانگی امیدوار پی۔ ایچ ڈی نہیں کرسکتا چنانچہ انھوں نے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور درخواست کی کہ پی۔ ایچ ڈی کا داخلہ برقرار رکھا جائے۔ لیکن درخواست یہ کہہ کر رد کردی گئی کہ آپ کا داخلہ ہی غیر قانونی تھا۔ وجہ یہ بتائی گئی کہ انھوں نے جس وقت پی۔ ایچ ڈی میں داخلہ کی درخواست دی وہ ایک کلرک کی پوسٹ پر کام کر رہے تھے۔ محمد عبد المعنی نے دوسری مرتبہ پی۔ ایچ ڈی میں داخلہ لیا اور ان کے مقالہ کا عنوان "ڈاکٹر جان گلکرسٹ حیات اور کارنامے" تھا۔ اس وقت عثمانیہ میں پروفیسر جعفر حسین بہ حیثیت Dean اپنے فرائض انجام دے رہے تھے انھوں نے اعلان کیا کہ سارے ریسرچ اسکالرس نے جتنا بھی کام کیا ہے وہ لاکر بتائیں۔ معنی تبسم نے بھی بمبئی سے کافی مواد جمع کیا تھا اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کا جمع کردہ مواد دوسروں تک پہنچے لیکن وقت کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے انھوں نے خود ہی درخواست دے کر داخلہ منسوخ کروادیا دراصل اس وقت کے صدر شعبۂ اُردو پروفیسر عبدالقادر سروری ثمینہ شوکت کو پی۔ ایچ ڈی کروانا چاہتے تھے اور انھیں ثمینہ شوکت کے لیے کسی مناسب موضوع

اور تیار مواد کی تلاش تھی۔ تیسری مرتبہ پھر معنی تبسم نے پی۔ ایچ ڈی میں داخلہ لیا اُس وقت اُن کا عنوان ہاشمی بیجاپوری تھا اور انھیں مثنوی "یوسف زلیخا" کو ایڈٹ کرنا تھا اور انھوں نے تقریباً کام شروع کر دیا تھا لیکن حمید قتیل صاحب نے کہا کہ سالار جنگ مخطوطات کمیٹی کی طرف سے انھیں ہاشمی پر کام دیا گیا ہے۔ قتیل صاحب نے معنی تبسم سے خواہش کی کہ وہ اپنا عنوان بدل دیں۔ کیوں کہ انھیں اپنا کام داخل کرنا ہے تب معنی تبسم نے سمجھ لیا کہ یہ تمام سازش ثمینہ شوکت کے لیے چل رہی ہے۔ انھوں نے محسوس کیا کہ جب تک ثمینہ شوکت کا پی۔ ایچ ڈی نہیں ہوگا اس کا پی۔ ایچ ڈی نہیں ہو سکتا۔ اس لیے انھوں نے پی۔ ایچ ڈی کا ارادہ ترک کر دیا اور بے کار رہنے کی بجائے سوچا کہ فارسی سے ایم۔ اے کر لیا جائے۔ یونیورسٹی کا قاعدہ تھا کہ ایک مضمون سے ایم۔ اے کرنے کے بعد اس مضمون سے تعلق رکھنے والے دوسرے کسی مضمون سے ایم۔ اے کیا جا سکتا ہے۔ فارسی میں کوئی ریگولر طلبا نہیں تھے اس لیے انھیں ایک سال اور انتظار کرنا پڑا۔ پھر دوسرے سال ۱۹۵۹ء میں انھوں نے ایم۔ اے فارسی میں داخلہ لیا اور ۱۹۶۱ء میں فارسی سے ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد عبدالقادر سروری صاحب وظیفہ حسن خدمت پر سبک دوش ہو گئے اور ان کی جگہ معود حسین خاں صاحب آئے تب ۱۹۶۳ء میں معنی تبسم نے معود حسین خاں کے زیر نگرانی پی۔ ایچ ڈی میں داخلہ لیا۔ معود حسین خاں چاہتے تھے کہ فانی پر کام کیا جائے۔ معود صاحب نے بتایا کہ انھی فانی کے رشتہ دار اور چاہنے والے موجود ہیں اور آسانی سے مواد مل جائے گا اس طرح معنی تبسم کا پی۔ ایچ ڈی میں داخلہ ہو گیا اب ان کے مقالے کا عنوان تھا "فانی بدایونی، حیات شخصیت

اور شاعری" پھر مسعود صاحب نے ان سے کہا کہ فانی کی کلیات وغیرہ تو ہیں لیکن آپ حیات پر کام کریں۔ فانی جس جس شہر میں رہے وہاں جاکر مغنی تبسم نے معلومات حاصل کیں اور لوگوں سے خط و کتابت کی۔ جب حیات پر کام مکمل ہو گیا تو مسعود صاحب نے کہا حیات تو ایک حصّہ ہے اصل کام تو شاعری ہے تو پھر مغنی تبسم نے شاعری پر تفصیلی کام کیا۔ اس دوران مغنی تبسم ورنگل میں لکچرار کے عہدے پر فائز ہو گئے تھے اور پی۔ ایچ ڈی کی مدت صرف تین سال تھی جس میں سے ڈھائی سال گذر چکے تھے پھر یونیورسٹی نے نوٹس جاری کی کہ تین سال کے اندر اگر طلبا پی۔ ایچ ڈی کی تحقیق مکمل نہ کرلیں تو ان کا داخلہ منسوخ کردیا جائے۔ مسعود صاحب نے مغنی تبسم سے کہا کہ میں آپ کی کوئی مدد نہیں کرسکتا اب آپ کو کام مکمل کرنا ہوگا۔ لہذا مغنی تبسم ورنگل سے تین ماہ کی رخصت بغیر تنخواہ کے لے کر آئے اور یہاں آکر اپنا کام مکمل کیا اور پھر ورنگل واپس چلے گئے۔ اُس وقت انھیں کوئی اسکالرشپ نہیں ملتا تھا ورنگل سے آنے جانے اور یہاں قیام و طعام کے اخراجات وغیرہ تقریباً چھ ہزار تک ہوئے پھر تین ماہ کی تنخواہ بھی نہیں تھی یہ تمام اخراجات مغنی تبسم نے اپنے جیب سے پورے کیے اور اس طرح پی۔ ایچ ڈی کا کام مکمل ہوگیا۔ ۲۸/ڈسمبر ۱۹۶۶ء کو جامعہ عثمانیہ نے مغنی تبسم کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری عطا کی۔

مغنی تبسم کی طبیعت بچپن ہی سے شاعری کی طرف راغب تھی وہ گیارہ یا بارہ برس کے تھے کہ شعر کہنے لگے جیسا کہ پہلے لکھا گیا ان کے والد کا تبادلہ ایک ایسے تعلقے پر ہوگیا تھا جہاں صرف پرائمری اسکول تھا چوتھی جماعت کا امتحان کامیاب کرنے کے بعد مغنی تبسم تعلیم کے لیے شہر میں تایا کے پاس آئے۔ تایا بھی اچھے شاعر تھے

شہر میں آئے دن طرحی مشاعرے ہوا کرتے تھے جن میں وہ بڑے اہتمام کے ساتھ شریک ہوتے تھے انھیں قوالی سننے کا بھی شوق تھا۔ وہ مشاعروں اور قوالی کی محفلوں میں معنی تبسم کو بھی اپنے ساتھ لے جاتے۔ ان ہی محفلوں میں معنی تبسم کے ذوقِ شعر کی تربیت ہوئی اور موسیقی سے لگاؤ بھی پیدا ہوا۔ جو صرف سننے اور محظوظ ہونے تک محدود رہا۔ البتہ شاعری سے دلچسپی رفتہ رفتہ شعر گوئی تک لے گئی۔ شاید یہ سماع کی محفلوں کا اثر تھا کہ ابتداً معنی تبسم نے بعض بزرگانِ دین کی مدح میں نظمیں لکھیں۔ جب والد کا تبادلہ میدک پر ہوا تو معنی تبسم انھیں کے ساتھ رہنے لگے جس وقت وہ ساتویں جماعت میں تھے انھوں نے اپنے نصاب میں شامل ایک انگریزی نظم "سولجرس ڈریم" کا ترجمہ کیا جو اسکول میگزین میں شائع ہوئی۔ معنی تبسم کے والد بھی شعر کہتے تھے انھیں اپنے بیٹے کی شعر گوئی پر کبھی اعتراض نہیں ہوا بلکہ وہ خوش ہوتے تھے کبھی والد صاحب اور تایا صاحب یک جا ہو جاتے تو فی البدیہہ شعر کہنے کی محفل جمتی اور معنی تبسم کو بھی اس محفل میں شامل کر لیا جاتا۔ کسی شاعر کا دیوان کھولا جاتا اور پہلا جو شعر نکلتا اس کے مصرعِ ثانی کو طرح قرار دیا جاتا۔ ایسی ہی ایک محفل میں کہے ہوئے اشعار ذیل میں پیش کیے جاتے ہیں ؎

داستانِ غمِ الفت جو سنائی جاتی
تم سے کیا آس تھی جو آس لگائی جاتی

میں نے مانا کہ تغافل ہے شعارِ خوباں
کچھ جفا کاری میں غفلت ہی دکھائی جاتی

بارہ برس کی عمر میں فی البدیہہ ایسے شعر کہنے پر سب کو تعجب ہوا تھا اور انھیں کاشی داد دی گئی تھی۔ جب وہ دارالعلوم ہائی اسکول میں دسویں جماعت کے طالب علم تھے تو ان کے ہم حلقہ اور چند طالب علموں نے جوبلی ہائی اسکول اور دوسرے مدرسوں میں زیر تعلیم تھے اور شعر و ادب سے دلچسپی رکھتے تھے، آپس میں مل کر "شبستانِ ادب" کے نام سے ایک انجمن بنائی۔ انجمن کے اراکین میں معنی تبسم کے علاوہ الوالمعظم زین العابدین، احمد سلطان شاداں، محمود عوری اور قطب الدین یوسف شامل تھے۔ انجمن کے جلسے ہر ہفتہ کسی کے مکان پر ہوا کرتے تھے، افسانے، مضامین، نظمیں اور غزلیں پڑھی جاتیں۔ انجمن کی طرف سے ایک ماہنامہ بھی "شبستانِ ادب" کے نام سے جاری کیا گیا تھا۔ یہ سلسلہ ڈیڑھ سال تک جاری رہا۔ جب وہ انٹرمیڈیٹ میں تھے تو ان کے تایا نے حوصلہ افزائی کے لیے ان کا پہلا مجموعہ کلام "نوائے تلخ" شائع کیا جس پر اقبال کے کلام کا اثر غالب نظر آتا ہے۔ انھیں دنوں وہ حلقۂ اربابِ ذوق کے شعراء خصوصاً میراجی سے متاثر ہوئے۔ اقبال کی تقلید چھوڑ دی اور آزاد نظم لکھنے لگے۔ معنی تبسم نے اپنی نظمیں میراجی کو بھیجیں میراجی نے ان کی نظموں کو بہت پسند کیا اور اپنے رسالے "خیال" میں شائع کیا۔ کالج کے زمانے میں انہیں تنقید سے دلچسپی پیدا ہوئی چنانچہ دارالعلوم کالج کے میگزین "فکر نو" کے شماروں میں ان کے دو تنقیدی مضامین مخدوم محی الدین کی شاعری اور ماہر القادری کی غزل گوئی پر شائع ہوئے۔

سیاسی سرگرمیاں

معنی تبسم ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۲ء تک سیاسی

سرگرمیوں میں بھی شریک رہے ۔ ابھی وہ انٹرمیڈیٹ میں زیرِ تعلیم تھے کہ کالج کے چند ادیب دوستوں کے ساتھ ۱۹۴۷ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین میں شامل ہوئے ۔ ان دنوں روزنامہ پیام کے ایڈیٹر اختر حسن انجمن کے سکریٹری تھے ان ہی کے گھر پر انجمن کے ہفتہ وار جلسے منعقد ہوتے تھے ۔ تلنگانہ تحریک عروج پر تھی ۔ کمیونسٹ پارٹی پر پابندی تھی اور پارٹی کے بعض لیڈروں کو گرفتار کرلیا گیا تھا بہت سے لیڈر اور کارکن روپوش ہوگئے تھے حکومت کا عتاب ترقی پسند مصنفین پر بھی نازل ہوا ۔ کئی ادیبوں اور شاعروں کو گرفتار کرلیا گیا جن میں سلیمان اریب ، اختر حسن ، عالم خوندمیری ، رضیہ بیگم ، زینت ساجدہ ، حسینی شاہد اور سری نواس لاہوٹی وغیرہ شامل تھے ۔ مغنی تبسم ، عزیز قیسی ، نصیر افسر اور دوسرے نوجوان ادیبوں اور شاعروں نے سلیمان اریب کو سکریٹری بنا کر نصیر افسر کو ایکٹنگ سکریٹری مقرر کیا ۔ عزیز قیسی جوائنٹ سکریٹری اور مغنی تبسم ٹریژرر تھے ۔ اب انجمن ترقی پسند مصنفین کے جلسے نصیر افسر کے مکان پر ہونے لگے ۔ کچھ دنوں بعد انجمن کی طرف سے امن کانفرنس کے انعقاد کا اعلان کیا گیا ۔ اس اعلان کے شائع ہوتے ہی نصیر افسر کو گرفتار کرلیا گیا ۔ جب یہ محسوس کیا گیا کہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے نام سے کام کرنا ممکن نہیں تو اس کا نام بدل کر " محفل علم و ادب " کردیا گیا ۔ شاہ عباس کو معتمد نام رد کیا گیا ۔ محفل علم و ادب میں ایسے ادیبوں اور شاعروں کو بھی شامل کیا گیا جو ترقی پسند نہیں تھے تاکہ حکومت کی نظروں سے بچے رہیں ۔ اس زمانے میں اتفاق سے عثمانیہ یونیورسٹی میں کئی ادیب اور شاعر جمع ہوگئے تھے جیسے حافظ حیدر ، علاؤالدین حبیب ، سردار الہام ، مغنی تبسم ، اقبال راغب اور سید ادریس وغیرہ ۔ ان ادیبوں اور شاعروں نے آرٹس کالج میں انجمن ترقی پسند

مصنفین کی شاخ قائم کی ۔ اور ہفتہ وار جلسے منعقد کرنے لگے ۔ اس کے سکریٹری علاؤالدین حسیب تھے ۔

معین تبسم جب میدک ہائی اسکول میں زیر تعلیم تھے تب ہی سے انھوں نے مارکسزم کا مطالعہ شروع کر دیا تھا ۔ انہی دنوں مخدوم محی الدین کا مجموعۂ کلام "سرخ سویرا" شائع ہوا تو معین تبسم مخدوم سے متاثر ہوئے ۔ مخدوم محی الدین اسی اسکول کے طالب علم رہ چکے تھے جہاں معین تبسم تعلیم حاصل کر رہے تھے اور اسکول میں مخدوم کی شخصیت اور شاعری کے چرچے تھے ۔

انٹرمیڈیٹ میں جب وہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے رکن بنے تو کمیونزم سے ان کی ذہنی قربت بڑھ گئی ۔ جب وہ بی ۔ اے کے طالب علم تھے تو ان کے دوست احمد معظم نے انھیں اور مرزا مصطفیٰ علی بیگ کو کامریڈ اونکار پرشاد سے ملوایا جو روپوش تھے ۔ وہ کمیونسٹ پارٹی کی ایک ذیلی تنظیم لیگ آف ڈیموکریٹک یوتھ کے انچارج تھے اس خفیہ ملاقات کے بعد مغنی تبسم کمیونسٹ پارٹی کے اور بھی قریب آگئے اور لیگ آف ڈیموکریٹک یوتھ کے سرگرم رکن بن گئے ۔

چند ماہ بعد انھیں کمیونسٹ پارٹی کی ایک ذیلی تنظیم آل حیدرآباد اسٹوڈنٹس یونین سے منسلک کر دیا گیا جو حیدرآباد میں آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن کی ایک شاخ کی حیثیت سے کام کر رہی تھی اس تنظیم پر بھی عملاً پابندی تھی لیکن عثمانیہ یونیورسٹی میں آل حیدرآباد اسٹوڈنٹس یونین کی سرگرمیاں خفیہ طور پر جاری تھیں ۔ آل حیدرآباد اسٹوڈنٹس یونین کے عہدہ داروں کو ایک بار حیال آیا کہ حکومت سے ہماری تنظیم کو غیر قانونی قرار ہی دیا ۔ کیوں نہ کھل کر سامنے آئیں اور حکومت کا ردِ عمل دیکھیں ۔ چنانچہ ایک جلسہ ۱۹۵۲ء کو تھیوسوفیکل سوسائٹی ہال میں مغنی تبسم کی صدارت میں منعقد کیا گیا ۔ اس جلسے کے بعد کوئی گرفتاریاں

ہیں ہوئیں اور یہ تنظیم باضابطہ اپنے ہی بیانر پر اعلانیہ کام
کرنے لگی۔ مغنی تبسم کی درخواست
کے بغیر ہی پارٹی نے انھیں سن ۱۹۴۹ء میں رکنیت کارڈ دے دیا۔
اب وہ کلچرل فرنٹ پر کام کرنے لگے۔ اس فرنٹ کے سل کے
سکریٹری کامریڈ کلیم اللہ تھے اراکین میں حسینی شاہد، سری نواس
لاہوٹی اور مغنی تبسم شامل تھے

سن ۱۹۵۳ء میں مغنی تبسم نے جب تعلیم حاصل
کرنے کے بعد اے جی آفس میں ملازمت اختیار کرلی تو پارٹی سے
باضابطہ ربط قائم نہیں رہا لیکن نہ تو پارٹی نے انھیں علیحدہ کیا نہ
ہی انھوں نے استعفیٰ دیا البتہ پارٹی سے ان کی ہم دردی ہمیشہ
باقی رہی۔

ملازمت

پولیس ایکشن کے بعد مسلمانوں پر ملازمت کے
دروازے بند ہو چکے تھے۔ ریاست کے کسی محکمے میں تھرڈ گریڈ کی
ملازمت بھی مشکل سے مل سکتی تھی۔ لیکن ۱۹۵۳ء میں عثمانیہ
یونیورسٹی میں الیف۔ اے، بی۔ اے، بی۔ کام اور بی۔ ایس سی میں
ثانوی زبان کے طور پر کسی ایک زبان کی تعلیم لازمی قرار دی گئی۔
جس کی وجہ سے زبانوں کے شعبوں میں لکچررس کی کئی جائیدادیں
نکل آئیں۔ اس وقت مغنی تبسم نے اردو سے ایم۔ اے کرلیا تھا۔
اردو میں بھی کئی جائیدادیں نکلیں لیکن ان جائیدادوں پر
عربی اور شعبہ دینیات کے اساتذہ کا تبادلہ کیا جانے
لگا۔ کیوں کہ ان شعبوں میں طلبا داخلہ نہیں لے رہے تھے۔
اس وقت علی یاور جنگ کے بعد نظام کالج کے پرنسپل

ڈاکٹر سید حسین عثمانیہ یونیورسٹی کے کارگزار وائس چانسلر کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ معنی تبسم نے وائس چانسلر سے مل کر احتجاج کیا کہ اردو کے شعبے میں عربی اور شعبۂ دینیات کے اساتذہ یوں ہی تبادلہ کیا جاتا رہا تو اُردو میں کوئی ڈگری ہیں رکھے اُردو کے طلبا کا کیا حال ہوگا اور اُردو سے سالقہ فارغ التحصیل طلبا کہاں جائیں گے۔ پروفیسر سید حسین نے جواب دیا کہ یہ علی یاور جنگ کی بنائی ہوئی پالیسی ہے وہ عارضی وائس چانسلر ہیں اس پالیسی کو بدل ہیں سکتے۔ انھوں نے مشورہ دیا کہ وہ ایچ ڈی کرلیں۔ فی الحال یونیورسٹی کے کسی آفس میں کوئی جگہ ہو تو اس پر ان کا تقرر کردیں گے تاکہ کچھ مالی اعانت ہو سکے۔ معنی تبسم کی ناامیدی پر انھوں نے عثمانیہ یونیورسٹی لائبریری میں بہ حیثیت کلرک ان کا تقرر کردیا۔ اور پی۔ ایچ ڈی میں داخلہ بھی دے دیا۔ دوسرے لائبریرین صرف گریجویٹ تھے اور لائبریری سائنس کا سرٹیفکیٹ رکھتے تھے وہ پسند ہیں کرتے تھے کہ ان کے اسٹاف کا کوئی آدمی ان سے زیادہ تعلیم یافتہ ہو۔ چھ ماہ بعد جب ڈاکٹر سید حسین کی مدتِ کارگزاری ختم ہوئی تو لائبریرین نے معنی تبسم کو پی۔ ایچ ڈی کا داخلہ یہ کہہ کر منسوخ کرادیا کہ کوئی کلرک خانگی امیدوار کی حیثیت سے پی۔ ایچ ڈی ہیں کرسکتا۔ جس کے بعد معنی تبسم نے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ اِن ہی دنوں اے جی آفس (صدر محاسبی) میں ایر ڈیویژن کلرکس کی جائیدادوں پر تقرر کے لیے اخباروں میں اعلان شائع ہوا۔ معنی تبسم کے دوست اور ہم جماعت محمد حسین رضوی نے جو ان کے ساتھ لائبریری میں ملازم تھے اپنی درخواست کے ساتھ معنی تبسم کی طرف سے بھی درخواست دے دی۔ انھیں انٹرویو کے لیے

ملا دیا گیا۔ معنی تبسم انڑویو ہیں دیا چاہتے تھے لیکن والد نے محسوس کیا کہ انڑویو دے دیں ملازمت نہ کریں تو نہ کریں۔ انڑویو میں ان کا سلکشن ہوگیا۔ والد نے مشورہ دیا کہ پی۔ ایچ ڈی میں داخلے کے لیے ابھی کچھ مدت باقی ہے تب تک بے کار رہنے کی بجائے ملازمت کرلیں۔ لیکن معنی تبسم کو یہ ملازمت پسند نہیں تھی۔ انھوں نے صدر شعبۂ اردو پروفیسر عبدالقادر سروری سے خواہش کی کہ انھیں بہ حیثیت لکچرار جز وقتی کام بھی دیا جائے تو وہ ملازمت چھوڑ دیں گے۔ اگلے سال یعنی ۱۹۵۵ء میں پروفیسر سروری نے حیدرآباد ایوننگ کالج میں ہفتہ میں دو گھنٹے پڑھانے کا کام انھیں دیا اور مشورہ دیا کہ وہ ملازمت نہ چھوڑیں بلکہ اپنے محکمے سے جز وقتی پڑھانے کی اجازت حاصل کرلیں۔ درخواست دینے پر محکمے سے اجازت نہیں ملی۔ انھوں نے پھر سروری صاحب سے خواہش کی کہ کم از کم ہر ہفتہ چھ گھنٹے پڑھانے کا کام دے دیا جائے تو وہ ملازمت چھوڑ دیں گے۔ چنانچہ ۱۹۵۶ء میں حیدرآباد ایوننگ کالج میں انھیں ہر ہفتہ چھ گھنٹے پڑھانے کا کام دیا گیا اور انھوں نے اے جی آفس کی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ چند ماہ بعد بدرو کا کالج آف کامرس میں بھی جز وقتی لکچرار کی حیثیت سے ان کا تقرر ہوا۔ پھر ایک سال بعد ان کا تقرر ہمہ وقتی لکچرار کی حیثیت سے سکندرآباد کالج ہوگیا۔ اسی زمانے میں وہ اردو آرٹس کالج اور اورینٹل کالج میں بھی اعزازی طور پر پڑھاتے رہے۔ اس کے بعد وہ عثمانیہ یونیورسٹی کے مختلف کالجوں میں خدمات انجام دیتے رہے۔ ۱۹۶۴ء میں ان کا تبادلہ آرٹس کالج پر ہوا۔ ۱۹۶۹ء میں انھیں ریڈر کے عہدے پر ترقی دی گئی اور ۱۹۸۳ء میں پروفیسر منتخب

ہوئے ۔ ۱۹۸۵ء میں ایک سال کے لیے سنٹرل یونیورسٹی آف حیدرآباد سے وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے ان کی خدمات حاصل کیں ۔ ۱۹۸۸ء میں صدر شعبۂ اُردو عثمانیہ یونیورسٹی کی خدمت پر فائز ہوئے اور ۱۹۹۰ء میں وظیفہ پر سبکدوش ہوئے ۔

ابھی وہ یونیورسٹی میں ہی تھے کہ انھیں ادارۂ ادبیاتِ اُردو کے شعبۂ امتحانات کا اعزازی معتمد مقرر کیا گیا ۔ "سب رس" کی ادارت کے فرائض بھی ان کے تفویض ہوئے ۔ اس وقت ہاشم علی اختر صاحب ادارے کے اعزازی معتمد تھے ۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرر ہونے کے بعد انھیں "ادارۂ ادبیاتِ اردو" کا صدر نامزد کیا گیا ۔ رمن راج سکینہ کو معتمد اور مغنی تبسم کو شریکِ معتمد منتخب کیا گیا ۔ ۴/اپریل ۱۹۹۴ء کو ہاشم علی اختر صاحب امریکہ منتقل ہوئے تو جعفر نظام صاحب کو صدر، عبدالکریم خاں صاحب اور رمن راج سکینہ صاحب کو نائب صدر اور مغنی تبسم کو معتمد عمومی نامزد کیا گیا ۔

۲۰۰۲ء میں مجلسِ عاملہ نے جناب زاہد علی خاں ایڈیٹر روزنامہ سیاست کو ادارۂ ادبیاتِ اُردو کا صدر نامزد کیا اور مغنی تبسم حسبِ سابق اسی عہدے پر فائز ہیں اور اپنی شبانہ روز محنتوں سے ادارۂ ادبیاتِ اُردو کے وقار میں اضافہ کر رہے ہیں ۔

ددھیال

شجرۂ خاندان پروفیسر مغنی تبسم

نور محمد (سگڑ دادا)

حاجی عبدالغنی (پردادا)

حاجی عبداللہ صدیقی (دادا) — ایک صاحب زادی زلیخا بائی

حاجی محمد صدیق (اہلیہ حلیمہ بائی) — عائشہ بائی (زوجہ عبدالکریم) — محمد عبدالغنی (والد) (اہلیہ حلیمہ بائی (والدہ)) — خدیجہ بائی (زوجہ ڈاکٹر کالو بھائی) — فاطمہ بائی (زوجہ عبدالکریم)

ننھیال

حاجی محمد اسمٰعیل (نانا)

آمنہ بائی (نانی)

- حلیمہ بائی — والدہ مغنی تبسم
- فاطمہ بائی — محمد احمد سیٹھ
- ہاجرہ بائی — محمد عثمان
  - قمر النسا
  - محمد فاروق
  - محمد یونس
  - زیب النسا
  - دریفہ
- حنیفہ بائی — عبدالشکور سیٹھ
  - امتیاز احمد — زوجہ ممتاز
  - عابدہ مہ جبین — زوجہ نظام
  - محمد اقبال — زوجہ سیما
  - افتخار احمد — اہلیہ نیلوفر
  - ساجدہ مہ جبین — زوجہ محمد
- ابراہیم — ذرینہ بائی
  - اہلیہ دوم حلیمہ
    - محمد امین
    - سعیدہ بیگم
    - محمد نعیم
    - محمد ندیم
    - نادرہ
    - ڈاکٹر محمد سلیم
      - خدیجہ
      - عرفان
      - ثمینہ
      - تہمینہ
- قادر — اہلیہ اول کلثوم
  - محمد حسین
- مہر النساء
  - عبدالعزیز
    - ممتاز بیگم
    - سائرہ
    - اشرف
    - عابد
    - ناہید

حاجی محمد صدّیق (تایا)

(اہلیہ - حلیمہ بائی)

- عائشہ بیگم — زوجہ عبدالقادر
- محمد ابوبکر — اہلیہ اول زلیخا بائی (مرحومہ)
  - اہلیہ دوم سرور جہانی
  - آمنہ بیگم
  - محمد عبداللہ
  - سکینہ بیگم
  - محمد فضل کریم
- فاطمہ بیگم
- زینب بیگم — زوجہ سید شمیل احمد
- محمد عمر — اہلیہ ساجدہ بیگم
  - محمد عمران
  - محمد سراج
  - محمد سلمان
- مریم بیگم — زوجہ محمد رحمت اللہ
- محمد عثمان — اہلیہ عزیز بانو
- خدیجہ بیگم — زوجہ سید جمیل احمد
- محمد علی — اہلیہ شاہدہ بیگم
  - محمد صدیق حسین
  - رابعہ بیگم
  - محمد غنی
  - نورجہاں بیگم
  - محمد بلال
  - حلیمہ بیگم
  - زلیخا بیگم
- محمد حسن — اہلیہ سیدہ زینب

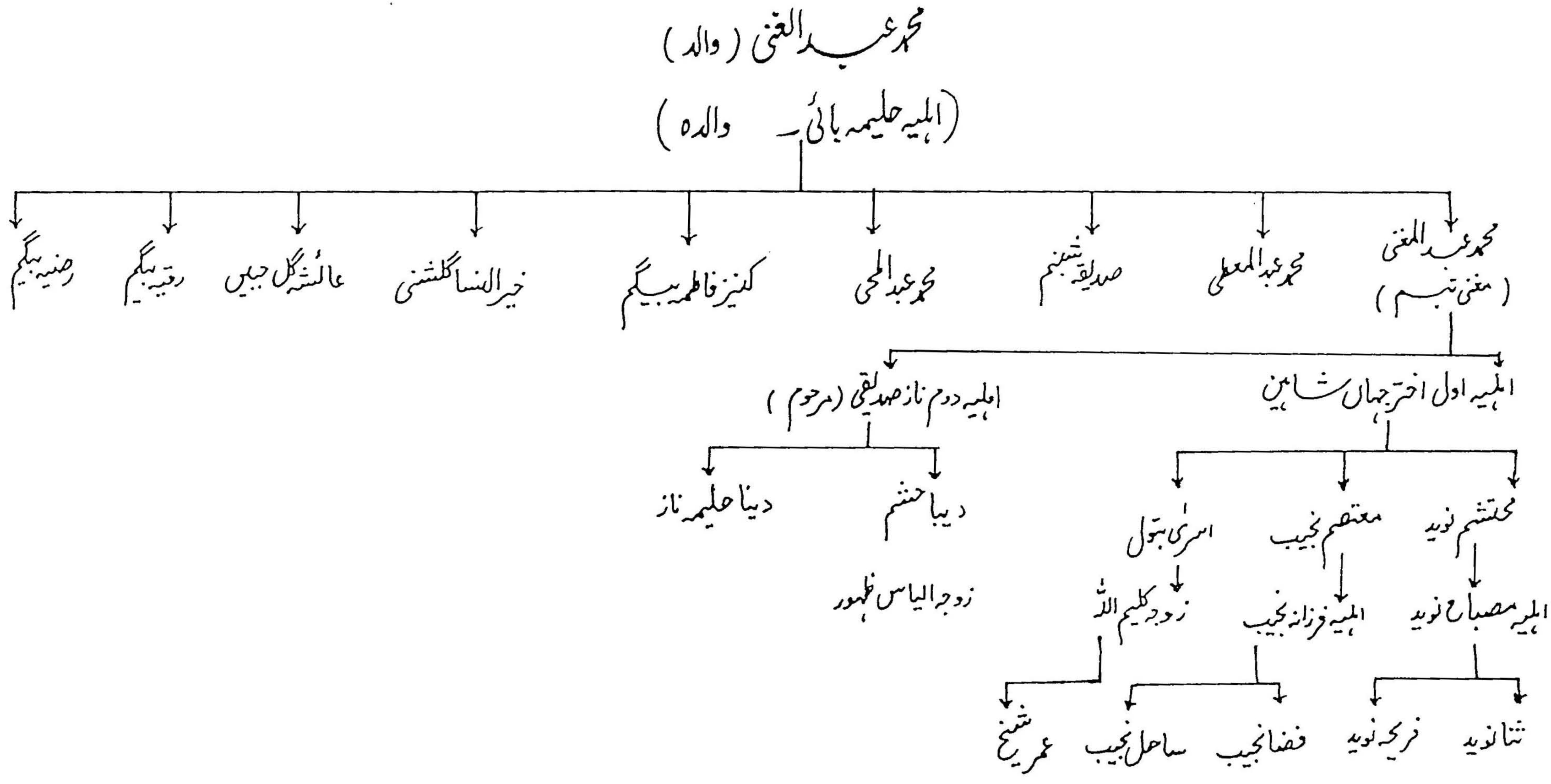
محمد عبد الغنی (والد)
(اہلیہ حلیمہ بائی۔ والدہ)
محمد عبد المغنی (مغنی تبسم)
محمد عبد المعطی
صدیقہ شبنم
محمد عبد المحی
کنیز فاطمہ بیگم
خیر النسا گلشنی
عائشہ گل جبیں
رقیہ بیگم
رضیہ بیگم
اہلیہ اول اختر جہاں شاہین
محتشم نوید
معتصم نجیب
اسریٰ بتول
اہلیہ مصباح نوید
اہلیہ فرزانہ نجیب
زوجہ کلیم اللہ
ثنا نوید
فریحہ نوید
فضا نجیب
ساحل نجیب
عمر شیخ
اہلیہ دوم ناز صدیقی (مرحوم)
دیبا حشم
دینا حلیمہ ناز
زوجہ الیاس ظہور

احباب

ہندوستان بلکہ بیرونِ ہند کا بھی کوئی اردو کا ادیب شاعر نقاد یا محقق ہو اس کے تعلقات کسی نہ کسی طرح مغنی تبسم سے ضرور ہیں۔ لیکن ان میں سے بیشتر یہ سمجھتے ہیں کہ وہی مغنی صاحب کے سب سے قریبی دوست ہیں اس کی وجہ یہ ہیکہ مغنی صاحب نے اپنے دوستوں میں ہمیشہ خلوص بانٹا محبتیں دی اور ضرورت پڑنے پر اُن کی ہر طرح مدد بھی کی اگر مغنی صاحب کے دائرۂ احباب کو سمیٹنے کی کوشش کی جائے تو شاید کئی صفحات میں صرف نام لکھے جاسکیں ذیل میں صرف چند احباب کا ذکر کیا جارہا ہے اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جن کے نام یہاں شامل نہیں وہ مغنی تبسم کے دوست نہیں ہیں پروفیسر رحمت یوسف زئی کا بیان ہے کہ وہ جب بھی حیدرآباد سے باہر کسی کام سے جاتے ہیں تو ملنے والے حیدرآباد اور خاص کر مغنی تبسم کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں۔ اور جب مغنی تبسم کا ذکر چھڑ جاتا ہے تو پھر گھنٹوں بیت جاتے ہیں شاید یہی تجربہ ہر اُس شخص کا ہے جو حیدرآباد کے ادبی منظرنامے کا حصّہ ہیں۔ دنیا بھر میں وہ جہاں بھی جائے لوگ مغنی تبسم کی صحت اور اُن کی مصروفیات کے بارے میں ضرور جاننا چاہتے ہیں۔ یہ مغنی تبسم کی سحر انگیز شخصیت کا نتیجہ ہے۔

مغنی تبسم کی دوستی زیادہ تر اُن سے رہی ہے جن کا تعلق علم و ادب سے ہے۔ اسکول کے زمانے ہی سے وہ احباب کی محفلوں میں ایک مرکز کی حیثیت رکھتے تھے چنانچہ مغنی تبسم اور اُن کے چند دوستوں ابو المعظم زین العابدین، قطب الدین یوسف اور

اور احمد سلطان شاداب نے شبستانِ ادب کے نام سے ایک انجمن قائم کی اور ایک رسالہ بھی جاری کیا۔ شہریار سے اُن کی دوستی مثالی ہے دونوں کے مزاجوں میں ہم آہنگی اور ذوق کی یکسانیت نے دوستی کے اس رشتے کو آگے بڑھایا۔

شہریار سے معنی صاحب کی ملاقات ۱۹۶۳ء میں ہوئی تھی جب وہ علی گڑھ گئے۔ اس کے بعد سے لے کر آج تک یہ رشتہ مضبوط سے مضبوط تر ہوتا گیا۔ مجتبیٰ حسین نے خالد سعید کے گھر ایک محفل کا ذکر کیا ہے اُس وقت قاضی سلیم رکن پارلیمنٹ تھے اور دلی میں مقیم تھے اس محفل میں قاضی سلیم کے علاوہ مجتبیٰ حسین، شہریار اور معنی تبسم موجود تھے۔ مجتبیٰ حسین لکھتے ہیں:

"رات گئے شعر خوانی کی نوبت آئی
شہریار اور معنی تبسم دونوں چونکہ
ایک دوسرے کی بڑی پرانی کمزوریاں ہیں
اس لیے ایک دوسرے کے رازوں سے
بھی اچھی طرح واقف ہیں جب معنی تبسم
نے اچانک ایک ایسا شعر سنا دیا جس
میں ایک گم شدہ دل نواز ہستی کا
حوالہ تھا تو اسے سُن کر شہریار نے رونا
شروع کر دیا اس کے جواب میں معنی تبسم
بھی رونے لگے۔ ایسا ویسا ہیں دھاڑیں
مار مار کے"[1]

---

[1] ۔ مجتبیٰ حسین۔ "یہ ایک تبسم، جو معنی بھی ہو کے ملتا ہے"۔ مشمولہ ندرِ معنی تبسم ص ۲۶۴

شاد تمکنت سے معنی تبسم صاحب کی بے تکلفانہ قسم کی دوستی تھی
معنی صاحب شاذ کے قائل تھے لیکن شاد کے اپنی اہلیہ کے لیے والہانہ
رویہ سے بے زار بھی تھے۔ چنانچہ ایک بار انھوں نے شاد کے ہاتھ میں تھاما
ہوا نہاری کا کٹورا یہ کہہ کر گرا دیا کہ "آ ے جا رے کے اعصاب پہ
عورت ہے سوار" لیکن کچھ ہی دن بعد شاد کو یہ کہہ کر ایک طرح سے
منا لیا کہ شاذ ہندوستان کے اہم شعرا میں ہیں۔

معنی تبسم کے دوستوں میں ابراہیم شفیق بھی شامل تھے جو
ایک بہت اچھے افسانہ لگا رہے تھے اور معنی تبسم نے ادارۂ شعر و حکمت کے
زیر اہتمام ان کے افسانوں کا مجموعہ بھی شائع کیا تھا۔ ابراہیم شفیق
معنی تبسم سے اکثر ملتے رہتے تھے اور ان کی بخی محفلوں کے بھی شریک تھے۔
معنی صاحب کو ایک شوق یہ بھی تھا کہ وہ روحوں کو طلب کر کے احباب
سے ان کی بات چیت بھی کروایا کرتے تھے۔ مجتبیٰ حسین لکھتے ہیں:

"معنی تبسم کو ضرور یاد ہو گا کہ ایک
بار انھوں نے انجانے میں میرے افسانہ
نگار دوست ابراہیم شفیق (خدا
انھیں غریق رحمت کرے) کی بات
چیت مشہور فرانسیسی افسانہ نگار
بالزاک کی روح سے کروائی تھی۔ آپ
کو پتہ ہے کہ بالزاک کیسا منہ پھٹ اور
بڑ زباں آدمی تھا۔ پہلے تو ابراہیم شفیق
سے بات چیت کرنے کے لیے ہی آمادہ نہیں
ہو رہا تھا بعد میں معنی تبسم نے اس کی
روح کو ورغلایا، بہلایا، پھسلایا تو
اس مردود سے چھوٹتے ہی ابراہیم شفیق

سے کہا" میاں کیوں اپنا وقت اضانہ
لگاری میں برباد کرتے ہو۔ جاؤ اور کوئی
اچھا سا شریفانہ پیشہ اختیار کرو اور ہاں
خبردار جو پھر کبھی اس معاملے میں میری
روح سے صلاح و مشورہ کیا تو، اب
تو خیر ملاحظی سے صحیح مشورہ دے دیا ہے۔
آگے ایسا مشورہ دوں گا کہ زندگی بھر
یاد رکھو گے" بالزاک کی اس دوٹوک
رائے کو جان کر تھوڑی دیر کے لیے مجھے شبہ
ہی ہوا کہ روحوں کی آڑ میں کہیں خود
معنی تبسم تو نہیں بولنے۔ بے چارے کم گو
آدمی ہیں۔ وہ بات خود سے نہیں کہہ پاتے
یا کہنے کی ہمت نہیں رکھتے اسے روحوں سے
کہلوا دیتے ہوں گے۔ شریف آدمی کو کیا کیا
سوانگ رچانے نہیں پڑتے۔ بہرحال بالزاک
کی اس رائے کے بعد ابراہیم شفیق کئی دنوں
تک اداس رہا۔ بعد میں مغنی کے موم سے
دل نے اس کی تلافی کی یہ صورت نکالی کہ
ایک دن اُردو کے ایک تازہ تازہ مرحوم
سے ہوئے افسانہ نگار کی روح سے ابراہیم شفیق
کی بات کروادی (کبھی کبھار وہ لد روحوں
کو بھی بلا لیتے تھے) شکر خدا کا کہ افسانہ
نگار مرحوم کی روح نے ابراہیم شفیق کی
افسانہ نگاری کی نہ صرف تعریف کی بلکہ

ٹیٹ اردو میں انھیں مشقِ سخن کو
جاری رکھنے کا مشورہ بھی صادر
آخر میں ٹیٹ کے سند کے طور پر یہ بھی کہا کہ
اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ"[1]

مغنی صاحب سچ مچ روحوں کو بلاتے تھے یا نہیں اس کے بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے جب مغنی صاحب سے اس بارے میں سوال کیا گیا تو ان کے چہرے پر تبسم کی ایک ہلکی سی لکیر نمودار ہوئی اور انھوں نے بات کا رخ بدل دیا۔ لیکن یہ ضرور محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے احباب سے بڑے لطیف قسم کے مذاق بھی کیا کرتے تھے اور پھر ان کی دلجوئی کے لیے کوئی نہ کوئی طریقہ ضرور نکال لیتے تھے تاکہ ان کی دل شکنی نہ ہو۔

حیدرآباد کے ایک بہت اہم افسانہ نگار اقبال متین بھی مغنی صاحب کے قریبی دوستوں میں شامل ہیں اور اس دوستی کی بنیاد علمی و ادبی نوعیت کی ہونے کے باوجود بے حد قریبی سی ہیں۔ اقبال متین نے مغنی تبسم کی ذات کے پس منظر میں جو تحریر کیا ہے اسے افسانہ کہا جائے یا خاکہ یا مضمون یا کچھ اور، اس تحریر میں مغنی تبسم سے ان کی گہری ذہنی اور جذباتی وابستگی نمایاں طور پر دیکھی جاسکتی۔

عالم خوندمیری سے بھی مغنی تبسم کے بہت ہی قریبی تعلقات رہے ہیں اور کئی محفلوں میں ان دونوں کا نہ صرف ساتھ رہا ہے بلکہ گرما گرم بحثیں بھی ہوتی رہی ہیں۔ جو حالانکہ علمی و ادبی نوعیت کی رہا کرتی تھی۔ ایسا ہی کچھ حال وحید اختر کا بھی تھا لیکن وحید اختر کے ساتھ ایک مسئلہ یہ تھا کہ وہ بے حد انانیت پسند تھے اس کے باوجود مغنی تبسم کو نہ صرف چاہتے تھے

---

[1] ۔ مجتبیٰ حسین "یہ ایک تبسم، جو مغنی ہی ہو کہیں ملتا ہے"۔ مشمولہ نذرِ مغنی تبسم ص ۲۶۶

بلکہ دل سے عزت بھی کرتے تھے ۔

سلیمان اریب نے 'صبا' جاری کیا تو ان کے ہم راہ چلنے والے ادبی قافلے میں معین تبسم کا نام سرِ فہرست تھا ۔ 'صبا' کی ترتیب مضامین کے انتخاب اور طباعت و اشاعت کے مراحل میں معین صاحب نے بڑی خاموشی سے اریب کی مدد کی۔ حقیقی معنوں میں حیدرآباد میں اُس زمانے میں یہ چار نام یعنی سلیمان اریب ، وحید اختر ، عالم خوندمیری اور معین تبسم علمی و ادبی مضامین پر چھائے ہوئے تھے ۔ اور دانش ورانہ سطح پر اگر کوئی مسئلہ چھڑ جائے تو پھر یہی لوگ تھے جن سے معاملات کو سلجھانے میں مدد لی جاتی تھی ۔

عوض سعید معین صاحب کے بہت ہی قریبی دوستوں میں تھے اور غمخواروں میں بھی بنے ۔ معین تبسم عوض سعید کی افسانہ نگاری کے مداح تھے اور خود عوض سعید کا معین تبسم پر حاکہ ان دونوں کے قریبی تعلقات کی عکاسی کرتا ہے ۔ عوض سعید معین تبسم کے روحوں کو ہلانے والے ثوق میں بھی حصّہ دار رہے ہیں اور کئی گفتنی و ناگفتنی قسم کے واقعات کے چشم دید گواہ بھی ۔

انور معظم حیدرآباد کے ان چند گنے چنے شخصیتوں میں شمار کیے جاتے ہیں جو اُردو زبان و ادب کے ساتھ ساتھ اسلامیات ، فلسفہ اور تنقید پر گہری نظر کے حامل ہیں یہ بھی معین تبسم کے قریبی دوستوں میں شمار کیے جاتے ہیں ۔ ان کی ملاقاتیں متواتر نہ سہی لیکن جب بھی ہوتی ہیں علمی و ادبی موضوعات ہی پر گفت آتے ہیں ۔ معین تبسم پر کئی خاکہ لکھنے والے کئی احباب نے انور معظم کا بھی ذکر کیا ہیں ۔

قدیر زماں حیدرآباد کے دانشورانہ حلقہ میں جانے اور پہچانے جاتے ہیں اُن کے تعلقات تقریباً ہر بڑے نقاد اور قلم کار سے رہے ہیں ۔ عالم خوندمیری ہوں یا گوپی چند نارنگ یا پھر حیدرآباد آنے والے کوئی بھی

بڑا من کار ہے قدیر زماں سے اس کی گاڑھی چھننے لگتی ہیں۔ قدیر زماں معنی تبسم کے بہت زیادہ قریب رہے ہیں۔ قدیر زماں نے معنی تبسم پر جو خاکہ لکھا اُس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان کے آپسی تعلقات کی نوعیت کیا تھی۔ انجمن آرائی میں قدیر زماں بھی کچھ کم نہیں ہیں اور شاید اسی لیے معنی صاحب انھیں عزیز رکھتے ہیں۔

مجتبیٰ حسین اردو کے ایک بہت اہم مزاح نگار ہیں۔ اور ساری دنیا میں جانے جاتے ہیں۔ انھیں بھی اس بات پر فخر ہے کہ وہ معنی تبسم کے دوست ہیں اور واقعہ بھی یہ ہے کہ وہ معنی تبسم کے بہت ہی قریبی دوستوں میں ہیں۔ اس کا اندازہ مجتبیٰ حسین کے تحریر کردہ خاکہ سے لگایا جا سکتا ہے۔ جو نذرِ معنی تبسم میں شامل ہے اور جس میں مجتبیٰ حسین نے معنی تبسم کی شخصیت کے بعض ایسے نازک گوشوں کی طرف اپنے مخصوص انداز میں اشارہ کیا ہے جن پر عام لوگوں کی نظر نہیں جاتی۔

معنی صاحب کو ادب سے خصوصی لگاؤ تو ہے ہی اس کے ساتھ ساتھ انھیں مصوری سے بھی بہت دلچسپی ہے وہ خود ایک اچھے آرٹسٹ ہیں جس کا ثبوت ان کے بنائے ہوئے کئی کتابوں کے ٹائٹل ہیں۔ حیدرآباد کے ایک بہت اچھے نام ور آرٹسٹ عزیز آرٹسٹ سے معنی صاحب کی دوستی اسی وجہ سے پائیدار رہی عزیز آرٹسٹ نہ صرف معنی صاحب کی کئی محفلوں میں شریک ہوتے رہے ہیں بلکہ خود ان کے یہاں بھی احباب کی نشستوں میں معنی صاحب جاتے رہے ہیں۔ ان نشستوں میں شعر و ادب، سیاست، فلسفہ، مذہب اور نہ جانے کیا کیا موضوعات پر بحثیں دانشورانہ سطح پر ہوتی ہیں لیکن جیسا کہ عام قاعدہ ہے دانشورانہ بحثوں کی خاص بات یہ ہے کہ ایسی بحثیں ہمیشہ غیر مختتم رہتی ہیں۔ چنانچہ مجتبیٰ حسین نے اپنے خاکے میں ایسی ہی ایک گرما گرم بحث کا

ذکر کیا ہے۔

معنی تبسم اپنے سے کم عمر دوستوں کے ساتھ بھی اسی طرح سلوک کرتے ہیں جیسے وہ اُن کے برابر کے ہیں۔ ان کے ہاں عمر اور رتبے سے زیادہ انسان کے ذاتی اوصاف اور ادبی و تخلیقی صلاحیتوں کو زیادہ اہمیت ہوتی ہے۔ مصحف اقبال توصیفی معنی تبسم سے تقریباً 15 سال چھوٹے ہیں لیکن معنی تبسم مصحف اقبال کی شعری صلاحیتوں کے بے حد گرویدہ ہیں۔ اس کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ معنی صاحب نے اپنے مجموعے مکالمہ "پیلی کرن کا لوتھ" کی رسم اجرا مصحف اقبال توصیفی کے ہاتھوں کروائی۔ ایسا نہیں تھا کہ اُس وقت حیدرآباد میں کوئی زیادہ مشہور اور ممتاز شخصیتیں نہیں تھی لیکن معنی صاحب نے مصحف اقبال سے رسم اجرا کی فرمائش کی۔ ایک اور بار ایک نجی محفل میں مصحف اقبال توصیفی نے ایک شعر سنایا اور وہ شعر یہ تھا ؎

جس سے لی تھیں اسی کو لوٹا دیں
یہ رہیں صبحیں یہ تری شامیں

عوض سعید کے مطابق اس شعر نے معنی صاحب پر ایک وجدانی کیفیت طاری کر دی تھی۔ مصحف اقبال توصیفی نے خالد قادری کو بتایا کہ یہ شعر سن کر "معنی صاحب وفور جذبات سے اس قدر بے قابو ہو گئے کہ اچانک وہاں میز پر پڑا ہوا بلیڈ اٹھا کر اپنی گردن کاٹنے لگے۔ خود کشی کے اس اقدام سے انھیں بہ مشکل روکا جا سکا" [2]

ایک اور بار انھوں نے پروفیسر رحمت یوسف زئی کے سامنے یہ بھی کہا کہ مصحف اقبال توصیفی ہندوستان کے سب سے اہم شاعر ہیں [3]

---

[1] ۔ عوض سعید ۔ مضمون معنی تبسم ۔ مشمولہ ندرِ معنی تبسم ص ۲۷۳

[2] ۔ سید خالد قادری ۔ معنی تبسم یادیں باتیں اور تاثرات ۔ مشمولہ ندرِ معنی تبسم ص ۳۳۹

[3] ۔ ایضاً ایضاً ۳۴۰

خالد قادری مغنی صاحب کے ان دوستوں میں سے ہیں جنھیں وہ بہت زیادہ عزیز رکھتے ہیں جب خالد قادری پہلی بار حیدرآباد آئے اور انوار العلوم کالج میں ملازمت اختیار کی تو مغنی صاحب کو شمیم حنفی کے ذریعہ اطلاع ملی مغنی تبسم جوہر شناس ہیں انھوں نے خالد قادری سے کسی طرح ملاقات کی اور پھر وہ دن اور آج کا دن دونوں کے مراسم بڑھتے ہی رہے بلکہ ایک جگہ خالد قادری نے خود لکھا ہے کہ مغنی صاحب نے ایک بار نہ جانے کس موڈ میں یہ کہہ دیا تھا کہ وہ دنیا میں اپنی بیوی کے بعد اگر کسی کو چاہتے ہیں تو وہ خالد قادری کو۔ اصل میں مغنی صاحب مزاج شناس بھی ہیں اور ہر ایک کی خوبیوں اور خامیوں سے واقف ہو کر بھی کہیں بھی اور کبھی بھی اس کا استحصال کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ شاید کچھ لوگوں کو خالد قادری مغرور اکھڑ تنہائی پسند نظر آئیں لیکن حقیقت کچھ اور ہے مغنی صاحب خالد قادری کی شخصیت کے ان حسین پہلوؤں سے واقف ہیں اور یہ جانتے ہیں کہ ادب و تنقید کے میدان میں خالد قادری کا علم کتنا بلند ہے۔ شاید اسی لیے شعر و حکمت کے لیے مغنی صاحب نے خالد قادری سے کئی ترجمے کروائے اور بظاہر کاہل اور اپنے آپ کو لیے دیئے رہنے والے خالد قادری نے نہایت خوب صورتی سے یہ کام کیا۔

مغنی صاحب ایک بہت ہی خوبرو اور سحر انگیز شخصیت کے مالک ہیں اور شاید یہ بھی ایک وجہ ہے کہ مغنی صاحب کے قریب رہنے والوں میں خواتین کی بھی بہت بڑی تعداد ہے اور ان میں سے بیشتر کا یہ خیال ہے کہ مغنی صاحب ان ہی سے زیادہ قریب ہیں۔

کچھ صفحات پر جن احباب کے نام گنوائے گئے ان کے علاوہ بھی مغنی صاحب کے دوستوں کی ایک طویل فہرست ہے اور اس فہرست

میں روز بہ روز اضافہ ہی ہوتا رہا ہے کبھی کمی نہیں ہونے پائی۔
جو دوست زندگی کے سفر میں ان کا ساتھ چھوڑ گئے، ان کی کمی نوحوان
دوست پوری کر رہے ہیں اور جیسے کہ پہلے کہیں لکھا گیا عمر کے تفاوت
کے باوجود مغنی صاحب نے اپنے دوستوں کو کبھی یہ محسوس ہونے نہیں
دیا کہ وہ بزرگ ہیں یا اپنے دوستوں سے زیادہ علم رکھتے ہیں بلکہ
وہ باتوں ہی باتوں میں کچھ ایسے نکات بیان کر دیتے ہیں کہ جس سے
ذہن کے دریچے روشن ہو جائیں۔

103325

Indira Gandhi ... University of Hyd...

شاگرد

معنی صاحب کے شاگردوں کا شمار کرنا بے حد مشکل کام ہے۔
جب وہ دارلعلوم ہائی اسکول میں تعلیم پا رہے تھے تب سے ہی ان میں تدریس کے جراثیم پیدا ہو چکے تھے۔ وہ ریاضی میں ماہر تھے اور اپنے ہم جماعتوں کو ریاضی پڑھایا کرتے تھے۔ شبابِ ادب کے زمانے میں ہی ایک طرح سے انھوں نے ادب کی تدریس شروع کر دی تھی اور اپنے ساتھیوں کے مضامین اور اشعار پر اصلاح دیتے تھے لیکن انھوں نے اس اصلاح کو کبھی منفعت کا ذریعہ نہیں بنایا۔ ۱۹۵۲ء میں عثمانیہ یونیورسٹی سے ایم۔ اے کرنے کے بعد انھوں نے عثمانیہ یونیورسٹی کی لائبریری میں کام کیا پھر دو سال اے جی آفس میں ملازمت کی رہے سن ۱۹۵۵ء سے ۱۹۵۷ء تک وہ حیدرآباد یونگ کالج سکندرآباد آرٹس اینڈ سائنس کالج بیدر کا کالج اردو کالج اور اورینٹل کالج میں جزوقتی استاد رہے یا اعزازی طور پر تدریس کا کام کرتے رہے۔

سن ۵۷ء میں ان کا تقرر جامعہ عثمانیہ کے شعبۂ اردو میں ہوگیا اور وہ لگل پوسٹنگ ہوئی کیوں کہ بعض اساتذہ کو یہ حد تھا کہ معنی تسلیم کی حیدرآباد میں موجودگی ان کی دوسری شاگردوں کے کیریر پر اثر پڑھے گا۔ لیکن بہر حال مسعود صاحب کی وجہ سے انھوں نے اپنی پی۔ ایچ ڈی مکمل کی پھر ان کا تبادلہ حیدرآباد ہوگیا۔ اس طرح وہ ۱۹۵۵ء سے ۱۹۹۰ء تک یعنی ۳۵ سال تدریس سے وابستہ رہے ظاہر ہے اس عرصے میں ان کے سینکڑوں شاگرد رہے ہیں وہ گائیڈ بھی تھے اور نہ جانے کتنے ہی طلبا نے ان کے ہاں رجسٹریشن کروایا۔ لیکن صرف دو ہی ایسے لکھے جنھوں نے اس راہِ خار زار کو طے کیا۔

اُن کے پہلے اسکالر مرزا اکبر علی بیگ ہیں جنھوں نے مرزا علی لطف کی حیات اور کارناموں پر پی۔ ایچ ڈی کا مقالہ تحریر کیا اور دوسرے علی احمد جلیلی ہیں جنھوں نے اپنے والد جلیل مانک پوری پر مقالہ تیار کرکے پی۔ ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی البتہ جس زمانے میں وہ حیدرآباد یونیورسٹی میں وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے جا رہے تھے اس دوران انھیں ایم۔فل کے طلبا کی بھی رہنمائی کے فرائض انجام دینے پڑے۔

جنھوں نے معنی تبسم کی نگرانی میں اپنے ایم۔فل کا کام مکمل کیا اور ڈگری حاصل کی۔ عثمانیہ میں بے شمار طالب علموں نے اُن کے ہاں رجسٹریشن کرایا ممتاز شاعر عیاث متین نے معنی تبسم کی نگرانی میں ن۔م راشد پر کام شروع کیا۔ معنی صاحب نے ان کی ہر طرح مدد کی اور اپنی پوری لائبریری اُن کے حوالے کردی پھر بھی عیاث متین اپنا کام مکمل نہ کرپائے پھر وہ عثمانیہ یونیورسٹی میں ریڈر ہوگئے۔ الیف آئی پی کے تحت پانچ سال تنخواہ کے ساتھ رخصت بھی ملی لیکن کام جوں کا توں رہا۔ جب میرٹ پروموشن کے تحت ان کے پروفیسر کے عہدے پر ترقی کی نوبت آئی تو عیاث متین نے معنی تبسم سے درخواست کی کہ انھیں یہ سرٹیفکٹ دے دیں یہ کام بالکل مکمل ہوگیا ہے اور ایک آدھ مہینے میں داخل ہوجائے گا۔ اس سرٹیفکٹ کی بنیاد پر عیاث متین پروفیسر ہوگئے۔ ظاہر ہے اس کے بعد اب انھیں پی۔ ایچ ڈی کی کوئی ضرورت ہی نہ رہی۔ چنانچہ آج تک وہ پی۔ ایچ ڈی نہ کرسکے یہاں تک کہ ۳۱ راکتوبر سن ۲۰۰۲ کو وہ ملازمت سے سبکدوش بھی ہوگئے۔ اکبر علی بیگ نے جم کر کام کیا۔ ابتدا میں انھوں نے ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ کی نگرانی میں کام شروع کیا پھر سید جعفر کے تحت الاٹ کیے گئے اور اس کے بعد جب معنی صاحب پی۔ ایچ ڈی کے نگراں بنے تو اکبر علی بیگ ان کے

حصّے میں آئے اس طرح اکبر علی بیگ معنی تبسم کے تحت ریسرچ کروانے والے پہلے امیدوار ہیں ۔ مقالے کی تسوید کے دوران معنی صاحب نے اکبر علی بیگ کی بے حد مدد کی جس کا ذکر انھوں نے اپنے مضمون میں بھی کیا ہے ۔ معنی صاحب نے مرزا علی لطف کے بارے میں دہلی میں موجود مواد کی نشاندہی کی اور اکبر علی بیگ کو تاکید کی کہ وہ وہیں جاکر مرزا علی لطف پر مواد حاصل کریں ۔ اکبر علی بیگ ریسرچ کے سلسلے میں دہلی گئے تو ان کے رہنے کا انتظام معنی صاحب نے قمر احسن کے مکان پر کیا ۔ جو اردو کے ممتاز افسانہ نگار ہیں اسی ریسرچ کے ضمن میں اکبر علی بیگ کو علی گڑھ جانا پڑا تو علی گڑھ میں معنی صاحب نے شہریار کو یاد کیا کہ اکبر علی بیگ کو ہر طرح کی سہولتیں فراہم کریں ۔ حکومت آندھرا پردیش کے اسٹیٹ آرکیو ز ڈپارٹمنٹ کی فیلوشپ کے لئے بھی معنی صاحب نے اکبر علی بیگ کو متوجہ کیا ۔ چنانچہ اکبر علی بیگ کو دو سال تک پارٹ ٹائم فیلوشپ کی رقم ملتی رہی ۔

معنی صاحب کی نگرانی میں کام کرتے ہوئے اکبر علی بیگ کو جو تجربہ ہوا اس کے بارے میں وہ لکھتے ہیں :

> "میرے تحقیقی مقالے کے
> مسودوں کو معنی صاحب بڑی گہرائی
> اور گیرائی کے ساتھ دیکھتے ہیں ۔
> نقص الواب کو اور سر لوکھنے کی تاکید
> کرتے ۔ بعض حصّوں کو دیکھنے کے بعد
> مزید نظر ثانی کرنے کی ہدایت دیتے ۔
> اسی دوران مقالے کے ٹائپ کئے ہوئے
> کاغذات لے کر میں ان کی خدمت
> میں پہنچا تب وہ ان ٹائپ شدہ کاغذات

کو دیکھتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے کہ اس
صفحے میں صرف اس پیراگراف کو رکھو
باقی سب نکال دو۔ بعض صفحات میں
سے تو چند سطور ہی رکھے گئے' باقی عبارت
کاٹ دی گئی۔ سنسر (CENSOR)
کی قینچی میں سنتا آیا تھا مگر معنی صاحب
کی قینچی سے جب میرا سامنا ہوا تب میرے
پیے چھوٹ گئے' بے ساختہ زبان سے
نکلا "انا اللہ مع الصابرین"۔
دوبارہ مقالے کو ٹائپ کرنا پڑا"[1]

حد یہ ہے کہ معنی صاحب اپنے شاگرد کے گھر جاکر ہی ابواب کی تصحیح کرتے تھے اور جب اکبر علی بیگ نے اپنا کام مکمل کرلیا تو تفریح کے لیے انھیں سنگور روانہ کیا اور میسور میں اپنی سگی خالہ کے یہاں اور اوٹی میں اپنے ایک دوست کے یہاں اکبر علی بیگ کو ٹھہرنے کا انتظام بھی کردیا۔ ایسے استاد بہت کم ہوتے ہیں جو اپنے شاگرد کے لیے اس قدر آگے بڑھ کر مدد کرتے ہیں۔

معنی صاحب اپنے شاگردوں سے بے حد شفقت سے پیش آتے ہیں۔ انیس پروین نے اپنے مضمون "ایک تنقیق استاد" میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ وہ کلاس میں اونگھ رہی تھیں معنی صاحب نے یہ بات نوٹ کرلی جب تفصیل معلوم ہوئی کہ انیس پروین رات بھر محکمہ ٹیلی فون میں ڈیوٹی کرتی ہیں اور دن میں کالج اٹینڈ کرتی ہیں تو معنی صاحب نے ان کی ہمت افزائی کی اور تاکید کی کہ جب کبھی کسی کتاب یا نوٹس کی ضرورت

---

[1] پروفیسر اکبر علی بیگ۔ مضمون "قسم اردو۔ معنی قسم" شمولہ "در معنی قسم" ص ۳۴۷ - ۳۴۸

ہوتو وہ ملا جھک لے سکتی ہیں۔ وہ لکھتی ہیں کہ معنی صاحب کے گھر پر ہمیشہ شاگردوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔

ایم۔اے اور ایم۔فل میں ڈاکٹر محمد انور الدین بھی معنی صاحب کے شاگرد رہے اور پھر انھوں نے حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی میں پروفیسر گیان چند جین کی نگرانی میں پی۔ایچ ڈی مکمل کی اور پھر وہیں لکچرار مقرر ہوئے۔ پھر وہ وہیں ترقی کرتے ہوئے پروفیسر کے عہدے پر جا پہنچے۔ لیکن آج بھی انور الدین معنی صاحب کے ساتھ اسی طرح وابستہ ہیں جس طرح عثمانیہ یونیورسٹی میں اپنے زمانۂ طالب علمی میں تھے۔ اور یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ انور الدین معنی صاحب کے بہت وفادار شاگرد ہیں۔

معنی صاحب نہ صرف اپنے شاگردوں کی خود مدد کرتے ہیں بلکہ اپنے ساتھی اساتذہ سے بھی سفارش کرکے اپنے طلبا کے لیے ممکنہ سہولتیں مہیا کرتے ہیں۔

ایک اور بات یہ بھی ہے کہ معنی صاحب اپنے شاگردوں اور چاہنے والوں کو کبھی نہیں بھولتے۔ انیس پروین نے لکھا ہے کہ جب انھوں نے معنی تبسم کو ٹیلی فون کیا تو ایک طویل عرصہ کے بعد سننے کے بعد بھی انھوں نے آواز کو پہچان لیا۔

انور الدین کے علاوہ فاطمہ پروین، بیگ احساس اور کئی دوسرے معنی صاحب کے شاگرد رہے ہیں۔ ان لوگوں نے پی۔ایچ ڈی معنی صاحب کی نگرانی میں ہی کیا لیکن معنی صاحب کے مشورے ان کے مقالوں کی تسوید میں ضرور معاون رہے۔ علی الدین نوید نے بھی معنی صاحب ہی کی نگرانی میں پی۔ایچ ڈی کے لیے رجسٹریشن کروایا تھا لیکن وہ بھی عیات میتی کی طرح کام مکمل نہ کرپائے۔

اصل میں معنی صاحب اپنے ریسرچ اسکالرس سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ موضوع سے متعلق سب کچھ جان لیں۔ لیکن اسکالر کی یہ

خواہش ہوتی ہے کہ وہ کسی بھی طرح اپنا مقالہ لکھ ڈالیں اور نگران اس پر اپنے دستخط ثبت کردیں۔ معنی صاحب نے یہ کام کبھی نہیں کیا انھوں نے اپنے اسکالرس کو تمام متعلقہ مواد تک پہنچنے کی تاکید کی اور اس معاملے میں سخت گیری بھی اختیار کی۔ شاید یہ ایک وجہ ہے کہ اُن کے پاس زیادہ اسکالرس نے پی۔ ایچ ڈی نہیں کی۔

اس کے باوجود جن طالب علم نے بھی اُن کے یہاں کام کیا وہ معنی صاحب کی دقت نظر کا ضرور قائل رہا۔ اور اسے اس بات کا بھی احساس رہا ہے کہ معنی صاحب علم کا ایک ٹھاٹیں مارتا ہوا سمندر ہے اور وہ اپنی بے بضاعتی کی وجہ سے اس حد تک نہیں پہنچ سکتا جہاں معنی صاحب اس کو لے جانا چاہتے ہیں۔

شادی

معنی تبسم کی پہلی شادی ۲۳ / اپریل ۱۹۵۱ء میں میر احمد علی صاحب کی صاحب زادی اختر جہاں شاہین سے ہوئی۔ ان سے تین اولادیں ہوئیں۔ فرخندہ لوید، محتشم حبیب اور صاحب زادی اسریٰ متولد ہیں۔ ۱۹۷۶ء میں معنی تبسم کی دوسری شادی مرحومہ ناز صدیقی سے ہوئی ان سے دو اولادیں دیبا حشم اور دیبا حلیمہ ناز ہوئیں۔ دیبا حلیمہ ناز کی پیدائش کے ڈیڑھ گھنٹے کے اندر اندر ناز صدیقی ۹ / مئی ۱۹۸۲ء کو موسی میٹرنٹی ہوم میں داعی اجل کو لبیک کہا۔

محترمہ اختر جہاں ایک گھریلو قسم کی خاتون تھیں اور اپنے گھریلو معاملات سے ہی سروکار رکھتی تھیں۔ پھر بھی معنی تبسم نے جب رسالہ شعور جاری کیا تو انھیں ترتیب کار کی حیثیت سے ارکانِ ادارت میں شامل کیا۔ اور جب معنی تبسم نے شعور دہلی جاری کیا تو اختر جہاں کا نام بحیثیت ایڈیٹر رکھا۔ اگرچہ ادارت کی تمام تر ذمہ داری معنی تبسم خود سنبھالتے رہے لیکن عالماً اس خیال سے کہ وہ سرکاری ملازمت میں ہیں اور ان کا نام بحیثیت مدیر مناسب نہیں ہے اس لیے انھوں نے اپنی اہلیہ اختر جہاں کا نام مدیر کی حیثیت سے شامل کیا۔ چنانچہ یہ سلسلہ اب تک جاری ہے اور تازہ ترین شمارے میں بھی اختر جہاں کا نام ہی بحیثیت مدیر دیا گیا ہے۔

ناز صدیقی (مرحومہ)

محترمہ ناز صدیقی (مرحومہ) کا تعلق اورنگ آباد کے ایک ممتاز علمی ادبی اور قاضی گھرانے سے تھا۔ وہ ۲۴/ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو نظام آباد میں پیدا ہوئیں۔ جہاں اُن کے والد قاضی معین الدین صدیقی صاحب ملازمت کی وجہ سے مقیم تھے۔ ناز صدیقی نے ادبی ذوق ورثہ میں پایا۔ انھوں نے ۱۹۷۳ء میں عثمانیہ یونیورسٹی سے بی۔ اے میں کامیابی حاصل کی اور ۱۹۷۵ء میں ایم۔ اے (اُردو) میں امتیازی نشانات کے ساتھ کامیاب ہوئیں۔ اسی دوران ان کی ملاقات معین قیم سے ہوئی اور پھر بات یہاں تک آگے بڑھی کہ معین صاحب نے ان سے شادی کرلی۔ ناز صدیقی نے ایم۔ اے میں "ساحر لدھیانوی کی شاعری کا تجزیاتی مطالعہ" کے عنوان سے مقالہ قلمبند کیا تھا۔ یوں تو مختلف ادیبوں اور نقادوں نے ساحر لدھیانوی کی شاعری پر مختلف النوع مضامین لکھے تھے لیکن کسی نے ان کی شاعری پر تفصیلی طور سے دائرہ نہیں لیا تھا۔ ناز صدیقی نے اپنے مقالے میں نہ صرف سیر حاصل تجزیہ کیا بلکہ تنقید میں ذاتی تاثرات کو حائل ہونے نہیں دیا اور تجزیاتی مطالعے سے ورائے خود بخود ابھر کر آئی اسے یکم و کاست پیش کردیا۔ ناز صدیقی کا یہ مقالہ کتابی صورت میں ۱۹۷۹ء میں پنجابی پستک بھنڈار۔ دریبہ کلاں۔ دہلی کی جانب سے شائع ہوا۔ جس کی رسم اجرا بدست میر احمد میر انجام پائی۔

ناز صدیقی مرحومہ کے تنقیدی مضامین کا ایک مجموعہ "ادارِ بیاں"

کے نام سے اپریل ۱۹۷۶ء میں اقبال پبلکیشنز کی جانب سے شائع ہوا۔ انداز بیان میں سات تحقیقی اور تنقیدی مضامین شامل ہیں۔ جس میں حالی کی تنقید نگاری، امادات مہدی ــــ مصنفی حیثیت اور اسلوب، ولی اور اس کی شاعری، وحشی کا اسلوب، ہندوستان کی جنگ آزادی میں اردو شعراء کا حصہ اور امیر حمزہ کی شخصیت اور کارناموں کا اجمالی جائزہ لیا گیا ہے۔ انداز بیان میں ڈاکٹر رضیہ سلطانہ پروفیسر صدر شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ اور جناب محبوب حسین جگر شریک مدیر روزنامہ کے پیش نامے شامل ہیں۔ اس کے علاوہ شبلی نعمانی کی حیات اور کارناموں پر تنقیدی مضامین کا ایک اور مجموعہ ترتیب دے کر شائع کیا ہے۔ ان مضامین کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مرحومہ ناز صدیقی کا انداز نگارش نہایت ہی سنجیدہ اور مدلل ہے۔

اولادیں

معتشم نے اپنی اولاد کو اعلیٰ تعلیم سے بہرہ ور کیا۔ محتشم نوید نے کمپیوٹر انجینئرنگ کی ڈگری لی اور آج کل کیلیفورنیا میں بہ حیثیت بزنس مینجر کی خدمات انجام دے رہے ہیں وہ اپنی بیوی مصباح نوید اور دونوں بچے ثنا نوید اور فرحہ نوید کے ساتھ مستقل طور پر کیلیفورنیا میں ہی مقیم ہیں۔ معتشم کبیب نے بھی کمپیوٹر سائنٹ ویر انجینئرنگ کی ڈگری حاصل کی اور Peoples Soft Company کیلیفورنیا میں Vice President کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ وہ بھی اپنی بیوی فرزانہ کبیب اور دختر فضا کبیب فرزند عادل کبیب کے ساتھ مستقل طور پر کیلیفورنیا میں ہی مقیم ہیں۔ اسریٰ بتول کی شادی ۸/مئی ۱۹۸۴ء کو برکت اللہ صاحب کے فرزند کلیم اللہ سے ہوئی وہ بھی اپنے شوہر

اور فرزند عمر شیخ کے ساتھ کیلیفورنیا میں مقیم ہیں۔ دیباحشم
کی شادی محمد ظہور الدین کے صاحب زادے محمد الیاس میکانیکل انجینیر جنرل موٹرس امریکہ
سے ۲۲/ڈسمبر ۱۹۹۶ء کو انجام پائی۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ امریکہ میں مقیم ہیں۔
دینا حلیمہ ناز ابھی تعلیم حاصل کر رہی ہیں۔ تادمِ تحریر وہ سائکالوجی سے بی۔اے
کے سال آخر میں ہیں۔

مختلف اداروں سے وابستگی

مغنی تبسم نے حیدرآباد کی علمی، ادبی و تہذیبی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ مزاج کے اعتبار سے اگرچہ مغنی تبسم بے حد سنجیدہ اور لیے دیے نظر آتے ہیں لیکن ہنگامہ پروری اور محفل آرائی ان کی طبیعت میں داخل رہی ہے۔ وہ کئی اداروں سے وابستہ رہے ان میں شبستان ادب، شام غزل سوسائٹی، محفل علم و ادب، انجمن ترقی پسند مصنفین، نیشنل رائٹرس ایسوسی ایشن، انجمن ترقی اردو، اردو مجلس، اقلیم ادب، ساہتیہ اکیڈیمی، ادارۂ ادبیات اُردو، اقبال اکیڈیمی، ادبی ٹرسٹ، ایچ ای ایچ دی نظامس اُردو ٹرسٹ، ادارۂ شعر و حکمت، اردو اکیڈیمی آندھرا پردیش، عوامی ادبی سوسائیٹی اور حیدرآباد اکیڈیمی وغیرہ شامل ہیں۔ انھوں نے مختلف جرائد و رسالوں کی ادارت کے فرائض بھی سنبھالے اور وظیفہ حسن خدمت کے بعد بھی وہ آج تک ادارۂ ادبیات اُردو کے معتمد عمومی کی حیثیت سے گراں قدر خدمات انجام دیتے آرہے ہیں۔ ان تمام انجمنوں، علمی ادبی و تہذیبی اداروں سے ان کی وابستگی صرف نام کی ہی نہیں رہی بلکہ انھوں نے ان اداروں کے لیے دامے درمے سخنے مدد کرنے کے علاوہ اپنا قیمتی وقت دیا، مشوروں سے نوازا اور اپنی تنظیمی صلاحیتوں سے ان اداروں کو مزید فعال بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔

شبستانِ ادب

مغنی تبسم جس وقت دارالعلوم ہائی اسکول

میں زیرِ تعلیم تھے اس وقت ابو المعظم زین العابدین، قطب الدین یوسف اور احمد سلطان شاداب سٹی ہائی اسکول کے طالب علم تھے۔ یہ سب معنی تبسم کے ہم محلہ تھے ان تمام نے ملکر ایک محفل انجمن شبستانِ ادب قائم کی۔ اس انجمن کے ہفتہ وار جلسے بھی ہوا کرتے تھے اور اس کے تحت ایک رسالہ بھی شائع کیا گیا تھا اور اس کا نام بھی شبستانِ ادب رکھا گیا تھا۔ جس میں حیدرآباد کے اہم ادیبوں کے مقالہ جات اُبھرتے ہوئے نوجوان قلم کاروں کی ہمت افزائی کی جاتی رہی۔

شامِ غزل سوسائٹی

دہلی میں کئی سال پہلے اُردو شاعری اور موسیقی سے دلچسپی رکھنے والے احباب نے شامِ غزل کے نام سے ایک سوسائٹی قائم کی جس میں وہاں کے کئی اعلیٰ عہدیدار ادیب اور شاعر شامل تھے۔ اس سوسائٹی کے تحت ہر ماہ ایک پروگرام انڈیا انٹرنیشنل میں منعقد کیے جاتے تھے۔ اس پروگرام میں کسی ایک شاعر کا کلام کوئی ایک موسیقار پیش کرتا۔ اس سوسائٹی کے روحِ رواں اور صدر کوکب دُرّی تھے جب وہ ریٹائر ہوکر حیدرآباد آگئے تو یہاں بھی انھوں نے اس سوسائٹی کا سلسلہ جاری رکھا۔ 1999ء میں کوکب دُرّی کا انتقال ہوگیا تو سوسائٹی کے اراکین نے اصرار کرکے پروفیسر معنی تبسم کو صدر مقرر کیا۔ معتمد کی حیثیت سے لکشمی دیوی راج، شریک معتمد دل نواز بیگ اور خازن محبوب اشرف کی شبانہ روز کاوشوں سے یہ سوسائٹی آج بھی پوری طرح فعال ہے۔ ہر دو ماہ میں ایک بار شامِ غزل سوسائٹی کے جلسے کسی ایک رُکن کے گھر پر منعقد ہوتے ہیں۔ معنی تبسم کسی شاعر کی غزلوں کا انتخاب کرتے ہیں اور ان غزلوں کو

کوئی موسیقار پیش کرتا ہے کوکب دُرّی کے زمانے میں صرف دو ہی پروگرام ہوتے تھے جس میں میرؔ اور سوداؔ کا کلام پیش کیا گیا تھا۔ کوکب دُرّی کے زمانے میں بھی معنی تبسم ہی شعرا کی غزلوں کو منتخب کیا کرتے تھے اور محفل کے آغاز میں شاعر کے بارے میں ایک تعارفی تقریر بھی کیا کرتے تھے آج بھی وہی سلسلہ جاری و ساری ہے ۔ اس سلسلے کی ابتدا میر تقی میرؔ سے ہوئی۔ اور اب یہ سلسلہ میر مہدی تک پہنچ گیا ہے۔ اس سوسائٹی میں جن موسیقاروں نے غزل سرائی کی ان کے نام یہ ہیں ۔ وٹھل راؤ ، احمد حسین ، محمد حسین ، رکن الدین ، جسبیر کور ، مالا برادیا اور میر جاگیر وغیرہ۔

ادارۂ ادبیاتِ اردو

معنی تبسم اردو ادب اور تہذیب کے مینار نور ہیں جن کی ضیا پاشیوں سے دکن دیس آج بھی سرچشمۂ علم و تہذیب بنا ہوا ہے ۔ وہ ایک جوہر شناس دانش ور اور اردو ادب اور کلچر کی ترقی میں محسن کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ ڈاکٹر زورؔ نے حیدرآباد میں ۱۹۲۹ء میں ادارۂ ادبیاتِ اُردو کی بنیاد ڈالی ۔ اور انھوں نے اہل قلم اصحاب کی ایک نسل کو تیار کر کے ایک عہد ساز کارنامہ انجام دیا ہے ادارہ کے ذریعہ سینکڑوں قلم کاروں کی تربیت کی ۔ معنی تبسم نے زورؔ صاحب کے اس مشن کو نہ صرف آگے بڑھایا بلکہ ادارہ کو تحریک کا درجہ دے دیا۔ ادارۂ ادبیاتِ اُردو کی جانب سے جاری کردہ رسالہ "سب رس" کے مدیر کی حیثیت سے معنی تبسم ۱۹۷۸ء سے اپنے فرائض بخوبی انجام دے رہے ہیں ۔ وہ ۱۹۹۵ء میں بہ حیثیت معتمد ادارۂ ادبیاتِ

اُردو مقرر ہوئے۔ جب سے معتبر تبسم ماہنامہ "سب رس" کے مدیر اور ادارۂ ادبیات اُردو کے معتمد ہے ہیں ادارۂ ادبیات میں وقتاً فوقتاً ادبی جلسے، سمینار، سمپوزیم، مشاعرے اور تہذیبی پروگرام ہوتے رہے ہیں۔ ان ادبی جلسوں میں اُردو کی بقا و تحفظ اور اشاعت کے مسائل پر کامیاب سمینار منعقد کیے جاتے ہیں۔ ادارۂ ادبیات کے تحت مختلف ادبی موضوعات پر بھی سمینار آراستہ کیے جاتے ہیں۔ اسکے علاوہ ادارۂ ادبیاتِ اُردو نے دکن کے ضمن میں متعدد جلسے اور سمینار کیے۔ یوم قلی قطب شاہ، گولکنڈہ میشل وغیرہ جیسے عظیم الشان جلسے بھی منعقد کیے گئے۔ لیکن یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ معتبر تبسم کی کاوشوں کی وجہ سے ڈاکٹر زور کی قائم کردہ روایتیں نہایت تزک و احتشام کے ساتھ رواں دواں رہی ہیں اور ادارہ کے تحت منعقد کیے جانے والے سالانہ پروگرام جید آباد کی ایک اہم تہذیبی روایت بن چکے ہیں۔

اردو زبان کی ترویج و اشاعت کے ضمن میں ادارۂ ادبیاتِ اردو کا ایک سب سے بڑا کارنامہ طلبا میں اُردو تعلیم کو عام کرنا ہے اس مقصد کے لیے ایک باضابطہ شعبۂ امتحانات بنایا گیا جس میں اردو دانی، زبان دانی، اردو ماہر، اُردو عالم اور اردو فاضل کے امتحانات منعقد کیے جاتے رہے ہیں اور ہر سال ہزاروں کی تعداد میں طالب علم ان امتحانات میں شریک ہوتے رہے ہیں۔ پچھلے چند برسوں سے اردو دانی اور زبان دانی کے امتحانات کی ذمہ داری عابد علی خاں ایجوکیشنل ٹرسٹ نے امتحانات کے انعقاد کی ذمہ داری سنبھال لی ہے اور ادارہ کے تحت ہونے والے امتحانات کے سارے اخراجات بھی برداشت کرتے ہیں۔ یہ امتحانات ان طلبا کے لیے ہیں جو اُردو کی ابتدائی تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ماہر اور عالم اس کے

لعد کے مدارج ہیں جس میں عالم کا امتحان میٹرک کے مماثل ہے اور فاضل کا امتحان انٹرمیڈیٹ کے برابر۔ ۱۹۹۹ء میں حکومتِ آندھرا پردیش کے بورڈ آف انٹرمیڈیٹ ایجوکیشن نے فاضل کے امتحانات کو انٹرمیڈیٹ کے مماثل قرار دیا اور اس کامیابی کا سہرا مغنی تبسم کے سر بندھتا ہے ان امتحانات کے مادع طالبات اب بی۔اے، بی۔کام اور ٹیچرس ٹریننگ کے امتحانات میں شریک ہوسکتے ہیں اور اس طرح اردو داں طلبا و طالبات کے لیے ترقی کی نئی راہیں نکل آئی ہیں۔ مغنی تبسم کی کوششوں سے ادارۂ ادبیاتِ اُردو میں ایک خطاطی کلاس بھی قائم کیا گیا جہاں اردو داں طلباء طالبات کو ماہر اساتذہ کے زیرِ نگرانی خطاطی کی تربیت دی جاتی ہیں۔

سن ۱۹۹۹ء میں ادارۂ ادبیاتِ اُردو نے نیشنل کونسل فار پراموشن آف اُردو لینگویج کے تعاون سے اُردو کمپیوٹر سافٹ ویر کے علاوہ متداولہ اہم کمپیوٹر پیکیجس کی تربیت کا بھی اہتمام کیا ہے اور اب اس ادارہ کے فارغ التحصیل طلبا جدید ٹکنالوجی سے مربوط ہو رہے ہیں اور اس طرح وقت کی ایک اہم ضرورت پوری ہو رہی ہے۔ ادارۂ ادبیاتِ اُردو کی یہ ہمہ جہت ترقی مغنی تبسم ہی کے ذہن رسا کا فیضان ہیں جنھوں نے نہایت لگن اور شبانہ روز محنت سے اس ادارۂ ادبیاتِ اُردو کو اہم ادارہ بنا دیا جو اُردو کی ترویج و اشاعت میں ہمہ تن مصروف ہیں۔

ادارہ شعروحکمت

مغنی تبسم ادارہ شعروحکمت کے بانی ہیں جس کے نائب صدر شہریار اور معتمد صلاح الدین نیر تھے پہلی دفعہ اس ادارہ کی جانب سے ۱۹۷۰ء میں ایک سہ ماہی رسالہ شعروحکمت کا اجراء عمل میں آیا۔ یہ رسالہ ۱۹۷۰ء سے ۱۹۷۵ء تک نکلتا رہا۔ ابتدا میں یہ رسالہ شعروشاعری کی تنقید کے لیے مخصوص تھا لیکن بعد میں افسانے بھی شائع ہونے لگے۔ جدیدیت کے فروغ کے لیے اس رسالہ نے اہم رول ادا کیا۔ ہندوستان کے علاوہ بیرون ملک کے تمام لکھنے والوں کو اس کا تعاون حاصل تھا۔ اس ادارہ کے تحت ہندوستانی زبانوں اور بیرونی اہم زبانوں کی شعری تخلیقات اور ادبی مقالوں کے تراجم بھی شائع کیے جاتے تھے۔ ہندوستان و پاکستان کے بہت سے ایسے شعراء جنھوں نے بعد میں اردو ادب میں شہرت حاصل کی ان کو متعارف کروانے میں شعروحکمت کا بڑا عمل دخل رہا ہے۔ اس رسالے کے سال میں دو شمارے شائع ہوتے رہے چنانچہ چار سال میں سات شمارے نکلے۔ شعروحکمت کا ایک ن۔م راشد نمبر بھی شائع ہوا جس کے مرتبین معین تبسم اور شہریار رہے پھر کچھ عرصہ کے لیے اس ادارے کا کام معطل ہوگیا لیکن دوبارہ اس ادارہ شعروحکمت کی ادبی سرگرمیاں شروع ہوئیں۔ اس بار اس کا دور ۱۹۸۹ء سے ۱۹۹۰ء تک رہا۔ اس دفعہ شفیق فاطمہ شعریٰ اور علی ظہیر کو بہ حیثیت معاون شریک کیا گیا۔ اس دوران شعروحکمت کے صرف دو رسالے شائع ہوئے۔ اس کے بعد پھر اس کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ پھر شعروحکمت کا تیسرا دور ۲۰۰۰ء میں شروع

ہوا۔ دورِ سوم میں رسالہ شعروحکمت کی سرگرمیاں بڑے زور وشور سے شروع ہوئیں۔ معنی تبسم اور شہریار نے رسالہ شعروحکمت کے تیسرے دور کی پہلی کتاب ۲۰۰۰ء میں مرتب کی اس کے بعد دو اور شمارے منظرِ عام پر آئے۔ پچھلا شمارہ تو ضخامت اور مواد کے اعتبار سے ہندوستان میں چھپنے والے تمام جرائد میں ممتاز مقام کا حامل ہے۔ اس کا تفصیلی ذکر آگے آئے گا۔

آندھراپردیش اردو اکیڈیمی

اس اکیڈیمی کے زیرِ اہتمام اُردو زبان وادب کے بعض نہایت اہم موضوعات پر سمینار س، سمپوزیم اور توسیعی لکچروں کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ ان سمیناروں اور سمپوزیم کے انعقاد میں معنی تبسم نے ہمیشہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ان ہی کی ایما پر ۸/مارچ ۱۹۷۹ء کو اُردو افسانے کے ۲۵ سال پر سمپوزیم اور شامِ افسانہ کا انعقاد کیا گیا تھا۔ یہ تقریب سہ مقام حالکی پرشاد ہال انوارالعلوم کالج میں ہوئی جس کی صدارت عصمت چغتائی نے انجام دی۔ اس سمپوزیم میں کلیدی مضمون پیش کرتے ہوئے معنی تبسم نے آزادی سے قبل کے اُردو افسانے کا تفصیلی جائزہ لیا۔ اس کے علاوہ اُردو اکیڈیمی کے تحت انجام دی جانے والی مختلف سرگرمیوں سے معنی تبسم کی وابستگی ہمیشہ برقرار رہی۔

ادبی ٹرسٹ

اس ٹرسٹ کے زیرِ اہتمام پہلے کل ہند مشاعرہ ۱۹۶۶ء

سے اٹھارویں کل ہند مشاعرہ ۱۹۸۳ء تک کے مشاعروں میں
جن قابلِ ذکر مہمان شعرا نے شرکت کی ان میں مخدوم محی الدین،
سلیمان اریب، سعید حیدری، اوج یعقوبی، علی احمد جلیلی،
کنول پرشاد کنول، شاد عمکنت، راشد آذر، خواجہ شوق کے ساتھ
ساتھ معنی تبسم بھی شامل ہیں۔ ان مشاعروں کے انعقاد کے ضمن میں
معنی تبسم کے قیمتی مشورے ہمیشہ معاون رہے۔ علاوہ ازیں
ادبی ٹرسٹ کی دیگر سرگرمیوں میں بھی معنی تبسم شامل رہے ہیں۔

ایچ ای ایچ دی نظامس اردو ٹرسٹ

اس ٹرسٹ کے زیرِ اہتمام ۲۶/ نومبر ۱۹۷۸ء کو
آندھرا یونیورسٹی میں "اردو کے ۲۲ سال" کے عنوان پر سمینار
منعقد کیا گیا تھا جس میں ڈاکٹر معنی تبسم حیدرآباد میں ادب کے
مختلف موضوعات پر جو کام یا تحقیق کو پیش اس پر مقالے پڑھے۔
اسکے علاوہ ٹرسٹ نے ادارۂ ادبیات اردو اور دیگر ادبی
انجمنوں کے تعاون سے ماہ ڈسمبر ۱۹۸۱ء میں کل ہند سطح پر مالی
سمینار منعقد کیا گیا تھا جس کے کنوینر معنی تبسم تھے۔ اس ٹرسٹ
کی مالی اعانت سے شائع ہونے والی کتابوں میں معنی تبسم کی ایک
کتاب "آواز اور آدمی" شامل ہے۔

اقبال اکیڈیمی

آزادی کے بعد ہندوستان میں اقبال کی قدر و قیمت میں
کمی محسوس کی جانے لگی۔ چنانچہ آنے والی نسلوں تک اقبال کے

پیام کو پھیلانے اور عام کرنے کی غرض سے اقبال اکیڈیمی قائم کی۔ حیدرآباد کے چند ممتاز ادیبوں اور دانشوروں نے جن میں سید خلیل اللہ حسینی، عالم خوندمیری، مغنی تبسم، ایاز انصاری اور سعید بن محمد نقش وغیرہ شامل تھے۔

اقبال اکیڈیمی کے زیر اہتمام منعقد ہونے والی تمام تقاریب میں مغنی تبسم کا کلیدی رول رہا ہے۔ تقریباً ہر بڑے سمینار اور کانفرنس میں انہوں نے نہ صرف مقالے پیش کیے بلکہ اپنے مشوروں کے ذریعے ان جلسوں، تقاریب، سمینار اور سمپوزیم کو کامیاب بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔

انجمن ترقی اُردو

مغنی تبسم اور ڈاکٹر حسینی شاہد کی تحریک پر انجمن ترقی اُردو کے زیر اہتمام اورینٹل کالج اُردو کا قیام ۱۹۵۶ء میں عمل میں آیا۔ اس کالج کے پہلے پرنسپل پروفیسر ابوظفر عبدالواحد تھے ان کے بعد پروفیسر سید محمد پرنسپل رہے پھر ڈاکٹر حسینی شاہد پرنسپل ہوئے بعد ازاں سید اکرم حسین اس کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ آج کل ڈاکٹر مریدہ وقار انچارج پرنسپل ہیں۔ اس کالج کے قیام کے بعد ایک عرصے تک مغنی تبسم نے اعزازی طور پر تدریسی خدمات انجام دیں۔ حیدرآباد میں انجمن ترقی اُردو کی چار مکل ہند اُردو کانفرنسیں منعقد ہوئیں اور ان تمام میں مغنی تبسم نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

اُردو مجلس

ادارہ اُردو مجلس مرزا فرحت اللہ بیگ نے قائم کی تھی جس کا پہلا جلسہ 19 / فروری ۱۹۵۳ء کو مرزا فرحت اللہ بیگ ہی کے مکان پر ہوا۔ اُردو مجلس کے جلسے ہر ماہ اراکین کے مکان پر منعقد ہوا کرتے تھے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ کے انتقال کے بعد سجاد مرزا اردو مجلس کے کاموں کو یرواں چڑھاتے رہے۔ اُردو ہال کی تعمیر کے بعد اُردو مجلس کے جلسے اُردو ہال میں منعقد ہونے لگے۔ سجاد مرزا کے انتقال کے بعد رائے جانکی پرشاد اُردو مجلس کے صدر منتخب ہوئے منظور احمد منظور معتمد انتظامی اور معتمد ادبی کی حیثیت سے معمی تتم منتخب ہوئے۔ یہ ٹیم بہت ہی پرجوش تھی چنانچہ ادبی محاذ کے علاوہ اکتوبر ۵۸ء سے ماہی رسالہ "مجلس" شائع کیا جانے لگا۔ اس رسالہ کو ترتیب دینے والے معمی تتم اور منظور احمد منظور تھے۔ اس رسالے کی رسم اجرا پر مختلف ادیبوں نے اپنی نیک خواہشات اور تاثرات کا اظہار کیا۔

حبیب الرحمٰن صاحب نے لکھا۔

"اردو مجلس" کئی سال سے خاموشی
کے ساتھ اردو ادب کی خدمت کر رہی ہے
مشہور ادیب مرزا فرحت اللہ بیگ نے اسے
قائم کیا تھا۔ ان کے بعد مرحوم کے دوستوں
نے اسے جاری رکھا۔ اور خوش اسلوبی
کے ساتھ اسے چلا رہے ہیں اس مجلس
میں اکثر بڑے اچھے اور بلند معیار کے

مقالے پڑھے جاتے ہیں، جن کی اشاعت
کی کوئی صورت نہیں تھی۔ لیکن اب
ہمارے نوجوان ادیب منظور احمد
منظور صاحب اور معین تبسم صاحب
کی کوششوں سے جن کے سپرد حال
میں اردو مجلس کا کام کیا گیا ہے یہ
صورت پیدا ہوئی ہے۔ امید ہے کہ
اردو دوست اصحاب اس رسالے
کو پسند کریں گے اور اس کے جاری رکھنے
میں کارکنوں کا ہاتھ بٹائیں گے" [1]

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور نے لکھا

"اردو مجلس حیدرآباد میں سالہا سال
سے اردو کا ثقہ اور شائستہ ذوق
پھیلانے میں سرگرم عمل ہے۔۔۔۔
۔۔۔۔۔۔۔ سالِ حال حیدرآباد کے
ایک مقبول اور مخلص سماجی اور
ادبی کارکن جانکی پرشاد صاحب اس
کے صدر اور معین تبسم اور محمد منظور
احمد جیسے نوجوان اور متعدد اہل ذوق
اس کے معتمد بن مقرر ہوئے ہیں۔
اس طرح اس محفل کی رگ و پے میں
ایک جوان اور شگفتہ خون بھی داخل
ہو گیا ہے اور زندگی، زندہ دلی اور
سرگرمی کی نئی رو دوڑنے لگی ہے

---

[1] اردو مجلس - پیامات، جلد (۱) شمارہ (۱) اکتوبر ۱۹۵۸ء ص ۱۱، ۱۲

جس کا ایک ثبوت یہ ترجمان ہے، جو
اس کی طرف سے شائع کیا جا رہا ہے۔
اس کی بڑی سخت ضرورت تھی اور
جو لوگ اس کو مرتب کر رہے ہیں، ان
میں کام کرنے اور عمدہ کام کرنے کی جو
صلاحیت بے حین ہے اس کے پیش نظر
مجھے یقین ہے کہ یہ کام جاری رہے گا۔
اور حیدرآباد کی علمی و ادبی فضا کو
مستفید کرنے کے علاوہ حیدرآباد کے
علمی و ادبی کام اور نام کو دُور
دُور تک پہنچائے گا۔"[1]

جناب سجاد مرزا صاحب نے یوں اظہار خیال کیا
"۔۔۔۔۔۔۔۔۔" "اردو مجلس" جس
کو بعض احباب بوڑھوں اور وظیفہ
یابوں کی مجلس کہنے لگے تھے، اس کے
بانی اور کارپردازوں نے اُردو مجلس
کی باگ نوجوانوں کے ہاتھ میں دے
دی اس واقعہ کو کچھ عرصہ ہوا کہ
مجلس میں ایک حرکت پیدا ہوئی اور
ان نوجوانوں نے ٹھوس کام کرنے شروع
کر دیئے۔ اُردو مجلس میں جو مضامین
پڑھے جاتے ہیں ان میں سے چند ہی

---

[1] ۔ اُردو مجلس۔ پیامات، جلد (۱) شمارہ (۱) اکتوبر ۱۹۵۸ ص ۱۲، ۱۳

بہ مشکل طبع و شائع ہو سکے۔ لیکن
لیکن اب جو یہ ارادہ ہے کہ عمدہ،
معیاری اور مقبول مضامین کو
باقاعدہ طور سے شائع کیا جائے ایک
نیا اقدام ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ مالی
پہلو کو نظر انداز نہ کیا گیا تو اردو
زبان کے سرمایہ میں معید اضافہ
ہوگا"[1]

رائے جانکی پرشاد نے اردو مجلس کی اجرائی پر کہا کہ:

"جناب منظور احمد منظور صاحب اور
جناب معنی تبسم صاحب کی پُرخلوص
کوششوں کی بہ دولت یہ ممکن ہو سکا کہ
ایک علمی رسالہ منظرِ عام پر آیا۔ دُعا
ہے کہ ان دونوں حضرات کی کوشش
بار آور ثابت ہوں۔ مجھے بھروسہ ہے
کہ مجلسِ ادارت کو اردو داں حضرات
کا پورا تعاون حاصل رہے گا"[2]

بشپ جان عبدالسمان نے تحریر کیا کہ

"رسالہ "مجلس" کے اجراء کی خبر میرے
لیے مسرت بخش ہے ------

---

[1] ۔ اردو مجلس پیامات، جلد (۱) شمارہ (۱) اکتوبر ۱۹۵۸ء ص، ۱۴

[2] ۔ اردو مجلس پیامات، جلد (۱) شمارہ (۱) اکتوبر ۱۹۵۸ء ص، ۱۵

ان تمام لوگوں کو جنھیں اُردو زبان سے
قلبی انسیت ہے، اُردو مجلس کے
اراکین کا بالخصوص معنی تبسم اور
جناب منظور احمد جیسے اہلِ ذوق
کا ممنون و متشکر ہونا چاہیئے"[1]

معنی تبسم اور منظور احمد منظور کی نگرانی میں "مجلس" کے صرف دو تین رسالے اور کچھ ضخیم خصوصی نمبر بھی شائع ہو چکے ہیں۔ جن میں "آفاق نمبر"، "مومن نمبر"، "غالب نمبر" اور "عبدالحق نمبر" قابلِ ذکر ہیں۔ اس کے بعد معنی تبسم اپنی مصروفیات کی وجہ سے معتمدی کی ذمہ داری سے سبکدوش ہو گئے۔ اس کے بعد "مجلس" کی اشاعت بھی محدود ہو گئی۔

عوامی ادبی سوسائٹی

معنی تبسم کی تحریک پر عوامی ادبی سوسائٹی معل پورہ میں قائم کی گئی تھی اس سوسائٹی کے سکریٹری نفیر اختر صاحب تھے اور "لکھنے" والے نوجوانوں میں لتی تنویر بھی شامل تھے جو اس وقت لندن میں مقیم ہیں۔ سلیمان اریب سے معنی تبسم کی وقتی ان بن کی وجہ سے عوامی مصنفین کا قیام عمل میں آیا تھا۔ اس کے بعد پرانے شہر میں بھی نوجوانوں کی

انجمن ترقی پسند مصنفین

انجمن ترقی پسند مصنفین کے سکریٹری سلیمان اریب تھے۔

---

[1] اردو مجلس پیلیات جلد (۱) شمارہ (۱) اکتوبر ۱۹۵۸ء ص ۱۶

ان کے بعد اختر حسن صاحب سکریٹری مقرر ہوئے۔ معین تبسم بھی ۱۹۴۷ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی تحریک میں شامل ہوگئے۔ اس انجمن کے تحت ایک ہفتہ وار پرچہ نکلتا تھا۔ انجمن کے جلسے اختر حسن صاحب کے آنگن میں ہوا کرتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب پولیس ایکشن ہیں ہوا تھا۔ رضاکارانہ تحریک عروج پر تھی اور آزاد حیدرآباد کے نعرے لگائے جاتے تھے۔ ہندوستان کی آزادی کے لیے کچھ ہی دن باقی رہ گئے تھے۔ یہ دور بڑی کشمکش کا دور تھا تبھی ترقی پسند مصنفین میں نظریاتی اختلافات بڑھنے لگے۔ ان دنوں ابراہیم جلیس مجلس کی تائید میں تھے، نظیر حیدرآبادی، تجمل سروری وغیرہ بھی ان کے ساتھ تھے۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ حیدرآباد کی ریاست کو آزاد رہنا چاہیئے۔ دوسرے گروپ کا یہ خیال تھا کہ انڈین یونین میں شامل ہوجانا چاہیئے تاکہ شاہی نظام کا خاتمہ ہوجائے۔ اس گروپ میں معین تبسم اور عالم خوندمیری وغیرہ شامل تھے۔ جب بھی ان لوگوں کی میٹنگ ہوتی ہر میٹنگ میں یہی بحث ہوتی ایک طرف ابراہیم جلیس کھڑے ہوتے اور لمبی چوڑی تقریر کرتے پھر اس کا جواب عالم خوندمیری دیتے۔ آخرکار دونوں گروپوں نے اپنی اپنی انجمن علیحدہ بنالی اور دونوں کے الگ الگ جلسے ہونے لگے۔ ابراہیم جلیس کے زیر اثر انجمن سی وہ سقوط حیدرآباد کے بعد ختم ہوگئی لیکن ترقی پسند مصنفین باقی رہی۔ آزادی کے بعد اس انجمن کے ایک اجلاس میں سلیمان اریب نے تلنگانہ پر ایک نظم پڑھی تو انہیں گرفتار کرلیا گیا۔ مخدوم محی الدین بھی انڈر گراؤنڈ تھے اور اختر حسن کو بھی گرفتار کرلیا گیا تھا۔ چنانچہ عزیز قیسی کو انجمن ترقی پسند مصنفین کا معتمد مقرر کیا گیا نصیر احمد کو کارگذار معتمد اور معین تبسم کو خازن منتخب کیا گیا اور انجمن کے جلسے عزیز قیسی کے مکان پر ہونے لگے۔

بعدازاں یہ ادارہ مخدوم کے مشورے پر انجمن ترقی اردو کا حصہ بن گیا۔

محفلِ علم وادب ۔ انجمن عوامی مصنفین

حسن رمانے میں تیسری جنگ کا خطرہ منڈلا رہا تھا
STOKE HOME میں دنیا کے ادیب شعرا جمع ہو گئے تھے۔
اور جنگ کے خلاف امن کی اپیل STOKE HOME PEACE جاری کی۔
ساری دنیا کے ادیب اس اپیل پر دستخط کر رہے تھے۔ ادھر حیدرآباد
میں عزیز قیسی، نصیر افسر اور معین تبسم وغیرہ اس اپیل کو لبیک کہا۔
اور ایک امن کانفرنس کا اعلان کیا۔ نصیر افسر کے نام سے امن کا پیام
شائع کیا گیا لیکن انھیں گرفتار کیا گیا۔ معین تبسم عزیز قیسی وغیرہ نے
محسوس کیا کہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے نام سے کام کرنا مشکل ہے لہذا
اس کا نام محفلِ علم و ادب رکھا گیا۔ شاہ غیاث کو اس کا معتمد
بنایا گیا محفلِ علم وادب کے جلسے ملک پیٹھ میں کبھی عبدالقیوم خاں
باقی کے مکان پر اور کبھی شاہ غیاث کے مکان پر ہر ہفتہ ہوا کرتے تھے۔
اس خیال سے کہ کہیں حکومت کی نظر میں نہ آجائے بعض غیر ترقی پسند
ادیبوں اور شاعروں کو اس میں شامل کیا گیا پھر سلیمان اریب،
سریواس لدھوٹی اور حسینی شاہد جیل سے رہا ہوئے تو وہ بھی اسی
انجمن میں شامل ہو گئے۔ سلیمان اریب کو محفلِ علم وادب کا معتمد
مقرر کیا گیا۔ چند جلسوں کے بعد محفلِ علم وادب کا نام بدل کر انجمن
عوامی مصنفین رکھ دیا گیا۔ کمیونسٹ پارٹی پر سے پابندی اُٹھ گئی تھی
اس لیے کھلے بندوں ہفتہ وار جلسے منعقد کیے جانے لگے۔ اس وقت
یہ جلسے جدید ریڈی ہاسٹل کے قریب ایم ایم ہاشم کے مکان پر
ہونے لگے۔ جو بعد میں کانگریس میں شامل ہو گئے اور اسمبلی اور

بعد میں پارلیمنٹ کے رکن بنے۔ جس وقت سلیمان اریب نے رسالہ "صبا" جاری کیا تو انجمن عوامی مصنفین کے جلسے محمود گاہ (بیجلرس کوارٹرس کمرہ نمبر '17' جہاں صبا کا دفتر تھا) منعقد کیے جانے لگے۔ 'صبا' جاری کرنے سے پہلے سلیمان اریب سب رس کی ادارت کے فرائض انجام دیتے رہے لیکن بعض ادیبوں اور شاعروں سے اختلافات ہوئے جن میں معین تبسم، عاتق شاہ، قمر ساحری اور سرور ڈنڈا شامل تھے۔ ان چاروں نے مل کر دو ماہی رسالہ "شعور" جاری کیا جس کے تین شمارے شائع ہوئے پھر یہ رسالہ بند کر دیا گیا۔

نیشنل رائٹرس اسوسی ایشن

معین تبسم نے اکرام جاوید کے ساتھ مل کر نیشنل رائٹرس اسوسی ایشن (N.W.A) 1950ء میں قائم کی۔ یہ ادارہ دو سال تک کام کرتا رہا۔ سلیمان اریب سے اختلافات بعد میں ختم ہو گئے۔ اور وہ عوامی مصنفین کے جلسوں میں شریک ہونے لگے۔ ڈاکٹر عبد الحلیم حیدرآباد آئے تو اردو ہال میں ادیبوں کا ایک جلسہ اس بات پر غور کرنے کے لیے منعقد کیا گیا کہ ان انجمن ترقی پسند مصنفین کا احیا کیا جائے یا اُس کی ضرورت نہیں۔ مخدوم محی الدین اور زیادہ تر ادیبوں کی یہ رائے تھی کہ اب حالات بدل چکے ہیں ترقی پسند تحریک اپنا کام کر چکی ہیں جن میں ترقی پسند مصنفین کے نام تھے انجمن قائم کرنے کی ضرورت ہیں۔ پھر انجمن عوامی مصنفین کے جلسے بھی ہونے بند ہو گئے۔ 1960ء کے بعد سے اردو میں جدیدیت کے رجحان کا آغاز ہوا۔ اس رجحان سے ہندوستان کے بہت سے ادیب متاثر ہوئے جن میں حیدرآباد کے ادیب بھی شامل تھے۔ احمد ہمیش ان دنوں حیدرآباد میں تھے چند ادیبوں نے جن میں

سلیمان اریب، معنی تبسم، انور معظم، احمد ہمیش، حسن فرح، رؤف خلش وغیرہ شامل تھے یہ طے کیا کہ جدید ادیبوں کی کل ہند کانفرنس منعقد کی جائے۔ مخدوم محی الدین بھی اس کی تائید میں تھے اس کانفرنس میں یہ طے کیا گیا کہ کٹر کمیونسٹ اور کٹر مخالف کمیونسٹ عناصر سے اس کانفرنس کو الگ رکھا جائے اور کٹر کمیونسٹ میں سجاد ظہیر اور علی سردار جعفری اور مخالف کٹر کمیونسٹ میں گوپال متل کو کانفرنس میں شرکت کی دعوت نہ دی جائے لیکن احمد ہمیش نے گوپال متل کو شرکت کی دعوت دے دی اور ان کا خط تحریک میں شامل ہوا جسکی وجہ سے اختلافات پیدا ہوئے اور یہ کانفرنس منعقد نہ ہو سکی۔ کچھ دنوں بعد دہلی میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے احیاء کے لیے ایک کانفرنس منعقد ہوئی جس میں مخدوم محی الدین کے ساتھ حسن فرح اور رؤف خلش نے شرکت کی۔ لیکن انجمن کے احیا کی یہ کوشش ناکام ثابت ہوئی پھر حیدرآباد کے نوجوان ادیبوں نے مل کر ایک نئی تحریک حیدرآباد لٹریری فورم (حلف) قائم کی۔ کچھ عرصہ تک اس کے اجلاس ہوتے رہے پھر تعطل پیدا ہوا۔

1990ء میں دوبارہ لٹریری فورم (حلف) کا احیا کیا گیا۔ معنی تبسم کو اس کا صدر منتخب کیا گیا۔ تین سال بعد الیکشن ہوا دوبارہ معنی تبسم ہی کو اس کا صدر منتخب کیا گیا۔ حلف کے دستور کی رُو سے دو میقات سے زیادہ کسی شخص کو معتمد یا صدر نہیں بنایا جا سکتا تھا۔ اسلئے معنی تبسم کے بعد انور معظم کو حیدرآباد لٹریری فورم (حلف) کا صدر منتخب کیا گیا۔ حلف کی صدارت سے سبکدوش ہونے کے بعد معنی تبسم کو انجمن ترقی پسند مصنفین کا صدر بنایا گیا۔ دو تین سال تک یہ انجمن فعال رہی پھر کل ہند ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس حیدرآباد میں منعقد

ہوئی جس میں ڈاکٹر معین تبسم کو کل ہند انجمن ترقی پسند مصنفین کا نائب صدر منتخب کیا گیا۔

پچھلے صفحات پر صرف چند ایسے اداروں کا ذکر کیا گیا جن کے ساتھ معین تبسم کی گہری ذہنی وابستگی رہی۔ ان کے علاوہ اور بھی کئی ادارے جیسے اقلیم ادب، حیدرآباد اکیڈیمی وغیرہ سے بھی معین تبسم کیثیت سرپرست وابستہ رہے کئی ادارے ایسے بھی ہیں جنھوں نے ایسے سمیناروں اور ادبی اجلاسوں میں معین تبسم کو بارہا مدعو کیا اور معین تبسم نے بسروچشم اسے نہ صرف قبول کیا بلکہ کیثیت صدر مہمان خصوصی یا مقرر کی حیثیت سے اپنی تقریر کے موتی بکھیرے۔

شخصیت

کسی بھی انسان کی شخصیت اس کے کردار کا آئینہ دار
ہوتی ہے۔ شخصیت میں انسان کی خوبیاں اور خامیاں دونوں موجود ہوتے ہیں۔
اس میں انسان کا مزاج اور اس کی فطرت بھی شامل ہے۔ احساسات،
جذبات، دوسروں کے ساتھ برتاؤ، شرافت، لمح، ظرافت، محبت،
نفرت، تضادات، اصول زندگی وغیرہ یہ تمام شخصیت ہی کے مختلف
رخ ہیں۔

لفظ شخصیت (personality) دراصل لاطینی لفظ
persona سے اخذ کیا گیا ہے۔ جس کا مطلب ماسک یا نقاب
کے ہے۔ مختلف ماہرین نفسیات نے شخصیت کی تعریف مختلف انداز
سے کی ہے۔ لٹنے نے شخصیت کی باطنی صداقت کو قدر اولیٰ کہا تو گوئٹے
نے خود شخصیت کو قدر اوّل قرار دیا ہے۔ کانٹ کے نظریے کے مطابق
انسان کی شخصیت تمام مخلوقات سے افضل ہے اور کائنات کی تمام
چیزیں انسان کے تابع اور اس کے تصرف کے لیے ہے۔ اور انسان ان ہی
انفرادی آزادی کی وجہ سے تمام مخلوقات سے برتر ہے۔ اقبال کے ہاں بھی
یہی تصور ملتا ہے کہ یہ کائنات انسان ہی کے لیے تخلیق کی گئی ہے۔

ہیں تیرے تصرف میں یہ بادل یہ گھٹائیں
یہ گنبدِ افلاک یہ خاموش فضائیں
یہ کوہ، یہ صحرا، یہ سمندر یہ ہوائیں
تھیں پیش نظر کل تو فرشتوں کی ادائیں
آئینہ ایام میں اپنی ادا دیکھ

ایڈلر شخصیت کو انسان کی اندرونی کیفیت کا نام دیتا ہے جو اسے فی نفسہٖ قابلِ قدر بناتی ہے۔ آل پورٹ (Allport) کا کہنا ہے کہ شخصیت فرد کی ذات کے اندر ان نفسی اور طبعی نظاموں کی حرکی تنظیم ہے جو انسان کے منفرد اعمال کا تعین کرنے میں مدد دیتے ہیں۔

شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں ماحول اور اجتماعی لاشعور کا بھی دخل ہوتا ہے۔ اسی لیے یونگ نے آرکی ٹائپ اور Collective Conciousness یا اجتماعی لاشعور کو اہمیت دی۔

دراصل شخصیت کوئی ریاضی کے فارمولے قسم کی چیز نہیں۔ بلکہ یہ ایک ایسا جامع تصور ہے جس کا تعلق انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے ہوتا ہے جس کا آغاز وراثت سے ہوتا ہے۔

اگر مغنی قسم کی شخصیت کا جائزہ لیا جائے تو بڑے عجیب و متضاد نتائج سامنے آتے ہیں۔ لاکھ کوشش کرنے کے باوجود ان کی شخصیت پوری طرح نہیں کھل پاتی۔ مغنی صاحب کی شخصیت کی کئی پرتیں ہیں ایک پرت ہٹائیے تو دوسری سامنے آجاتی ہے اور یہ سلسلہ جاری رہتا ہے ایسی متنوع شخصیتیں خال خال ہی نظر آتی ہیں۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ تخلیقی فن کار کی شخصیت عموماً پیچیدہ ہوتی ہے۔ مغنی قسم بھی ایک تخلیقی فن کار ہیں۔ شاعر بھی ہیں اور آرٹسٹ بھی شاید یہی وجہ ہے کہ پیچیدگی مغنی قسم کی شخصیت کا ایک اہم جزو ہے۔

معنی صاحب ۱۳ / جون کو پیدا ہوئے اس اعتبار سے وہ جیمنی ہیں کیوں کہ جیمنی کے دن ۲۱ / مئی سے ۲۱ / جون تک ہیں۔ جیمنی کے اشخاص عموماً دوہری شخصیت کے حامل ہوتے ہیں۔ معصومیت سادگی ان کا وصف ہوتا ہے ان میں دنیا پر چھا جانے کی صلاحیت ہوتی ہے انھیں روپے پیسے کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ دولت کی دیوی ان کے آگے پیچھے گھومتی رہتی ہے۔ اگر غور کیا جائے تو معنی صاحب میں مندرجہ بالا ساری باتیں موجود ہے۔

دوہری شخصیت کا مطلب یہ ہرگز نہیں سمجھنا چاہئے کہ اس کا تعلق کسی نفسیاتی گروہ سے ہے کیوں کہ علم نفسیات میں دوہری شخصیت کا کچھ اور مفہوم ہے علم نجوم میں دوہری شخصیت کا مطلب تضادات اور مزاج کا تنوع ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ معنی صاحب کے یہاں تنوع اپنی پوری قوت کے ساتھ جلوہ گر ہے یہی حال تضادات کا ہے وہ سخت گیر بھی ہیں اور انتہائی رحم دل بھی۔ ان کے اندر ایک رند بلانوش کے ساتھ ساتھ ایک صوفی بھی بیٹھا ہے جس کا اندازہ اُن کے بعض تبصروں اور ان کی ابتدائی شاعری سے کیا جا سکتا ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ انھیں صنفِ نازک کی قربت زیادہ پسند ہے لیکن قدیر زماں بتاتے ہیں کہ سالِ نو کی ایک محفل میں ایک سانولے شخص سے صرف شاعری کی بنیاد پر بوسوں کا تبادلہ ہوا اور دوسرے دن صبح جب کسی خاتون نے ٹیلی فون کر کے سالِ نو کی مبارک باد دی تو

"معنی صاحب نے یہ کہتے ہوئے ٹیلی فون کا تار منقطع کر دیئے کہ اب آوازوں کی دنیا سے میرا کوئی رشتہ نہ رہا" [1]

وہ معنی صاحب ایک لحاظ سے دوہری شخصیت کے حامل ہیں اور جنس مخالف کو اپنی طرف راغب کرنے کی خداداد صلاحیت کے حامل ہیں۔ اور یہ بھی جیمنی کی ایک اہم خصوصیت مانی جاتی ہے۔

---

[1] قدیر زماں۔ مضمون "معنی قسیم" مشمولہ "نذر معنی قسیم" ص ۳۱۹

پروفیسر مغنی تبسم جنوبی ہندوستان میں حیدرآباد کی اس درخشاں زمین کے سپوت ہیں جو ہمیشہ سے ہی علم و ادب کا گہوارہ رہی ہے۔ سلطنتِ آصفیہ ہمیشہ سے صاحبانِ علم و کمال کی پذیرائی کرتی رہی تھی اور جب مغنی تبسم کا جنم ہوا اس وقت سلطنتِ آصفیہ اپنے پورے جاہ و جلال کے ساتھ تابناکیاں بکھیر رہی تھی۔

مغنی تبسم کی شخصیت بڑی پہلودار، ہمہ رنگ، پرکشش، متنوع اور آفاقیت سے بھرپور ہے۔ آپ برِصغیر ہند و پاک کے نامور اور ممتاز اسکالر، باشعور نقاد، سخن ور، کلاسیک سے جدیدیت تک یکساں نظر رکھنے والے دانش ور، قلم کار، محبوب استاد، با وقار مدیر، عثمانیہ یونیورسٹی و سنٹرل یونیورسٹی آف حیدرآباد کے استاد اور ادبی صحافت کے رمز شناس ہونے کے ساتھ ساتھ ایک باغ و بہار شخصیت کے مالک ہیں۔ آپ کی شخصیت میں رنگا رنگی غیر معمولی طور پر موجود ہے اور ساتھ ہی ساتھ آپ گوناگوں اوصاف کے حامل، غیر معمولی صلاحیتوں کا سرچشمہ اور ایک فعال انسان ہیں۔ آپ اپنی ذات سے خود ایک جیتی جاگتی انجمن ہی نہیں بلکہ چلتا پھرتا انسائیکلوپیڈیا ہیں۔ حیدرآباد میں ایسی ہستیاں خال خال ہی رہ گئی ہیں۔ کسی شاعر نے کہا تھا ؎

خدا کے واسطے اس کو نہ ٹوکو
یہی ایک شہر میں قاتل بچا ہے

یہ شعر مغنی صاحب کی شخصیت پر پوری طرح صادق آتا ہے۔

مغنی تبسم حیدرآباد میں حریت آباد کے آگے سوماجی گوڑہ میں واقع کایا ڈیالیس کے خوب صورت اور پرسکون مکان "سائبان" میں رہتے ہیں۔ سرخ و سفید رنگ، میانہ قد، گول چہرہ، بڑی بڑی غلافی آنکھیں، کشادہ اقبال مند پیشانی، ستوان ناک،

زلفیں قدرے لمبی، شاعرانہ پیکر، چہرے پر ہلکی مسکراہٹ۔ بات کریں تو یوں محسوس ہوتا ہے گویا پھول جھڑ رہے ہوں۔ بڑے ہی خوش وضع اور خوش پوش، عمدہ لباس کے دلدادہ اور با سلیقہ ہیں۔ کپڑوں کی استری خود ہی کرتے ہیں۔ اکثر نفیس قسم کی سفاری میں نظر آتے ہیں۔ کبھی کبھی محفلوں میں جودھ پوری سوٹ زیب تن کر کے سب کی نظروں کا مرکز بن جاتے ہیں۔ رہن سہن اور معمولات میں کافی منظم انسان ہیں۔ ہر چیز صفائی، سلیقہ مندی، رکھ رکھاؤ اور نفاست کی مظہر ہوتی ہے۔ چائے، تمباکو سگریٹ اور سگار، عمدہ مشروب، رہن سہن کا اعلیٰ معیار اور وقت کی اہمیت اور پابندی، مہمان نوازی میں یکتا۔ برصغیر میں آپ کے کام اور نام کی دھوم ہے آپ کو خدا نے جہاں علم کی دولت عطا کی ہے وہیں ایک انصاف پسند دل بھی دیا ہے۔ جتنا اونچا مقام آپ رکھتے ہیں اتنے ہی منکسر المزاج اور حلیم الطبع ہیں۔

مغنی صاحب کی بزلہ سنجی، خوش مزاجی، حوصلہ، تحمل، کم گوئی و کم سخنی اور اپنے میدان میں مسلسل محنت کیے جانے کی عادت بے حد متاثر کن ہے۔ ان کے ہاں ہر چیز ایک اعتدال سے ہے یہی اعتدال ان کے تنقیدی رویّے میں بھی نمایاں ہے ان کے اعتدال پسندانہ رویّے کے سلسلے میں پروفیسر لطف الرحمٰن اس طرح رقمطراز ہیں۔

"اپنے اعتدال پسندانہ رویّے اور عقلی استدلال کی وجہ سے ساری ادبی دنیا میں ایک خاص امتیاز و انفرادیت رکھتے ہیں۔ کلاسیکی اقدار و روایت پر معتبر نگاہ کے ساتھ ساتھ ان کے یہاں زندگی اور ادب کے بدلتے

ہوئے رجحانات و میلانات سے
سازگار مفاہمت اور معتدل امتزاج
کا رویہ ہمیشہ نمایاں رہا ہے جس
نے ہر حلقۂ ادب میں ان کو باوقار
رکھا ہے"[۱]

جیسا کہ پہلے لکھا گیا، معنی تبسم کا تعلق گجرات کے میمن خاندان سے ہے اور خاندان کے تقریباً سبھی افراد تجارت سے وابستہ رہے ہیں ساتھ ساتھ اس گھرانے سے تصوف کی روایت بھی جڑی ہوئی ہے۔ چنانچہ ان کے تایا کو تصوف سے کافی رغبت رہی۔ معنی تبسم کا بچپن اپنے تایا کی نگرانی میں گزرا اس لیے لازم تھا کہ ان پر بھی تایا کی فکر کا اثر پڑتا۔ ان کے تایا انہیں اپنے ساتھ مشاعروں کے علاوہ سماع یا قوالی کی محفلوں میں بھی لے جاتے تھے۔ یہیں معنی تبسم کی موسیقی سے دلچسپی کا آغاز ہوا۔

میمن خاندان کے چشم و چراغ ہونے کی وجہ سے معنی تبسم تجارت کے نشیب و فراز سے پوری طرح واقف ہیں۔ لیکن مزاجاً شاعر ہیں اس لیے غالباً ایک روپیہ کو دو روپیوں میں تبدیل کرنا انہیں کبھی نہ آسکا۔ پھر بھی حساب کتاب میں وہ پکے ہیں۔ چنانچہ راقمۃ الحروف نے معنی صاحب کی دائری ڈائریوں میں روزانہ کیے جانے والے اخراجات کی تفصیل لکھی دیکھی ہے۔

زمانۂ طالب علمی میں پی۔ ایچ ڈی کے دوران معنی صاحب ورنگل کے ایک کالج میں پڑھا رہے تھے۔ یونیورسٹی نے نوٹس جاری کی کہ پی۔ ایچ ڈی کے طلبا کو مقررہ تاریخ تک مقالہ داخل کرنا ہوگا۔ پروفیسر مسعود حسین خاں نے معنی صاحب کو ہدایت دی کہ وہ جلد از جلد کام مکمل کریں جو ورنگل میں رہ کر نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ معنی تبسم

---

[۱] ۔ پروفیسر لطف الرحمٰن۔ مضمون معنی تبسم مشمولہ نذر معنی تبسم ص ۲۹۵

نے بلا تنخواہ رخصت لی اور حیدرآباد میں رہ کر اپنا کام پورا کیا۔
معین تبسم نے راقمۃ الحروف کو بتلایا کہ ان کے قیام حیدرآباد کے
دوران وہ لگ بھگ تین ماہ آندھرا میں چھ ہزار سے زاید خرچ ہوئے۔
تنخواہ کا لقصان علیحدہ تھا۔ اس کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ معین صاحب
نے حساب یاد رکھا کہ ان کی کتنی رقم خرچ ہوئی۔ لیکن معین صاحب
کی شخصیت کا دوسرا رُخ یہ بھی ہے کہ وہ بے حد شاہ خرچ ہیں۔
شاہ خرچی کا یہ عالم ہے کہ شاید ہی کوئی شخص ایسا ہوگا جو ان کے
آستانے سے خالی ہاتھ لوٹا ہو۔ ہر وقت وہ اپنی جیب سے سو سو
کے نوٹ اس طرح نکالتے ہیں کہ وہ روپے نہ ہو بلکہ کاغذ کا ٹکڑا ہو۔
شاہ خرچی کے معاملے میں یوں محسوس ہوتا ہے جیسے غیب سے
ان کے جیب میں روپے آجاتے ہیں اور وہ بلا جھجک خرچ کرتے
چلے جاتے ہیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ آج بھی وہ بلا کسی معاوضے کے ادارۂ ادبیاتِ
اُردو کی خدمت نہایت تن دہی اور لگن سے کر رہے ہیں۔ روزآنہ خرچ کے علاوہ ہر ماہ
ادارۂ ادبیاتِ اُردو کو خود اپنی جیب سے ایک معقول رقم ادا کرتے ہیں۔
چنانچہ قدیر زماں لکھتے ہیں:

"جو شخص زمین و زر سے اس قدر
بے نیاز ہو وہ بہ حیثیت معتمد
ادارۂ ادبیاتِ اُردو کچھ زیادہ
بہتر خدمات انجام دے سکتا ہے۔
یہی سبب ہے کہ معین صاحب ادارے
دفتر میں بیٹھے بیٹھے اندرون و بیرون
ملک ہزاروں روپے کا چندہ اکٹھا

کرنے میں کامیاب ہو سکے۔ ہم لوگ
جب کسی اہم کام کے لیے بھی کسی سے
چندہ طلب کرتے ہیں تو شبہ کی نظر سے
دیکھے جاتے ہیں۔ معنی صاحب نے
ادارۂ ادبیاتِ اردو کے لیے حکومتی
اور غیر حکومتی اداروں سے مستقل
گرانٹس کا جو انتظام کیا ہے یہ
ان ہی کے بس کا کام تھا"[1]

ہر دلعزیز رحمت یوسف زئی بتاتے ہیں کہ جب معنی تبسم لکڑی کے پُل والے مکان میں رہتے تھے تو دیوان خانے میں ہر صبح چائے کا ایک پورا سماور بھر کر رکھ دیا جاتا تھا جو بھی آتا اسے فوراً چائے پیش کی جاتی۔ راقمۃ الحروف کا بھی مشاہدہ ہے کہ ادارۂ ادبیاتِ اردو میں جو بھی مہمان آئے اس کی تواضع کے اخراجات معنی تبسم اپنی جیب سے برداشت کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں خود اپنے لیے چائے منگوانے کے ساتھ ساتھ وہ سارے اسٹاف کے لیے بھی چائے منگوانا ضروری سمجھتے ہیں۔ چنانچہ ادارۂ ادبیاتِ اردو کے ملازمین معنی صاحب کی دریا دلی کے معترف ہیں۔ کوئی اہم ادبی شخصیت حیدرآباد وارد ہوتی ہے تو معنی صاحب کے ساتھ کچھ وقت گزارنے میں فخر محسوس کرتی ہے اور معنی تبسم اپنے مہمان کی خاطر و مدارات میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے۔ اپنے گھر میں دو کمروں میں بستر ڈال رکھے ہیں اور ساتھ ہی لائبریری کے حصے میں بھی بستر پڑا ہے یہ اس لیے ہے کہ اگر کوئی مہمان آجائے اور قیام کرنا چاہے تو اسے کوئی تکلیف نہ ہو۔

---

[1] ۔ قدیر زماں مضمون معنی تبسم۔ مشمولہ تدریعنی تبسم ص ۳۱۷

علمی معاملات میں انھوں نے کبھی کل سے کام نہیں لیا بلکہ بے دریغ خرچ کیا۔ معنی کے معنی ہیں "بے شمار کر دینے والا" کے ہیں شاید نام ہی کا اثر ہوگا کہ ہر کوئی ان سے مستفید ہوتا رہتا ہے۔ گیان چند جیں نے معنی تبسم کو حیدرآباد یونیورسٹی میں پڑھانے کے لیے دعوت دی اور کہا کہ آپ کو اس کا معاوضہ بھی ملے گا تو معنی تبسم نے جواب دیا۔

"مالی پہلو بالکل غیر اہم ہے۔ آپ
نے فرمائش کی ہے۔ اگر بغیر معاوضے
کے بھی یہ خدمت سرانجام دینی پڑے
تو بھی میں ضرور آؤں گا"[1]

چائے معنی صاحب کی کمزوری ہے وہ بے تحاشہ چائے پیتے ہیں چنانچہ عوض سعید لکھتے ہیں :

"معنی نوشی حیدرآباد کی ذات پر ختم ہوتی ہو
یا نہ ہو مگر چائے نوشی کے سارے
راستے معنی کی ذات پر آکر ختم ہو جاتے ہیں۔
وہ اس کثرت سے چائے پیتے ہیں کہ کبھی
کبھی گمان گزرتا ہے کہ کھانا برابر نہ کھاتے
ہوں"[2]

عثمانیہ یونیورسٹی کی ملازمت کے دوران اُن کی چائے نوشی ضرب المثل کی طرح مشہور تھی۔ وہ چائے کے معاملے میں بھی تنوع کے قائل رہے۔ چنانچہ معنی تبسم کے ایک شاگرد اور بعد میں ساتھی استاد

---

[1] ۔ پروفیسر گیان چند جین۔ مضمون "علم کاعنی، معنی تبسم" مشمولہ تذکرہ معنی تبسم ص۔ ۲۸۲

[2] ۔ عوض سعید۔ مضمون "معنی تبسم" مشمولہ تذکرہ معنی تبسم ص۔ ۲۷۸

پروفیسر بیگ احساس لکھتے ہیں :

"معنی صاحب چائے کے عادی ہیں ۔
جب تک شعبہ میں رہتے ہیں چپراسی
کو احکام دیتے گئے کہ تھرماس
خالی ہوتے ہی اسے بھر دیا جائے ۔
چائے میں بھی تنوع کے قائل ہیں ۔
کبھی کیٹلی کی چائے آتی ، کبھی
اسٹنڈر اپنے گھر سے بنوا کر لاتا ۔ کبھی
ڈکاشن تھرماس میں لے آتے اور
اس میں لیمو کا رس ملا کر پیش
کرتے ۔ کبھی صرف گرم پانی لے آتے
اس میں ٹی بیاگ ڈبو کر چائے
پیتے اور پلاتے ۔ لوگوں کی بوکھلاہٹ
اور حیرت سے لطف اندوز ہوتے اور
ہلکے سے مسکرا دیتے جیسے ان کا مقصد
حل ہو گیا ہو" [1]

معنی تبسم میں کام کرنے کی لگن اور جستجو بدرجۂ اتم موجود ہے ۔ جس پامردی ، ہمت ، محنت ، خلوص و محبت ، رواداری ، استقلال ، عزم ، حوصلہ اور مستقل مزاجی سے سیاسی ، سماجی ، علمی اور ادبی میدانوں میں جو مراحل طے کیے ہیں اس کی مثال مشکل سے ملے گی ۔

معنی صاحب اگرچہ بظاہر سنجیدہ سے نظر آتے ہیں

---

[1] ۔ پروفیسر بیگ احساس "معنی تبسم ۔ ایک مرد اور مختلف شخصیت" مشمولہ "معنی تبسم" ص ۔ ۳۰۷

لیکن کبھی کبھی لگتا ہے کہ ان کے اندر ایک شریر بچہ بیٹھا ہوا ہے۔ حس مزاح کا می تیز ہے لیکن ظاہر نہیں ہوتی۔ لطیف جملوں اور کتابوں میں ایسی بات کہہ جاتے ہیں جس میں متعدد کا ایک طوفان چھپا ہوا ہوتا ہے۔ خود ہنتے ہیں لیکن آنکھوں کی چمک بتاتی ہے کہ انھوں نے کئی متعدد پی لیے ہیں۔ ڈاکٹر ٹنگ احساس جسمیں معنی صاحب کے ساتھ بہ حیثیت لکچرار کام کرنے کا اعزاز حاصل ہوا لکھتے ہیں:

"کالج میں ہم سب اکھٹے لنچ کرتے۔ لنچ کے بعد چائے کے دوران ادھر اُدھر کی گفتگو ہوتی۔ لنچ کے دوران وہ ہروفیسر صاحبان نے معنی صاحب کو بڑے فخر سے یہ بات بتائی کہ وہ دونوں صبح Walking کرنے لگے ہیں۔

معنی صاحب نے پوچھا اس سے کیا ہوتا ہے؟

"عمر بڑھتی ہے" دونوں نے ایک زبان کہا۔

کہنے لگے "اتنی ہی عمر بڑھتی ہے جتنا چل قدمی میں وقت صالع ہوتا ہے"۔

دونوں مایوس ہو گئے، پھر پوچھا۔

"اچھا تو پھر طویل عمر پانے کے لیے کیا کرنا چاہیئے؟

معنی صاحب نے کہا "امنوں استعمال کیجیے"[1]

---

[1] ۔ پروفیسر ٹنگ احساس ۔ معمون "معنی تبسم۔ ایک منفرد اور مختلف شخصیت" مشمولہ ندرمعنی تبسم ص ۔ ۳۰۹

معنی تبسم بے حد رحم دل انسان ہیں۔ ہم دردی، ملن ساری اور فرض شناسی میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ غیر معمولی مصروفیات کے باوجود بھی وہ نہایت ہی خندہ پیشانی سے لوگوں کی مدد کرتے ہیں وہ کسی کی تکلیف کو برداشت نہیں کر پاتے اور فوراً ہی اس کی مدد کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ عوض سعید لکھتے ہیں :

"میں نے معنی جیسے یار باش آدمی ذرا کم ہی دیکھے ہیں۔ دوستوں کے آڑے وقت کام آنے کو وہ ایک عبادت سمجھتے ہیں اور اس عبادت میں دلل اسی وقت پڑتا ہے جب ان کی جیب خالی ہو۔ وہ بے شاہ فرچ کے معاملے میں وہ اتنے آگے نکل چکے ہیں کہ کبھی کبھی احساس ہوتا ہے جیسے وہ دست غیب کا علم بھی جانتے ہوں"[1]

اور ان کا اس دست غیب کا فیض ہے کہ ان کی جیب کبھی خالی نہیں رہی۔ ان کے شاگردوں، دوستوں، ملازموں اور شناساؤں میں سے بیشتر ایسے ہیں جو معنی تبسم سے کسی نہ کسی طرح کی مدد ضرور لیتے رہے ہیں۔ کسی کو روپیہ پیسے کی ضرورت ہوئی تو معنی صاحب نے بلا جھجھک خدمت کر دی اور پھر کبھی زبان پر بھی یہ بات نہیں آئی۔ یہ اور بات ہے کہ مالی امداد حاصل کرنے والے نے خود ہی کسی کمزور لمحے میں معنی صاحب کے اس وصف کی مدح سرائی کرتے ہوئے ان کی عنایتوں کا ذکر کر دیا۔ لیکن معنی صاحب نے خود سے کبھی بھی اپنی دریا دلی کی داستانیں نہیں سنائی۔ اور اگر کسی نے پوچھا بھی تو بس ایک تبسم زیر لب سے کام چلا لیا۔

---

[1] عوض سعید۔ معنون "معنی تبسم" مشمولہ ندرہ معنی تبسم۔ ص۔ ۲۷۹

مصلحت پسندی ان سے کوسوں دور رہی۔ اور جہاں تک شہرت کا معاملہ ہے وہ ان کے پیچھے بھاگتی رہی۔ معنی تبسم کی شہرت کے پیچھے نہیں رہے۔ مجتبیٰ حسین لکھتے ہیں :

"مصلحت پسندی، جوڑ توڑ، ادبی رینہ دوانیوں کینہ پروری اور شہرت طلبی وغیرہ سے ہمیشہ اپنے آپ کو دور رکھا۔ حالاں کہ آج کے زمانے میں پنپنے کی یہی تو باتیں ہیں اپنے علمی کارناموں اور ادبی فتوحات کے باوصف ان کی بے نیازی کا یہ عالم ہے کہ میں نے انھیں کبھی شہرت کے پیچھے بھاگتے نہیں دیکھا"[1]

اور اس طرح یہ بات غلط ثابت ہو جاتی ہے کہ آج کے زمانے میں پنپنے کے لیے جوڑ توڑ، رینہ دوانیاں، شہرت طلبی وغیرہ ضروری ہیں۔ معنی صاحب نے اس بات کو اپنے عمل سے غلط ثابت کر دیا اور بتا دیا کہ نیک نفسی سادگی علم اور خلاقیت کا جوہر موجود ہو تو شہرت خود قدم چومتی ہے۔ چنانچہ ہندوستان پر ہی کیا منحصر ہے۔ دنیا بھر میں ان کی شہرت ہے۔ ان کی تخلیقات، ان کے کارنامے، ان کی تنقیدی بصیرت، جدیدیت اور مابعد جدیدیت پر ان کی نظر، شعر و حکمت سب رس، ادارۂ ادبیات اردو اور نہ جانے کیا کیا، اردو کے شیدائیوں سے پوشیدہ نہیں۔ مگر معنی صاحب کی بے نیازی جوں کی توں ہے۔ بلکہ ایک بار تو انھوں نے اردو اکیڈمی کے ایک انعام کو ٹھکرا دیا کیوں کہ بات عزت نفس کی تھی۔

---

[1] ۔ مجتبیٰ حسین۔ مضمون۔ ایک تبسم جو معنی ہو گئے ملتا ہے۔ مشمولہ نذر معنی تبسم ص: ۲۶۹

معنی صاحب کا قلندرانہ مزاج انھیں ہمیشہ سہارا دیتا رہا ہے۔ اور اسی وجہ سے بڑے سے بڑے طوفان سے بھی ان کے پیر ڈگمگا نہ سکے۔ انہوں نے حالات کا مقابلہ بھی کیا اور مشیت ایزدی کے آگے سر بھی جھکایا۔ عوض سعید لکھتے ہیں۔

"معنی مزاجاً قلندر ہی ہیں اور قدرے دنیا
دار بھی کبھی وہ اپنے وجود کو سمندر میں پھینکے
ہوئے اس لکڑی کے ٹکڑے کی طرح سمجھتے ہیں
جسے لہراتی ہوئی موجیں ادھر ادھر بے سمت
بھٹکاتی رہتی ہیں۔ اس موڑ پر پہنچ کر وہ
زندگی کی بے معنویت کے قائل ہو جاتے ہیں۔
اور زندگی کے اس عذاب سے نجات پانے
کے لیے اپنے آپ کو Draft کرتے
رہتے ہیں۔ اور اس Drafting ہی
کو انسان کا اصلی مقدر سمجھتے ہیں۔ لیکن
دیر ہی سے سہی اس خول سے نکل بھی
آتے ہیں"[1]

اور جب ہم معنی تبسم کی زندگی پر نظر ڈالتے ہیں اور ان تمام مشیب و فراز پر غور کرتے ہیں جو ان کے سفر کا ایک حصہ ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ عوض سعید کی یہ بات آج بھی پوری طرح سچ ہے۔ پون صدی کے طویل سفر کے دوران معنی صاحب کو کتنے ہی مسائل سے دوچار ہونا پڑا ہوگا لیکن وہ ہر مرحلے سے کامیاب نکل آئے۔ شاید ان کے قلندرانہ مزاج ہی کا فیض ہے کہ وہ صدمے برداشت کرتے رہے اور مسکراتے رہے۔

---

[1] عوض سعید۔ مضمون "معنی تبسم" مشمولہ نذر معنی تبسم ص۔ ۲۷۶

معنی تبسم ایک ذہین انسان ہیں اور ان کے مزاح میں بھی ذہانت کا عنصر موجود ہوتا ہے - یہ اور بات ہے کہ اکثر لوگ ان کو سنجیدہ اور میت گردانتے ہیں۔ بظاہر ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ہیں ہوتی لیکن اندر ہی اندر ہنس رہے ہوتے ہیں - عوض سعید نے معنی صاحب کے بارے میں لکھا تھا۔

"معنی تبسم ان کے ہونٹوں پر تبسم کی کلیاں
دراکم ہی چٹکتی ہیں میرے ان دو ڈھائی
دوستوں میں سے ہیں جن سے مل کر ہمیشہ
خوشی ہوتا ہے، خواہ وہ کسی موڈ یا رنگ میں کیوں
نہ ہوں۔ ہاں معنی ان ہی لوگوں کے لیے بوجھ بن
سکتے ہیں جن کی قوت شامہ ذہانت کی خوش بو
سے آشنا ہو" [1]

اور یہ بات بالکل درست ہے ان کے مزاح سے لطف اندوز ہونا ہر کس کے بس میں نہیں ان کے مزاح کو محسوس کرنے کے لیے ذہانت بے حد ضروری ہوتی ہے۔ لیکن معنی تبسم کے بارے میں گیان چند جین کا یہ ریمارک دیکھیے۔

"معنی صاحب کے نام کے ساتھ یہ تخلص دیکھ کر
لگتا ہے کہ وہ ماع و بہار قسم کے شوخ بار
لطیفہ سنج رہے ہوں گے لیکن وہ لگے اس کے
بالکل برعکس۔ ایسے سنجیدہ شخص کو اپنا تخلص
میت رکھنا چاہیے تھا" [2]

اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ معنی تبسم کو جین صاحب نے ہمیشہ سنجیدگی کے عالم میں دیکھا۔ دراصل معنی تبسم لوگوں پر بہت کم کھلتے ہیں اور اسی لیے جین صاحب کو وہ اپنے تخلص کے برعکس لگے تھے۔

---

[1] ۔ عوض سعید۔ مضمون "معنی تبسم"۔ مشمولہ نذر معنی تبسم۔ ص ۲۷۴

[2] ۔ گیان چند جین۔ مضمون "علم کا معنی، معنی تبسم" مشمولہ نذر معنی تبسم ص۔ ۲۸۱

معنی تبسم اپنے کام اپنے بیٹے اور اپنے فرض کو پوری تندہی سے نبھاتے ہیں۔ مجتبیٰ حسین کا خیال ہے کہ اردو کے استاد دراصل حرام خور ہوتے ہیں نہ جانے انھیں یہ گمراہ کن اساتذہ سے ملی۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔

"اردو کے استاد ہونے کے باوجود اردو کے
استاد نا لائق ہی لگتے کیونکہ انھوں نے حرام
خوری کو اپنے اوپر حرام کر رکھا ہے۔ ایمان داری،
لگن اور محنت شاقہ کو اپنا دین و ایمان
گردانتے ہیں"[1]

یہ بات تو درست ہے کہ معنی تبسم اردو کے استاد ہونے کے باوجود اردو کے استاد نہیں لگتے لیکن اس کی وجہ دوسری ہے۔ یہ بات نہیں ہے کہ انھوں نے حرام خوری کو حلال کر لیا بلکہ اس لیے کہ معنی تبسم اپنے مزاج، چال ڈھال، لباس اور اپنے آپ کو عصر سے ہم آہنگ کرنے والے رویے کی وجہ سے اردو کے استاد سے مختلف ہیں۔ وقت کی پابندی ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ کسی محفل میں مدعو کیے جائیں تو وہ ٹھیک وقت پر پہنچ جاتے ہیں۔ اکثر تو یہ بھی ہوا ہے کہ انھیں کسی محفل عقد میں شرکت کرنی پڑی تو وہ وقت پر پہنچ گئے، مگر معلوم ہوا کہ نہ تو دولھا کا پتہ ہے اور نہ ہی مہمانوں کا۔ کافی دیر انتظار کرنے کے بعد وہ واپس چلے آئے۔

اصل میں معنی تبسم بے حد اصول پرست ہیں۔ انھیں یہ بات پسند نہیں کہ ان کی وجہ سے کسی کو تکلیف پہنچے۔ عثمانیہ یونیورسٹی میں ملازمت کے دوران انھیں کبھی دیر سے پہنچنا ہوتا تو پہلے ہی سے وہ بتا دیا کرتے تھے کہ دوسروں کو کسی طرح کی بے سکونی نہ ہو۔ بیگ احساس لکھتے ہیں۔

"معنی صاحب اصول کے پابند ہیں۔ کہیں

---

[1] ۔ مجتبیٰ حسین۔ "یہ ایک تبسم جو معنی بھی ہو" کے ملتا ہے" مشمولہ نذر معنی تبسم ص۔ ۲۶۸

کسی میٹنگ میں شرکت کرنی ہو۔
ریڈیو یا ٹی وی ریکارڈنگ ہو، کسی
وجہ سے کالج آنے میں تاخیر کا اندیشہ ہو،
وہ قبل از وقت صدر شعبہ کو مطلع
کر دیتے۔ کالج سے لوٹتے ہوئے بھی
صدر شعبہ کو بتا کر جاتے۔ معنی صاحب
نہ کسی صدر شعبہ کے لیے مسئلہ بنے اور
نہ خود بہ حیثیت صدر شعبہ کسی کے لیے
مسئلہ کھڑا کیا۔[1]

اور یہ بات صرف شعبہ تک نہیں ہے یہ معنی صاحب کا مزاج ہے۔ چنانچہ ادارہ ادبیات اردو میں ان کا یہی رویہ ہے۔ وہ عموماً گیارہ بجے تک ادارہ پہنچ جاتے ہیں لیکن اگر کسی وجہ سے جانا ممکن نہ ہو تو پہلے ہی بتا دیتے ہیں۔ یا پھر کم از کم ٹیلی فون سے اطلاع دے دیتے ہیں۔ اور اسی لیے یہ بات انھیں اذیت میں مبتلا کر دیتی ہے کہ کوئی آنے کا وعدہ کرے اور وقت پر نہ پہنچ پائے۔ استثنا کے طور پر ان کے لیے سوہان روح ہوتے ہیں۔ لیکن بعد میں اگر تاخیر کے باوجود آنے والا معذرت کرے تو مسکرا کر اسے دعا بھی کر دیتے ہیں۔ کبھی کبھی دے لفظوں میں سرزنش بھی کرتے ہیں لیکن ان دے لفظوں میں اور سرد لہجے میں جو کاٹ ہوتی ہے اسے صرف محسوس کیا جا سکتا ہے، بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اور بعد میں بھی یہی ہے کہ وہ اس بات کو بھول جائیں۔ دوسری مرتبہ اگر وہی شخص وعدہ کرے تو اسے یاد دلا دیتے ہیں کہ پچھلی بار وہ تاخیر سے آیا تھا۔ تاکید دوبارہ وہ ایسی غلطی نہ کرے اور وقت پر پہنچ جائے۔

---

[1] ۔ پروفیسر بیگ احساس۔ "مغنی تبسم۔ ایک منفرد اور مختلف شخصیت۔ مشمولہ بہ رمعنی تبسم۔ ص ۳۰۷

معنی تبسم نہایت ہی سلیس کرتے ہیں۔ کوئی بھی اہلی شخص جب ان سے پہلی بار ملتا ہے تو آپ کی شریف النفسی، آپ کی عظمت اور آپ کے بلند کردار کا قائل ہی ہیں بلکہ ایسے آپ میں ان کے لیے کشش محسوس کرنے لگتا ہے۔ ایسی عظمتوں والے انسان آج کی مادہ پرست دنیا میں نہ صرف کم یاب ہیں بلکہ سونے کے برابر ہیں۔ بیگ احساس لکھتے ہیں۔

"معنی صاحب کی شخصیت میں ایک کشش ہے، ایک جادو ہے، ایک مقناطیسیت ہے کہ لوگ کھنچے چلے آتے ہیں۔ ان کی زنبیل میں ہر قسم کا آدمی ہے۔ ایک طرف ادب سے دلچسپی رکھنے والے ذہین شاعر و ادیب ہیں، دوسری طرف نسبتاً کم تر درجے کی ادبی صلاحیتیں رکھنے والے لیکن تنظیمی امور میں ماہر و معاملہ افراد ہیں۔ معنی صاحب دونوں زمروں کے افراد سے مناسب کام لیتے ہیں اور اس طرح لیتے ہیں کہ ہر شخص خود کو اہم سمجھتا ہے"[1]

یہ دراصل معنی تبسم کی منتظمانہ صلاحیتوں کا نتیجہ ہے۔ وہ کام لینا خوب جانتے ہیں۔ اور ہر شخص کے مزاج، اس کی صلاحیت اور قابلیت کے مطابق ہی کام تفویض کرتے ہیں۔ جوہر شناسی کا مادہ بھی ان میں بدرجۂ اتم موجود ہے اسامہ فاروقی کو معنی تبسم ہی نے دریافت کیا۔ جس کا ذکر خود اسامہ فاروقی نے اپنی ایک تحریر میں کیا ہے۔ اپنے دوسرے ملنے والوں کے بارے میں بھی وہ پورا ادراک رکھتے ہیں کہ کون کہاں فٹ بیٹھتا ہے۔ لکھنے پڑھنے کے کام کے لیے کون موزوں ہے اور بازار سے کوئی چیز خرید لانے کے لیے کون بہتر ہو سکتا ہے۔ جاہے وہ کسی رتبے کا ہو، اگر وہ مرا احباب میں حیثیت رکھتا ہے تو پھر اسی اعتبار سے اس کے ساتھ معاملہ ہوگا۔ اور اگر وہ مرا احباب عالم ہے تو پھر اس کے علمی مرتبے کا پورا خیال رکھا جائے گا۔ شاعر ہے تو

---

[1] ۔ پروفیسر بیگ احساس۔ "معنی تبسم ایک منفرد اور مختلف شخصیت" مشمولہ ڈاکٹر معنی تبسم ص ۳۱۱

شاعری بربات ہوگی۔ افسانہ نگار کے ساتھ افسانے کے بارے میں تبادلہ خیال ہوگا۔ یہ بھی ہوسکتا کہ شاعر اور وہ گھر کی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے کوئی سامان لانے کے لیے کہیں۔ اسی طرح عام سطح کے ملاقاتی کے ساتھ وہ کبھی علمی معاملات پر بات نہیں کریں گے۔ ہاں اگر اس نے کسی طرح کا مشورہ لیا چاہا تو پوری طرح اس کی مدد کریں گے۔ معنی صاحب نے ہمیشہ دوسروں کی مدد کی۔ اور یہ کبھی نہیں سوچا کہ جس کے لیے وہ اپنا وقت تعاون دراز کر رہے ہیں وہ ان کے ساتھ کتنا مخلص ہے۔ ان کا حال ایک سایہ دار پیڑ کا سا ہے جس کے نیچے کوئی بھی اپنا بیر بھیل سکتا ہے اور پیڑ اس بات کی پروا نہیں کرتا کہ اس کے سائے میں بیٹھنے والا کس قماش کا ہے۔ وہ یہ بھی نہیں سوچتا کہ یہ شخص اس پر اس کلہاڑی سے وار بھی کر سکتا ہے۔ عوض سعید لکھتے ہیں:

"میں نے معنی کو ہمیشہ اپنے یاروں سے
کہیں زیادہ اپنے مخالفین کی مدد کرتے
دیکھا ہے ان کی اس حکمت عملی سے کبھی کبھی
انھیں مالی نقصان بھی اٹھانا
پڑا ہے"[1]

لیکن معنی قسم نے اپنے مالی نقصان کی بھی پروا نہیں کی۔ اکثر یہ ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ نقصان اٹھانے کے بعد لوگ سنبھل جاتے ہیں اور دوبارہ غلطی نہیں کرتے لیکن معنی قسم کا معاملہ مختلف ہے وہ چوٹ کھاتے جاتے ہیں اور سب بھول بھال کر پھر سے دوسروں کی مدد کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ کون کس مزاج کا ہے۔ اس کے باوجود نقصان برداشت کرتے ہیں اور مسکراتے ہیں۔

---

[1] عوض سعید "معنی قسم" مشمولہ نذر معنی قسم۔ ص ۲۷۷

معنی صاحب نے کبھی گروہ بندی کی سیاست سے کام نہیں لیا۔ وہ ہر گروپ میں رہے اور ہر گروپ کے ساتھ ان کی ہمدردیاں رہیں۔ لیکن یہ نہیں ہوا کہ انھوں نے اپنے ملنے والوں کا اپنے مقاصد کے حصول کے لیے استحصال کیا ہو۔ خوشامد پسندی، درباری قسم کی چیزوں سے انھیں کبھی بھی دلچسپی نہیں رہی۔ اور نہ ہی انھوں نے بتشرے درجے کے لوگوں کے لیے محض ان کے رتبے کی بنا پر احترام کا رویہ رکھا۔ وہ کبھی اپنی سطح سے نیچے نہیں اترے۔ لطف الرحمٰن رقم طراز ہیں:

"بے حد قابلِ رشک بات ہے کہ اس
دورِ کشمکش و کشاکش اور عہدِ کم ظرفاں و
حاسداں میں پروفیسر معنی تبسم اپنی سادگی، شرافت
نفس، وضع داری، نرم مزاجی اور اپنی والہانہ
بے ریائی کی بنا پر ہمہ گیر مقبولیت و شہرت کے
مالک ہیں۔ جب کہ اس منزل تک پہنچنے کے لیے
لوگوں نے سیاسی بازی گری، سازش، گروپ بندی،
درباری تملق، خوشامد پسندی کے علاوہ "نہ
سگاں ادب نمودن نہ حراں سلام کردن" کو بھی
اپنے لیے مایۂ فخر سمجھا ہے۔ معنی تبسم ان معدودے
چند لوگوں میں ہیں جو اس سطحیت اور کاسہ لیسی
کی وطرت سے بے نیاز ہیں اور میں خصوصاً اسی بنا
پر معنی تبسم کا قائل بھی ہوں اور متمنی بھی"[1]

سیاسی بازی گری، سازشیں اور درباری سے دور ہونے کے باوجود اگر معنی تبسم مقبول عام ہیں تو اس کی وجہ ان کی شرافت نفس اور وضع داری ہے۔

---

[1] پروفیسر لطف الرحمٰن۔ مضمون "معنی تبسم" مشمولہ نذر معنی تبسم۔ ص ۲۹۵

مہمان نوازی معنی تبسم کی سرشت میں داخل ہے۔ وضع داری ان کے مزاج کا حصہ ہے۔ حیدرآباد آنے والا کوئی بھی شاعر ادیب یا من کا رہو معنی تبسم سے ملے آتا ہے تو پھر وہ ان کا ذاتی مہمان ہو جاتا ہے۔ بیگ احساس لکھتے ہیں۔

"باہر سے کوئی شاعر و ادیب، محقق و نقاد آئے وہ معنی تبسم صاحب سے واقف ہوتا ہے۔ معنی صاحب اس کے اعزاز میں جلسہ کرتے ہیں۔ اس کے قیام و طعام کا انتظام کرتے ہیں اور آخر میں اسے جھومڑے ایر پورٹ تک جاتے ہیں۔ ساقی فاروقی جمیل جالبی سے لے کر لطف الرحمٰن تک سب معنی صاحب کے حوالے سے حیدرآباد کی ادبی فضا سے متعارف ہوتے ہیں"[1]

اور جب مہمان حیدرآباد سے واپس ہوتا ہے تو اپنے ساتھ حیدرآباد کی یادوں کے ساتھ معنی تبسم سے ملاقاتوں کا کیف بھی لے جاتا ہے اور پھر ایک عرصے تک اسی کیف سے سرشار رہتا ہے۔ معنی صاحب کی شخصیت اس کے ذہن پر چھا جاتی ہے اور وہ کسی نہ کسی طرح دوبارہ ملاقات کے لیے بے چین ہو اٹھتا ہے۔

غوص سعید بھی لکھتے ہیں:

"باہر سے آنے والے ساتھیوں کا خیر مقدم کرنا اور انہیں ایر پورٹ یا اسٹیشن

---

[1] ۔ پروفیسر بیگ احساس۔ "معنی تبسم ایک منفرد اور مختلف شخصیت" مشمولہ نذر معنی تبسم ص ۔ ۲۱۲

تک پہنچا کر خدا حافظ کہا معنی کے
معمولات میں سے ایک ہے"[1]

اور اس معاملے میں معنی صاحب کی وضع داری ہمیشہ برقرار رہی' البتہ اب پچھلے ایک دو سال سے صحت کی کمزوری کی وجہ سے ان کا یہ معمول ترک ہو گیا ہے۔ کیونکہ اب وہ جسمانی اعتبار سے اس قدر strain برداشت نہیں کر سکتے لیکن اکثر و بیشتر موقع ملنے پر وہ اپنے کسی دوست یا چاہنے والے سے خواہش کرتے ہیں کہ مہمان کو رخصت کیا جائے یا اسے اسٹیشن یا ایرپورٹ تک پہنچایا جائے۔

ان سے ملنے والا ان کی تواضع اور خاطر مدارت کو کبھی بھول نہیں سکتا۔ وہ اپنے دوستوں اور ملاقاتیوں کی عادت سے واقف ہیں اور اس بات کا خیال رکھتے ہیں کہ اسے وہی ملے جس کا وہ خواہش مند ہے۔ گھر میں کھانے پینے کی چیزیں سے افراط رکھتے ہیں۔ اور ملنے والوں کی خدمت میں پیش کر کے اسے محسوس کرتے ہیں۔ خود کہیں سفر پر جائیں تو واپس ہوتے ہوئے انھیں یہ بھی یاد رہتا ہے کہ کس دوست نے کیا فرمائش کی تھی۔ اور اگر فرمائش نہیں کی ہے تب بھی انھیں یاد رہتا ہے کہ اس نے کبھی کس خواہش کا اظہار کیا تھا۔ اور پھر ممکنہ حد تک اس طرح خواہش کو پورا کرتے ہیں۔ حالانکہ خواہش کرنے والا خود اس بات کو بھول چکا ہوتا ہے۔ اور جب وہ سراپا حیرت بن کر جذبہ تشکر و امتنان سے سرشار ہونے لگتا ہے تو معنی تبسم کی مسکراہٹ لائق دید ہوتی ہے۔ اور پھر جلد ہی وہ بات کا رخ بدل دیتے ہیں۔ انھیں کون تحفہ ملے اور ان کے خیال میں وہ تحفہ ان کے مزاج سے ہم آہنگ نہیں ہے تو وہ کسی ایسے شخص کو یاد کرتے ہیں جسے اس کی ضرورت ہے اور پہلی فرصت میں اس کے حوالے کر دیتے ہیں

---

[1] عوض سعید۔ "معنی تبسم" مشمولہ نذر معنی تبسم ص۔ ۲۷۱

معنی تبسم سے پہلی ملاقات کرنے والا بھی یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ جس شخص سے وہ مل رہا ہے وہ پاک طینت، پرخلوص اور محبتوں کا پیکر ہے۔ عزور، تکبر وغیرہ جیسے عیوب ان کے ہاں بالکل نہیں۔ اسی لیے ان سے ملنے والا پہلی ملاقات میں ہی ان کا اسیر ہو جاتا ہے۔ خالد قادری جب حیدرآباد آئے تو انھیں پہلی بار معنی تبسم سے ملنے کا موقع ملا۔ اپنی پہلی ملاقات کے بارے میں خالد قادری لکھتے ہیں:

"مجھے یہ دیکھ کر مسرت اور طمانیت ہوئی تھی
کہ جس آدمی سے مجھے ملنا ہے وہ نہ صرف خوش شکل
بلکہ خوش وضع اور خوش مزاج بھی معلوم ہوتا ہے" [1]

پہلی ملاقات کے دوران معنی تبسم کے پہلے تلے الفاظ اور نرم و ملائم لہجے کا سرور آج تک خالد قادری محسوس کرتے ہیں اور بیس: پچیس برس گزر جانے کے باوجود خالد قادری کی رائے معنی صاحب کے بارے میں وہی ہے جو پہلی ملاقات میں تھی یعنی معنی تبسم خوش مزاج بھی ہیں اور پرخلوص بھی۔ اس کے بعد معنی تبسم کی شخصیت کے مختلف پہلو خالد قادری کے سامنے آتے رہے اور انھیں اپنا اسیر بناتے رہے۔ خالد قادری کا تحریر کردہ خاکہ معنی تبسم کی شخصیت کے بعض ایسے گوشوں کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے جن کے بارے میں وہی لکھ سکتا ہے جس نے معنی صاحب کو بہت قریب سے دیکھا ہو۔

لوگوں کو اپنا گرویدہ بنانا کوئی آسان بات نہیں ہے۔ معنی صاحب میں یہ ہنر ودیعت ہوا ہے وہ محبت لٹانے کے فن سے واقف ہیں۔ پیار بھرے لطف الرحمن نے بھی کچھ ایسے ہی جذبات کا اظہار کیا ہے کہ معنی تبسم سے ملاقات کے بعد ایک طمانیت کا سا احساس اور دوبارہ ملنے کا اشتیاق جاگ اٹھتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

---

[1] ۔ سید خالد قادری۔ "معنی تبسم یادیں، باتیں اور تاثرات" مشمولہ "در معنی تبسم" ص ۔ ۲۲۲

"محشر ملاقاتوں میں بھی ان کی محویت
آسودگی، تمکنت، خوش حالی، دوش
مراہی اور لغزش و لغارت کے
ابدی لمحات سے عبارت رہی کہ
ان سے مل کر ہمیشہ بے پایاں طمانیت
کا احساس ہوا اور دیدار ملے
کا اشتیاق قائم رہا"[1]

اور یہ اشتیاق صرف لطف الرحمٰن ہی کا نہیں بلکہ معنی قسم کے ملنے والے ہر اس شخص کا ہے جس نے ان کی صحبت میں چند لمحے گزارے ہوں۔

معنی صاحب نے زندگی کو ہمیشہ ایک کھیل سمجھا اور اس میں ہمیشہ منہمک رہے۔ عوض سعید لکھتے ہیں:

"معنی کا مزاج جواریوں جیسا ہے۔ وہ
زندگی ہی کو ایک جوا سمجھتے ہیں اس
لیے ان کے ہاں ہار جیت کا کوئی
علیحدہ خانہ نہیں ہے۔ ایک ہی خانہ
ہے جس میں ان کے نشست و برخاست
کا حساب بڑھتا رہتا ہے"[2]

لیکن معنی صاحب ایسے جواری ہیں جس کا پانسہ ہمیشہ جیت کی نشاندہی کرتا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ معنی صاحب نے ہار میں اپنی جیت کا پہلو نکال لیا اور اس طرح دنیا والوں کا سامان مہیا کر لیا۔

---

[1] ۔ پروفیسر لطف الرحمٰن مرحوم "معنی قسم" مشمولہ نذر معنی قسم ص ۲۹۷

[2] ۔ عوض سعید مرحوم "معنی قسم" مشمولہ نذر معنی قسم ص ۲۷۸

معنی تبسم اپنی ذات میں ایک انجمن ہیں۔ وہ شاعر بھی ہیں ادیب بھی، نقاد بھی ہیں محقق بھی مدیر بھی ہیں اور ایک اچھے منتظم بھی۔ شاید اسی لیے گیان چند جین نے لکھا تھا:

"ان کی ادبی شخصیت کثیر جہاتی ہے۔
استاد، نقاد، محقق، شاعر، ادارہ ساز،
اپنی ذات میں خود ایک ادارہ تھے
لے کئی ادب دوست پیدا کیے"[1]

اور ان کی شخصیت کا یہ پہلو نیا نہیں لیکن شاید اس وقت سے ہے جب انھوں نے عملی زندگی میں قدم رکھا۔ ان کی یہ متنوع شخصیت ان کا سب سے بڑا وصف ہے۔ ایسی کثیر جہاتی شخصیتیں خال خال ہی ہوتی ہیں۔

---

[1] پروفیسر گیان چند جین، "علم کا فن، معنی تبسم" مشمولہ ندرت معنی تبسم ص ۲۸۲

ترقی پسند تحریک، جدیدیت، مابعد جدیدیت اور مغنی تبسم

۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۸ء تک ان بارہ برسوں میں

حیدرآباد کی علمی و ادبی فضا میں کافی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ سوچنے کے ڈھنگ بدلے۔ ترقی پسند تحریک نے ذہین نوجوانوں کو اپنی طرف راغب کیا۔ جن میں معین تسلیم بھی شامل تھے۔ لیکن بہرحال ان کا طالب علمی کا دور تھا۔ وہ ابھی انٹرمیڈیٹ میں زیر تعلیم تھے کہ ۱۹۴۷ء میں وہ انجمن ترقی پسند مصنفین کی تحریک میں شامل ہوگئے۔ معین تسلیم اور ان کے افسانہ نگار دوست عماد صدیقی "پیام" کے دفتر پہنچے جو گاندھی بھون کے قریب تھا۔ احتر حسن صاحب اس تحریک کے سکریٹری تھے جب یہ لوگ وہاں پہنچے تو انھیں فارم دیا گیا اور دو ممبرس کی دستخط لانے کے لیے کہا گیا۔ نظامیہ اسٹوڈنٹ میں سب ادیب اور شاعر سیکھتے تھے اس فارم پر ابراہیم جلیس اور ع احمد نے دستخط کر دیئے۔ اس کے بعد فارم داخل کر دیا گیا۔ اس زمانے میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے تحت ایک پرچہ ہفتہ وار نکلتا تھا۔ احتر حسن صاحب کے آنگن میں جلسے ہوتے تھے ابھی پولیس ایکشن نہیں ہوا تھا حیدرآباد میں

رضا کار تحریک شروع ہو گئی تھی اور آزاد حیدرآباد کا نعرہ لگایا جاتا تھا۔ بڑی کشمکش کا دور تھا۔ اُن دنوں ابراہیم جلیس مجلس اتحاد المسلمین کی تائید میں تھے۔ نظر حیدرآبادی، نحسین سروری وغیرہ بھی ان کے ساتھ تھے۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ حیدرآباد کی ریاست کو آزاد ہونا چاہیئے اور آزاد حیدرآباد میں ہم اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں گے۔ دوسرے گروپ کا یہ خیال تھا کہ حیدرآباد کو انڈین یونین میں شامل ہو جانا چاہیئے تاکہ شاہی نظام کا خاتمہ ہو۔ اس گروپ میں معین قسم بھی شامل تھے۔ سب ہی یہ لوگ میٹنگس منعقد کرتے یہی بحث ہوتی۔ ایک طرف ابراہیم جلیس کھڑے ہوتے اور لمبی چوڑی تقریر کرتے اور اس کا جواب عالم جوندھری دیتے۔ آخر کار جو لوگ ابراہیم جلیس کی تائید میں تھے وہ الگ ہو گئے اور اپنی ایک انجمن بنالی۔ معین قسم عالم جوندھری وغیرہ ترقی پسند مصنفین میں ہی رہے اور دونوں انجمنوں کے الگ الگ جلسے ہونے لگے۔ ریاست حیدرآباد کے ختم ہونے کے بعد بھی یہاں ترقی پسند خیالات اور نظریات جاری رہے۔ مخدوم محی الدین، راج بہادر گوڑ، سلیمان اریب اور کئی دوسرے اہم قلم کاروں نے اس تحریک کی بھاؤں میں اپنے تخلیقی سفر کو جاری رکھا۔ ان میں معین قسم بھی ایک ہیں۔ اس دور میں معین قسم پر تصوف اور اشتراکیت کا اثر غالب تھا۔ ۱۷ سال کی عمر میں ان کا پہلا شعری مجموعہ "نوائے تلخ" منظر عام پر آیا۔ جسے پڑھنے سے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی مولوی یا عالم دین یا صوفی کے تجربات قلم بند ہیں جن پر جگہ جگہ اشتراکیت کا اثر چھایا ہوا ہے۔ پروفیسر رحمت یوسف زئی لکھتے ہیں:

"معین قسم کا پہلا شعری مجموعہ "نوائے تلخ" ۱۹۴۸ء میں چھپ کر منظر

عام پر آیا تھا۔ اس وقت ان کی عمر
صرف ۱۷ سال تھی۔ اس مجموعے
میں انھوں نے اشتراکی مسلمانوں کو
دشمن ملت اور دیہ کارل ولیس کا
علم کہا تھا[1]

اسی زمانے میں پولیس ایکشن ہوا۔ اور حیدرآباد کی آزادانہ
حیثیت ختم ہوگئی۔ یہی نہیں، صرف ۸ سال کے بعد ۱۹۵۶ء میں ریاست
حیدرآباد کا وجود ہی مٹ گیا۔ ہندوستان کی لسانی تقسیم ہوئی۔
ریاست حیدرآباد کے تین ٹکڑے کر دیئے گئے۔ اُدھر ادبی منظرنامے میں
بھی سارے ہندوستان اور پاکستان میں تبدیلیاں رونما ہونے لگیں۔
پھر تلنگانہ تحریک شروع ہوئی تو ترقی پسندوں نے ادبی محاذ پر بھی
کام آگے بڑھایا۔ مخدوم کی تقریروں نے جب عوام کے ذہنوں پر
قبضہ کر لیا تو انھیں گرفتار کرنے کا حکم جاری ہوا جبکہ مخدوم فی الحال
انڈر گراونڈ ہو گئے۔ اسی زمانے میں سلیمان اریب نے
تلنگانہ پر ایک نظم پڑھی تھی اسلئے اریب کو بھی گرفتار کر لیا گیا
بعد میں اختر حسن کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔ اب ترقی پسندوں کی لیڈر
شپ متزلزل ہونے کے آثار نمودار ہونے لگے تھے۔ لیکن مخدوم کے
کارکنوں نے سنبھال لیا۔ ان دو جوانوں میں علی تیسی تھے جن کی
ابھی شادی ہی ہوئی تھی اب ان کے گھر میں الجھن کے جلے ہونے لگے۔
سلیمان اریب کو معتمد قرار دیا گیا حالانکہ وہ جیل میں تھے اس لئے
لطیف اسرار کو معتمد قرار دیا گیا۔ علی تیسی اور معین تبسم
جاری رہے گئے۔ اس زمانے میں تیسری جنگ کا خطرہ منڈلا

---

[1] ۔ پروفیسر رحمت یوسف زئی۔ معین تبسم کا تنقیدی شعور، شعبہ اردو معین تبسم
صدا ۱۵۱ ۔ ۵۲۰ء

رہا تھا۔ STOCK HOME میں دنیا کے ادیب جمع ہو گئے تھے
جنگ کے خلاف امن کی اپیل جاری کی گئی۔ STOCK HOME
PEACE اپیل پر ساری دنیا کے ادیبوں نے دستخط کیے اور ایک
امن کانفرنس کا اعلان کیا۔ (فیراسر) کے نام سے اس کا پیام
شائع ہوا تو ان کو گرفتار کیا گیا پھر بعض قسم اور دوسرے لوگوں
نے محسوس کیا کہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے نام سے کام کرنا مشکل ہے
لہذا سوچا گیا کہ نام بدل کر کام کریں۔ انجمن ترقی پسند مصنفین
کا نام بدل کر محفل علم و ادب رکھا گیا اور شاہ نیاز کو اس کا
معتمد بنا دیا گیا۔ محفل علم و ادب کے جلسے ملک پیٹ میں کبھی
محمد القیوم خاں باقی کے گھر پر اور کبھی شاہ نیاز کے مکان پر
ہر ہفتہ ہوتے تھے۔ اس خیال سے کہ کہیں حکومت کی نظر میں نہ آجائے
بعض ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کو بھی اس تحریک میں شامل
کیا گیا۔ پھر سلیمان اریب، سری نواس لاہوٹی، حیدر شاہد
جیل سے رہا ہوئے تو وہ بھی اسی انجمن میں شامل ہو گئے۔ غالباً
سلیمان اریب کو معتمد بنایا گیا۔ چند جلسوں کے بعد محفل علم
و ادب کا نام بدل کر انجمن عوامی مصنفین رکھ دیا گیا۔ کمیونسٹ
پارٹی پر سے پابندی اٹھ گئی تھی اس لیے کھلے بندوں ہفتہ وار
جلسے منعقد کیے گئے۔ ان جلسے ریڈی ہاسٹل کے قریب ایم ایم
ہاشم کے مکان پر ہونے لگے۔ جو بعد میں کانگریس میں شامل ہو گئے
اور اسمبلی پھر پارلیمنٹ کے رکن بن گئے۔ جب سلیمان اریب
نے رسالہ "صبا" جاری کیا تو انجمن عوامی مصنفین کے جلسے محمود
گاؤں (میجلرس کوارٹرس کرہ نمبر (17) جہاں "صبا" کا دفتر تھا)
منعقد کیے جانے لگے۔ "صبا" جاری کرنے سے پہلے شب روز کی
ادارت کرتے تھے۔ بعض ادیبوں کا ان سے اختلاف ہوا

جس میں ڈاکٹر معنی تبسم، عاتق شاہ، قمر ساحری، سرور ڈنڈا شامل تھے۔ ان چاروں نے مل کر دوماہی رسالہ "شعور" جاری کیا۔ جس کے تین شمارے شائع ہوئے پھر یہ رسالہ بند کر دیا گیا۔ ڈاکٹر معنی تبسم نے اکرام جاوید کے ساتھ مل کر سیشنل رائٹرس اسوسی ایشن ۱۹۵۵ء میں قائم کی اور دو سال تک کام کیے۔ سلیمان اریب سے اختلافات بعد میں ختم ہو گئے۔ اور وہ عوامی جلسوں میں شریک ہونے لگے۔ ڈاکٹر عبدالعلیم حیدرآباد آتے۔ اردو ہال میں ادیبوں کا ایک جلسہ منعقد کیا گیا اس بات پر غور کرنے کے لیے کہ اب انجمن ترقی پسند مصنفین کا احیا کیا جائے یا اس کی ضرورت نہیں۔ مخدوم محی الدین اور زیادہ تر ادیبوں کی یہ رائے تھی کہ اب حالات بدل چکے ہیں ترقی پسند تحریک اپنا کام کر چکی ہیں پھر عوامی مصنفین کے جلسے بھی بند ہو گئے۔ ۱۹۶۰ء کے بعد سے جدیدیت کے رجحان کا آغاز ہوا۔ اس رجحان سے بہت سے ادیب متاثر ہوئے۔ حیدرآباد میں بھی بہت سے ادیب متاثر ہوئے۔ احمد ہمیش ان دنوں حیدرآباد میں تھے چند ادیبوں نے ان میں سلیمان اریب، معنی تبسم، الور معلم، احمد ہمیش، حسن فرخ، رؤف خلش وغیرہ شامل تھے۔ یہ طے کیا کہ جدید ادیبوں کی مل بیٹھ کالرلس منعقد کی جائے۔ مخدوم محی الدین بھی اس کی تائید میں تھے۔ طے کیا گیا کہ اس کالرلس میں کرنٹ کمیونسٹ اور کرنٹ مخالف کمیونسٹ۔ کرنٹ کمیونسٹ میں سلیمان اریب، علی سردار جعفری اور مخالف کمیونسٹ جیسے گوپال متل کو کالرلس میں شرکت کی دعوت نہ دی جائے۔ لیکن احمد ہمیش نے گوپال متل کو شرکت کی دعوت دی تھی۔ ان کا خط تحریک میں شامل ہوا۔ اس کی وجہ سے اختلافات پیدا

ہوئے اور یہ کانفرنس منعقد نہ ہو سکی۔ سن ۱۹۶۰ء میں
کچھ دنوں بعد دہلی میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے احیاء کے لیے ایک
کانفرنس منعقد ہوئی جس میں مخدوم محی الدین کے ساتھ حسن
مزمل اور رؤف خلش نے شرکت کی۔ لیکن انجمن کے احیاء کی یہ
کوشش ناکام ہوئی۔ پھر حیدرآباد کے نوجوان ادیبوں نے مل کر
ایک نئی تحریک حیدرآباد لٹریری فورم (حلف) قائم کی۔
کچھ عرصہ تک اس کے اجلاس ہوتے رہے پھر تعطل پیدا ہوا۔
زندگی اور ادب کے اقدار بدلے دنیا بھر میں ہونے والی تبدیلیوں
اور ادبی رجحانات کی کروٹوں سے معین قیصر کو جدید طرز فکر کی طرف
مائل کیا۔

اگرچہ معین قیصر کمیونسٹ پارٹی کے باضابطہ رکن تھے اور
"سوشیل کمار" کے نام سے پارٹی کا کام کیا کرتے تھے لیکن مزاج
کے اعتبار سے وہ صحیح معنوں میں بدلتے ہوئے رجحانات کے حامل تھے
چنانچہ کمیونسٹ پارٹی کے زیر اثر ترقی پسند تحریک سے بھی وہ آگے
نکل گئے۔ چونکہ معین صاحب کا مطالعہ بہت وسیع ہے اور وہ
اپنے طالب علمی کے زمانے ہی سے عالمی ادب، نئے رجحانات اور
نئی فکر کے بارے میں جاننے کے لیے تگ و دو کرتے رہے تھے ان کا
کلاسیکی ادب کا مطالعہ بھی بے حد وسعت کا حامل تھا۔ پروفیسر
رحمت یوسف زئی لکھتے ہیں۔

"کلاسیکی ادب کے گہرے مطالعے
نے انہیں مختلف ادبی نظریات سے
باخبر کیا۔ یہ وہ دور ہے جب
ماہنامہ "صبا" نے ادب کی دنیا
میں ایک نئی ہل چل سی پیدا کر رکھی تھی۔

۱۹۳۶ء کے بعد نمودار ہونے والے
ترقی پسندی کے سیلاب میں ہر
من کا رتنکے کی طرح بہا جا رہا تھا۔
"صبا" نے ترقی پسندی شعف کے
باوجود کائنات کو جدید حسیت کے
نقطۂ نظر سے دیکھنے کی طرف متوجہ
کیا۔ خود معنی تبسم بھی ترقی پسند
نظریات سے متاثر رہے لیکن مختلف
انداز سے۔ انھوں نے ادب کو ترقی
پسند نظریات کی تبلیغ کا ذریعہ
نہیں مانا۔ آزادی کے بعد تخلیق
ہونے والے ادب میں آہستہ آہستہ
جو تبدیلیاں نمودار ہو رہی تھیں
ان سے معنی تبسم کما حقہ واقف تھے۔
ادب کی رفتار سے باخبری نے معنی
تبسم کو ایک تخلیق کار کی حیثیت سے
نئے "جہانوں سے روشناس کرایا"[1]

معنی تبسم نے اردو اکیڈیمی کے زیر اہتمام ۱۹۷۹ء میں
منعقدہ "اردو ادب کے بیس سال" کے زیر عنوان اظہار
کئے اپنے کلیدی خطبے میں خیالات کا اظہار کیا ہے ان سے
معنی تبسم کی فکر کے ارتقائی منازل کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

اردو میں جدیدیت کی تحریک

---

[1] ۔ پروفیسر رحمت یوسف زئی۔ "معنی تبسم کا شعری سفر" مشمولہ نذر معنی تبسم
ص ۲۵۲

دوسری دہائی میں شروع ہو چکی
تھی جب اس تحریک نے ایک نمایاں
اور واضح شکل اختیار کرلی تو اسے
ترقی پسند اور نیا ادب سے موسوم
کیا گیا۔ نئی رومانیت، تحلیلِ
نفسی، مارکس ازم اور
وجودیت جدیدیت کی تحریک کے
مختلف پہلو تھے جو بدلی ہوئی انسانی
صورتِ حال کے نتیجے میں رونما
ہو رہی تھی اور جس سے ہندوستان
کے ادیب اور فن کار متاثر ہوئے
بغیر نہ رہ سکے۔ پھر یہ نیا ادب
دو دھاروں میں منقسم ہو گیا۔
حلقۂ ارباب ذوق نے فرد پر توجہ
مرکوز کی، اس کی انفرادی واردات
اور تجربوں کو موضوع بنایا۔
شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں جنسی
اور نفسیاتی عوامل کی کارفرمائی کو
نمایاں طور پر پیش کیا گیا"[1]۔

اسکے علاوہ معنی تبسم اپنے مضمون "لفظوں سے آگے" میں
جدیدیت کے اہم خدوخال پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"ہم عصر معاشرہ اور کلچر آواں گارومیت

---

[1] بحوالہ ڈاکٹر نامرہ بیگم۔ مضمون "لفظوں سے آگے" مشمولہ نذر معنی تبسم۔ ص ۴۳۰

اور ہلرم کا شکار ہے۔ جس کا
پرتو جدید ادب پر بھی نظر آتا ہے۔
یا ادب سماج اور روایت سے
بغاوت کرتا ہے وہ مذاق عام
کی تسکین سے بھی بے نیاز ہے۔
یہ ادب کی بیان کا ایک زاویہ
زبان کا استعمال بھی ہے۔ چونکہ
یہ ادب کے تجربات ہیں۔ اس لیے
اس میں زبان کا استعمال میں
نیا ہے۔ یہ روایتی زبان کو بوتر سیلی
اور کاروباری زبان کی طرح سکہ
بند ہونی ہے رد کرتا ہے۔ اور نیا
محاورہ تشکیل کرتا ہے۔ نیا ادب
روایت سے بالکل قطع تعلق
نہیں کرتا البتہ وہ ماضی قریب کے
ادب کے مقابلے میں ماضی بعید کے
ادب کی بدیرانی کرتا ہے۔"[1]

معنی تبسم کا مشاہدہ ہی بے حد تیز اور عصری حسیت کا حامل ہے۔
اسی لیے ان کے ہاں اظہار کی کیفیت اپنے باطن کے اکتشاف سے
مربوط ہو جاتی ہے۔ پروفیسر رحمت یوسف زئی لکھتے ہیں:

"معنی تبسم روحانی لقطۂ نظر کو
لوگوں کے سامنے لایا۔ اس کے پیچھے ان

1۔ پروفیسر معنی تبسم "لفظوں سے آگے"۔ ص۔ 9

کا جدید دلکش و دلچسپ اسلوب اور
فرد کی باطنی کیفیات کا مطرب شاہ[1]

حلقۂ ارباب ذوق کے ادیبوں اور شاعروں میں میراجی نے سب سے زیادہ قسم کو فعال طور پر متاثر کیا۔ میراجی کی نئی علامتیں، مبہم لیکن رواں اظہار اور ذات انسانی کے انکشافی کرب نے سبھی صاحب کو بھی گرویدہ کیا۔ مصحف اقبال توصیفی لکھتے ہیں

"میراجی کی نظموں میں اس دھرتی کی
لوباس، جسم کی لطافت کا احساس،
بادلوں کے اسرار و رموز، بے علامتی،
دھندلکا یہ ساری باتیں سبھی
کے لیے دامن کش دل ہوئیں، عملی
طور پر حلقے سے دور اور ذہنی طور پر
حلقے کے شریک سفر ہوتے ہوئے
بھی معنی نے حلقے کی اجتماعیات
کو اپنے اندر جذب کیا تو ان کے تو پر
سے مطالعت رکھتی تھیں"[2]

سلیم احسن لکھتے ہیں:

"سبھی مباحث اگر نہ ہوتے تو جدید آثار میں
ترقی پسند تحریک سے انحراف کی جو بنیاد
سلیمان اریب، اور وحید اختر ڈال
گئے تھے وہ اتنی ترقی نہ کرتی۔ جدیدیت

---

[1] ۔ پروفیسر رحمت یوسف زئی۔ معنی قسم کا تعارفی سفر۔ مشمولہ اندر معنی قسم ص ۱۵۴

[2] ۔ مصحف اقبال توصیفی "پیلی کرن کا بوجھ (معنی قسم)۔ ایک مطالعہ۔ مشمولہ اندر معنی قسم ص ۔ ۱۷۴، ۱۷۷

کے رجحان کو فروغ دینے میں
اور پوری ایک نسل جدید لکھنے
والوں کی تیار کرنے میں مغنی صاحب
کا اہم رول رہا ہے۔ اور تو اور
روایتی انداز میں برسوں سے لکھنے
والوں کو بھی انھوں نے جدید انداز
اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔ حسن
کی ایک مثال عوض سعید ہیں"[1]

یہ بات بالکل درست ہے۔ مغنی تبسم حیدرآباد کے ان گنے چنے تخلیق کاروں اور نقادوں میں سر فہرست ہیں جنھوں نے جدید طرز فکر کو نہ صرف اپنایا بلکہ ایک حلقہ بھی بنایا۔ پروفیسر رحمت یوسف زئی لکھتے ہیں:

"مغنی تبسم اس اعتبار سے بھی اہمیت
حاصل کر لیتے ہیں کہ انھوں نے اپنے
فکر و فن سے ایسے وقت جدیدیت
کے چراغ روشن کیے جب یہاں
جدیدیت کا کوئی واضح تصور موجود
نہ تھا۔ حلقۂ ارباب ذوق نے
روایت کے مروجہ رجحان سے
انحراف کیا تھا۔ یہ انحراف نئے
دور کے آنے والے ادب کا پیش
خیمہ تھا اور حیدرآباد میں ہوئے

---

[1] ۔ پروفیسر بیگ احساس ۔ مغنی تبسم ایک مطالعہ اور مختلف شخصیت مشمولہ نذر مغنی تبسم
ص ۲۰۷ ، ۲۰۸

ہو نہ والے ادراک کے عمل میں
معنی تتم پیش پیش رہے ہیں۔"[1]

یہ وہ زمانہ تھا جب لاہور میں حلقۂ اربابِ ذوق کی سرگرمیاں عروج پر تھیں۔ میراجی، ن۔م راشد، مجید امجد اور دوسرے قلم کاروں نے ہیئت، اسلوب اور فکر کی طرف متوجہ کیا۔ معنی اقبال توصیفی لکھتے ہیں

"ترقی پسند تحریک اور حلقۂ اربابِ
ذوق، معنی اور ان کی نسل کے
شاعروں کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ
وہ ان میں سے کسی ایک یا دونوں
ہی تحریکوں / تنظیموں کے عقائد،
افکار یا شعری رویوں سے مکمل
طور پر بے نیاز رہ سکیں۔
ترقی پسند تحریک اشتراکی انقلاب
کی پیامبر تھی۔ اس نے ایک بہتر
سماجی نظام کی آرزو کی اور
اردو ادب کو ایک نیا موڑ، ایک
نئی سمت عطا کی۔ لیکن جلد ہی
دیرینہ انتہا پسندی کی زد میں
آگئی۔ نعرہ بازی، تکرار،
دلائل، تکرارِ بیان، جوش کے
جذبات اور ادراک کی پیروی اور

---

[1] ۔ پروفیسر رحمت یوسف زئی۔ "معنی تتم کا تعریفی مطالعہ۔ مشمولہ نذرِ معنی تتم"
ص ۱۶

طوالتِ بیاں، ان عناصر سے اور
بھی ابہام کی صورت پیدا کی" [1]

ادھر ادھر حلقۂ اربابِ ذوق نے آزادیٔ فکر، ذات کے مسائل اور طرزِ اظہار میں ایک نئے کھردرے لہجے کو فروغ دیا۔ لیکن ترقی پسندوں نے اس طرزِ فکر کو ناپسندیدہ قرار دیا۔ حمید حاصل لکھتے ہیں:

"مخالف مکتبِ فکر نے جدیدیت یا
ماڈرن ازم کو محض بورژوا
ذہنیت کی ایج سمجھا اور سمجھایا
کہ کہاں بنیادوں پر اکھاڑ سا گیے،
فلسفہ، لفظ، معنی، زبان،
علامت، متن اور جمالیات پر
نئی تصورِ کائنات پیش کیا۔" [2]

لیکن بہرحال جدید رجحانات نے ادب میں اپنے قدم جما لیے۔ جدیدیت کی ایک اہم خصوصیت اس کا ابہام اور پیچیدہ اظہار بھی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر نئی چیز قدرے پیچیدہ اور مبہم ہوتی ہے۔ جدید مزاجِ ادب اس نئے رجحان کو اپنایا تو اس میں پیچیدگی در آئی۔ حمید حاصل لکھتے ہیں:

"تخلیقی ذہن نئے رجحانات کو
پردے پر لانے کے لیے، اسی طرح
کوشش کرتا ہے جس طرح کوئی ریاضی داں

---

[1] ۔ مصحف اقبال توصیفی "پہیلی کرن کا بوجھ" (مضمون نسیم) ۔ ایک مطالعہ مشمولہ نذر مضمون نسیم ص ۔ ۵۰۳

[2] ۔ حمید حاصل "مٹی مٹی میرا دل" ۔ کا تعزی مجموعہ حدِ آخر پر۔ مشمولہ نذر مضمون نسیم ص ۔ ۵۰۵

اپنے مشکل ترین نظریے کو ثابت
کرنے کے لیے کرتا ہے اور بعید از فہم
مثالوں کو استعمال میں لاتا ہے۔[1]

مثالوں رد جدیدیت کی اہم خصوصیت یہ تھی کہ ابہام ملکہ لایعنی ادب کو اہمیت دی جارہی تھی حد سے زیادہ بڑی بے دلی اور لایعنیت کی وجہ سے ادب اپنے لفظوں کا گورکھ دھندا بن گیا تھا جو اظہار کو قاری تک پہنچانے کے بجائے صرف تخلیق کار کے ذہن تک محدود رکھتے تھے لیکن آہستہ آہستہ اس اظہار پر بھی زوال آیا بے معنی بیانیہ کے بجائے معنی۔ بحال ہوئے۔ زبان کی کرتب بازیوں کی جگہ سلجھے ہوئے اظہار نے بار پایا جو دراصل تہذیبی روایتوں کے پس منظر میں فکری اور ادبی محاذ پر انسانی ذہن کی کاوشوں کا نتیجہ تھا۔

ایک بات طے ہے کہ کوئی نظریہ حرف آخر نہیں کہا جاسکتا جدیدیت بھی حرف آخر نہیں ہے بلکہ سچ بات تو یہ ہے کہ جدیدیت ہر دور اور ہر زمانے میں موجود رہی ہے۔ تبدیلی ہی انسانی ذہن کا سب سے بڑا وصف ہے چاہے ادب میں ہی تبدیلیاں لاگو ہوتی ہیں۔ جدید معاشرے میں ہونے والی تبدیلیاں، نیا معاشرتی مزاج، پیچیدہ سے پیچیدہ تر مسائل اور انسانی ذہنوں پر اثر انداز ہونے والی تیز رفتار تبدیلیاں مابعد جدیدیت کی بنیاد کہی جاسکتی ہیں۔ گوپی چند نارنگ رقمطراز ہے

"پس ساختیات میں اور مابعد
جدیدیت میں حد فاصل قائم نہیں
کی جاسکتی چاہے اکثر و بیشتر پس

---

[1] ۔ حد فاصل۔ مضامین فراول ۔۔۔ کا شعری مجموعہ سرحد آخر پر۔ مشمولہ اندر معنی کم
ص ۱۔ ۵۰۰ ۷ ۵۰۰ ۱۰۵

ساختیاتی مفکرین کو مابعد جدید
مفکرین کہہ دیا جاتا ہے اور یہ
دونوں اصطلاحیں ایک دوسرے
کے بدل کے طور پر استعمال کی
جاتی ہیں"۔[1]

اردو میں جدیدیت سن 60ء کے بعد شدت سے محسوس کی جانے لگی اور بیشتر ادیبوں اور شاعروں نے اسلوبیاتی سطح پر اس کو استعمال کیا لیکن جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے۔ معنی تتم نے اردو میں جدیدیت کے علمبردار ہونے سے بہت پہلے اس رجحان کو آنے والے دور کا سب سے قوی رویہ کہہ دیا تھا۔ آج کے دور کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ انسانی معاشرے میں ہونے والی ادھل پتھل، بحرپور سائنسی ترقیات اور ٹکنیکی اعتبار سے روز آنے والی سائنسی ایجادات نے انسانی شعور کو بے حد متاثر کیا۔ ظاہر ہے کہ ان ساری چیزوں کا اثر ادب پر بھی پڑنا لازم تھا۔ یہی تبدیلیاں اور سماجی ادھل پتھل کا اظہار ادب میں نمایاں ہوا۔ اور اسی کو مابعد جدیدیت کہا گیا۔

مابعد جدید مفکرین نے علم کو دو حصوں میں تقسیم کیا۔ ایک سائنسی اور دوسرا بیانیہ۔ سائنسی علوم نے انسان کی زندگی کو نئی راہوں کی طرف گامزن کیا۔ صنعتی انقلاب اور صارفیت کے اس دور میں علم بھی ایک مال کی طرح بیچا اور خریدا جانے لگا۔ کمپیوٹر نے اس عمل کو اور ہوا دی۔ ایک طرف تو کمپیوٹر نے ساری دنیا کو سمیٹ کر ایک چھوٹے سے

---

[1] ۔ گوپی چند نارنگ۔ مرتبہ "اردو مابعد جدیدیت پر مکالمہ" ص۔ ۲۰

ڈبے میں مقید کر دیا تو دوسری طرف دنیا بھر کے علوم و فنون کا آب واحد میں تبادلہ ہونے لگا۔ اور اس طرح سائنسی ترقیات کی ایک ایسی لہر شروع ہوئی جس کی ماضی میں کوئی نظیر نہیں ملتی۔ صارفیت دنیا کا سب سے بڑا کھیل بن گئی۔ استحصال اپنے عروج پر پہنچ گیا جس کے خلاف مارکس نے سب سے پہلے آواز بلند کی تھی۔ دوسری قسم بیانیہ کی ہے جس کا ساتھ انسانی سماج تقاضائی روایتیں اور معاشرتی اقدار سے جڑی ہوئی ہے انسان ہمیشہ ہی نیکی اور بدی، سچائی اور جھوٹ، خیر اور شر سے وابستہ رہا ہے اور اسی کی پہچان بیانیہ کا ایک حصہ ہے۔ سائنسی علم کے باوجود بیانیہ نسل انسانی کی ایک بہت اہم ضرورت ہے۔ سائنس بیانیہ کو رد کرتی ہے اور بیانیہ سائنس کو گمراہ کن قرار دیتا ہے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بیانیہ ہمارا وہ سرچشمہ ہے جو رویّے کی تہذیب کرتا ہے۔ معاشرتم کے ہاں تہذیبی اقدار اپنی روایتی شان کے ساتھ جلوہ افروز ہیں لیکن انھوں نے کبھی بھی اپنے آپ کو روایت کا محکوم نہیں سمجھا بلکہ ہر آنے والے کل کو نظر میں رکھ کر اپنی فکر کو جلا دیتے رہے۔ وہ زندگی کے استعارے کو محسوس کرتے ہیں اور ان حقائق کی بازیافت کرتے رہتے ہیں جو انسانی شعور کے عین مطابق ہیں۔ انھوں نے مغربی مفکرین کی طرح ماضی کے اسالیب کی بازیافت کا نعرہ نہیں لگایا۔ لیکن خود کو ان سے الگ بھی نہیں کیا۔ ان کے ہاں وقت کا احساس اپنی تمام تر سچائیوں کے ساتھ موجود ہے۔ ان کا تخلیق کی صلاحیتیں آزاد اور آرٹ کی آزادی کی قائل ہیں۔ ان کی نظر انسانی زندگی میں پیدا ہونے والے نظریاتی خلا پر بھی ہے اور ساتھ ہی مابعد جدید تخلیقی رویّے پر بھی۔

اس کے تنقیدی مزاج پر گذرے ہوئے کل کی بجائے آنے والا کل غالب ہے۔ اور یہی اُن کا موجودہ تنقیدی نظریہ کہا جا سکتا ہے۔

ادب، نظریے کا پابند نہیں ہو سکتا اور نہ ہی یہ ممکن ہے کہ تنقید پر جمود طاری کر دی جائے یا کسی مخصوص ضابطے کو استعمال کیا جائے۔ معنی قسم نے اپنے تنقیدی رویے میں تازہ کاری اور فکر و نظر کی نئی راہیں ہمیشہ کھلی رکھیں۔ تانیثیت، نوتاریخیت، ساختیات، پس ساختیات، تشکیل اور ردِ تشکیل کی کشود میں گئے بغیر یہ کہا جا سکتا ہے کہ معنی قسم کی تنقیدی بصیرت اردو کے سیاسی اور معاشرتی منظر نامے پر پوری طرح حاوی ہے۔

اُن کی سب سے بڑی ترجیح تبدیلی ہے انھوں نے اپنے آپ کو عصر سے بیگانہ کر کے تنوطیت کا رُخ نہیں کیا اور نہ ہی سکہ بند قسم کے نظریوں کو خود سے جوڑ کر استعمال میں لائے۔ ان کے ہاں مارکسی اور مابعد الوارم کی اہمیت آج بھی برقرار ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ان کی تخلیقیت نے غیر محتاط طور پر علامتوں اور استعاروں سے خوش کاری کی ہے۔ معنی قسم نے اُردو کے سرمایہ کو نئی روایات سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی۔ اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ معنی صادب کا تنقیدی رویہ مسلسل ارتقا پذیر رہا۔ وہ مابعد جدیدیت کے بارے میں سنجیدگی سے غور کرتے ہیں، اپنے مطالعہ کے ذریعہ مشرقی اقدار اور خاص کر اُردو کے تناظر میں نئے 'موڑ' کے علم بردار ہیں۔ کتابِ نقاد وہ تجربات کو اہمیت دینے کے ساتھ ساتھ متنی وحدت کو بھی اہم مانتے ہیں۔ ان کا دائرۂ نظر وسیع ہونے کے ساتھ ساتھ معاشرتی اور تقافتی سطح پر ہونے والی تبدیلیوں کے سبب

پیدا ہونے والی فضا نے فکری آزادی کو سمیٹے ہوئے ہے۔
اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ اُردو تنقید کی تاریخ میں معنی تبسم
ایک ایسے نقاد کی حیثیت رکھتے ہیں جو کائنات سے ابھرنے
والی "کن" کی ہر آواز کو محسوس کرتے ہوئے اپنے اندر
جذب کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

شاعری ــــ آغاز و ارتقا

معنی تبسم اوائل عمر ہی سے گیسوئے شعر سلجھاتے رہے
ان کے شعری ذوق کو پروان چڑھانے میں، ان کے تایا کا بڑا
دخل رہا ہے اور اپنی پہلی غزل انھوں نے اپنے تایا ہی کی موجودگی
میں سنائی تھی۔ معنی تبسم کی شاعری کا پہلا دور تو بہت واضح
طور پر نظر آتا ہے جو "نوائے تلخ" کی شاعری پر محیط ہے اور
جس میں تصوف، مذہب، اخلاقیات، سماجی فکر اور
امثال کا لہجہ نمایاں ہے۔ امثال نے نہ صرف ایک پوری نسل
کو متاثر کیا بلکہ پوری صدی امثال صدی کہی جا سکتی ہے۔
معنی تبسم بھی امثال کے اس سحر سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔
وہ امثال کے مردِ مومن کے تصور سے اس قدر متاثر ہوتے ہیں کہ
ان کے اشعار میں یہ تصور نمایاں طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔

مردِ مومن واقفِ سرِّ حیات
کاشفِ رازِ درونِ کائنات

اک لسیم جالوا جس کے اسیر
گلشن ہستی کی کلیاں، پھول، پات

مغی تبسم کی عمر صرف (۱۷) سال کی تھی جب ان کا پہلا شعری مجموعہ "لوائے نلخ" ۱۹۴۸ء میں شائع ہو کر منظرِ عام پر آیا۔ جس میں دعائیہ نظمیں، قطعے اور غزلیات شامل ہیں۔ (۵۰) صفحوں پر مشتمل ان کے ابتدائی کلام کے اس مجموعے میں مولانا روم اور اقبال کا گہرا اثر دکھائی دیتا ہے۔ "لوائے نلخ" سے مندرجہ ذیل قطعہ ملاحظہ فرمائیے ؎

محشر کائنات لے، آیا آیا
مجروح نجات لے، آیا آیا
ناکام نہ اب پھیر تو للہ للہ
رحمت کا سہارا لے، آیا آیا

ایک اور قطعہ دیکھیے، جس میں مولانا روم اور اقبال سے قربت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ؎

بھاتے ہیں مجھ کو تو یہ تہذیب کے پھندے
شاہیں ہوں، کروں گا میں پہاڑوں پہ بسیرا
ایک روز گرا دے گا مرے عزم کا طوفان
موجودہ تمدن کے حرامات کا ڈیرا

"لوائے نلخ" میں اقبال کے تتبع کا اندازہ اس تعریف سے بھی لگایا جا سکتا ہے۔ جس میں انھوں نے دشمن ملت اور دین کا رل، ولیمس کا علامہ اشتراکی مسلمانوں کو قرار دیا تھا۔ اپنی نظم "اشتراکی مسلمان کے نام" میں وہ کہتے ہیں ؎

دشمن ملت و دیں کارل ولیس کا غلام
ناکی خواب گراں ہوش میں آ ہوش میں آ

اقبال نے کہا تھا ؎

جس کھیت سے دہقان کو میسر نہ ہو روزی
اس کھیت کے ہر خوشہ گندم کو جلا دو

مغنی تبسم کہتے ہیں ؎

جہاں ہیں زمیں بوس محفل حسیں
وہ جو کھٹ جلد سے کو جی چاہتا ہے

"نوائے تلخ" کی ایک اہم خصوصیت مذہبی فکر اور بالخصوص تصوف ہے انھوں نے اس مجموعہ کو آقائی و مرشدی مولانا سید محمد بادشاہ حسینی مدظلہ معتمد مجلس علمائے دکن کے اسم گرامی پر معنون کیا اور اس کا پیش لفظ بھی مولانا سید محمد بادشاہ حسینی ہی کا تحریر کیا ہوا ہے۔

"الحمد للہ آج جب یہ اپنے والد کے ساتھ مجھ سے ملنے آئے اور اپنا کلام سنایا تو مجھے حیرت آمیز مسرت ہوئی۔ ان کی عمر ۱۷ سال کے لحاظ سے ان کا یہ کلام بہت ہی قابل قدر ہے ـــــ اسی صراط مستقیم پر گامزن رہوگے تو دنیا تمہاری مریدگی اور زمانہ غلامی۔ میری دعا ہے کہ ہمارے ملک کے یہ نوعمر شاعر اپنی درازی عمر کے ساتھ ساتھ اپنے کلام کے لحاظ سے بھی ترقی کے مدارج آئے دن طے کرتے جائیں اور چالیس سال کی عمر میں

جناب تبسم وکن میں اقبال
ثانی ہوں" [1]

تصوف کے لئے میں سرشار وہ کہہ اٹھے ہیں نظر
کچھ ہوں میں نیکس صیاد ہے زمانہ
دیا قفس ہے مجھ کو شیرب ہے آشیانہ

تیر نے کہا تھا۔

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
چاہے ہیں سو آپ کرے ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

اب معنی تبسم کا یہ شعر بھی دیکھیے۔

مرے گناہ کی پرسش نہ بھوسے کریارب
مری خطائیں مجروح اختیار ہوں میں

مفتی تبسم کو شعوری طور پر یہ احساس ہے کہ انہوں نے سعدی و حافظ سے خوشہ چینی کی ہے کہتے ہیں۔

تیری غزل کے شعر تبسم!
ہیں سعدی، مینائے حافظ

ذیل کے شعر میں انہوں نے اقبال سے خوشہ چینی کی ہے۔ اور ناری الفکر ہیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اقبال ہی کے اشعار ہیں۔

اس کی باتیں سے پیام یاس و بیم
اس کا پیغام عمل۔ حرف کلیم
ابتدائے فکر او انسانیت
انتہائے فکر او رب علیم

---

[1] ۔ حضرت سید محمد بادشاہ حسینی "نوائے تلخ" پیش لفظ۔ ص۔ ۷، ۸

صبا تو آج اگر جا رہی ہے سوئے رسول
لے جا سلام مری دل کی آرزو ئے رسول
ستر ف تو حضرت موسیٰ کو ہے کلیمی کا
لبید خاطر معبود گفتگو ئے رسول

معنی تبسم نے "محبت رائیگاں" کے نام سے ایک لطم حضرت سید محمد بادشاہ حسینی القادری مدظلہ کے نام کی ہے۔ جس میں حضرت سید محمد بادشاہ حسینی القادری کے اوصاف کو نہایت خوش اسلوبی سے بیان کیا گیا ہے۔

ایک پیکر صدق و خلق و مروت و وفا کیش
محبانہ الفت کا مجسمہ ریدِ بلد جوش
آنکھوں کے سکوروں میں، لگا ہو ناکی لیے بات
مہکے کا میخانہ اٹھائے ہوئے سر دوش
ہنسنے کا وہ انداز، وہ مہکتے تبسم
دیکھے تو ہر اک طالب دیدار ہو مدہوش
وہ محبت رائیگاں مرے واسطے کیا ہے؟
جیسے کسی بچے کے لیے ماں کا ہو آغوش۔

سن 1936ء کے بعد کا زمانہ اردو ادب میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ کیوں کہ اسی دور میں زبان اردو میں وارج طرح کی اصناف سخن کے گئے۔ ترقی پسندی کے سیلاب نے ہر من کار کو متاثر کیا۔ نئی نسل بڑھا اور ادیبوں نے ادبی دنیا پر مبنی کر دکھایا تھا معنی تبسم نے بھی محسوس کیا کہ مذہب اور تصوف سے ان کا من

محروح ہو رہا ہے۔ انہوں نے اپنے تصورات کو نئے پیرائے اظہار میں کرنے کی۔ ترقی پسند نظریات سے بعض قسم کی متاثر ہونے انہوں نے رکن کی حیثیت سے کمیونسٹ پارٹی کی خدمت خود کی لیکن ادب کو ترقی پسند نظریات کی تبلیغ کا ذریعہ قرار نہیں دیا۔ آزادی کے بعد ترقی پسند ادب میں جو تبدیلیاں ہوئیں ان سے بھی بعض قسم کوئی واقف تھے۔ مزید مطالعے نے انھیں نئے جہانوں سے روشناس کرایا۔ ان کا نظریۂ فن اس وقت کھل کر سامنے آتا ہے جب انھوں نے شہریار کے مجموعے کلام پر تبصرہ کیا تھا۔ خیال رہے کہ یہ تبصرہ ۱۹۵۶ء سے قبل کا ہے کیوں کہ یہ تبصرہ ان کے مضامین کے مجموعے مازیافت میں شامل ہے جو ۱۹۵۶ء میں شائع ہوا تھا۔ مندرجہ ذیل اقتباس سے یہ صاف اندازہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ جدیدیت سے کتنے قریب ہو گئے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے:

> "آج کے دور کے لکھنے سے پہلے آج کے
> دور میں سانس لینا فرض ہے وہ
> شاعر جو صحیح معنوں میں جدید کہلانے
> جا سکتے ہیں، بہت کم ہیں۔ لیکن ان
> کا اثر ہماری شاعری اور شاعروں پر
> تیزی سے بڑھتا جا رہا ہے۔ وہ
> دن دور نہیں جب جدیدیت ایک
> مستقل اور توانا تحریک کی صورت
> اختیار کر جائے گی"[1]

اور اگر غور کیا جائے تو ۱۹۵۶ء میں اس طرح کے تصورات

---

[1] ۔ پروفیسر بعض قسم۔ تبصرہ "اسم اعظم" مشمولہ مازیافت، ص ۴۶

کا نمو پذیر ہونا یہ ثابت کرتا ہے کہ معنی قسم ۱۹۶۰ء کے بعد آنے والی جدیدیت سے بہت پہلے ہی جدیدیت سے روشناس ہو چکے تھے۔ اس کی بنیادی وجہ ان کا مغربی ادب کا مطالعہ ہے۔

معنی قسم کا دوسرا مجموعہ "کلام پہلی کرن کا بوجھ" ہے جو (۱۱۲) صفحات پر مشتمل ہے جس میں (۱۸) غزلیں اور (۳۵) نظمیں شامل ہیں۔ یہ مجموعہ جون ۱۹۸۰ء کو شائع ہوا۔ انھوں نے اس مجموعے کو والد مرحوم کے نام معنون کیا ہے۔

"پہلی کرن کا بوجھ" میں اُن کی شاعری کی ایک نئی جہت کا احساس ہوتا ہے یہاں ان کا شعری مزاج اور اسلوب وسیع ہوتا ہے یعنی قدرے ترقی پسندی کے ساتھ جدید لب و لہجہ اور اس میں ان کا نقطۂ نظر کھل کر سامنے آتا ہے۔

"پہلی کرن کا بوجھ" پر تبصرہ کرتے ہوئے مصحف اقبال توصیفی لکھتے ہیں:

> "ایسے داخلی میلانات جو تخلیقی جوہر کی کمی یا ہیئت کے ایسے تجربات جو فیشن پرستی کے باعث معرضِ وجود میں آئے تھے، معنی کی شاعری میں راہ نہ پا سکے۔۔۔"[1]

یہ بات صحیح ہے کہ انھوں نے محض فیشن کے لیے شاعری نہیں کی اور نہ ہی انھوں نے جدیدیت کو بطور فیشن اختیار کیا۔ یہ بھی سچ ہے کہ انھوں نے کلاسیکی ادب کا مطالعہ ہی نہیں کیا۔ ان کے مطالعے کے بارے میں مصحف اقبال توصیفی لکھتے ہیں:

---

[1] مصحف اقبال توصیفی۔ "پہلی کرن کا بوجھ" ایک مطالعہ، شمولہ "پیش رفت" جلد ۱ شمارہ ۵، ۶، ۵ ص ۵

"معین تبسم نے اپنے کلاسیک کا اس
طرح مطالعہ کیا کہ وہ ان کے دل
رات کے ساتھی بن گئے تھے اس
انہی محبت کا انداز اس طرح بڑا
کہ جمیل الدین عالی کی طرح وہ بھی
یہ سوچنے لگے کہ اگر غالب سے بہتر
شاعری نہیں کی جا سکتی تو شعر کہے ہے

فائدہ ؟ لہ

"پیلی کرن کا بوجھ" کے سرنامے پر معین تبسم کا یہ شعر درج ہے۔

میں رو پڑا ہوں تبسم سیاہ راتوں میں
غروبِ ماہ میں شاید زوال میرا تھا

جس سے محسوس ہوتا ہے کہ ذات کا کرب اپنی پوری تہہ داریوں کے ساتھ ان کی شاعری کا جزو بن گیا تھا۔ معین تبسم کی شخصیت، شاعری اور واردات قلبی کی بھرپوری کا سبب اس شعر سے ہوتی ہے۔

معین تبسم کے متعلق 1969ء میں ہی ہمدم عالم خورشید میری نے لکھ دیا تھا کہ:

"جدید ادب جدید روح کی
Case History ہی ہے
لیکن جدید ادب کا اضطراب اور
اس کی رجیں جدید ادب کی روح
کی گہرائیوں کو چھوتی ہوئی ادب
کا روپ اختیار کرتی ہے۔ معین تبسم
جدید ادب کے اس جدید عمل

لہ۔ محمد اقبال توصیفی۔ "پیلی کرن کا بوجھ" (معین تبسم) ایک مطالعہ مشمولہ نذر معین تبسم" ص ۴۷۲، ۴۷۳۰

کی پوری نصیرت اور کامل آگہی
رکھتے ہیں ——— [1]

معنی تبسم کے تمری اظہار میں انہ صرف درد ادب
سے مکمل آگاہی ملتی ہے بلکہ نصیرت بھی عطا فرمایا ہے۔ تخلیق
میں کار کا ایک وصف دبا بیت ہے۔ معنی تبسم کا مُلام نہ صرف
جذبات کی عکاسی کرتا ہے بلکہ اظہار میں ایک خاص ترتیب
بھی ہے جو قاری کے احساس میں ایک درد پیدا کرتی ہے لیکن
سرگزشت سے بالکل علیحدہ اپنی جداگانہ سمت رکھتی ہے۔

ان کے گہرے ذہنی مطالعے، مشاہدے اور تجربات
نے انہیں جدید لفظ، نظر کی طرف مائل کیا۔ ان کا جدید لب و لہجہ
عصر حاضر کی باطنی کیفیات کا اظہار ہے۔ لیکن فلسفیانہ فکر
کو انھوں نے شعری اظہار پر مسلط ہونے نہیں دیا۔ یہی وجہ ہے کہ
ان کا مُلام روح کو تڑپاتا ہے اور فرد کو گرماتا ہے۔

معنی تبسم کی ایک مختصر نظم "ضد" ملاحظہ کیجیے جس
میں عام انگیز کیفیت کا اظہار ہوتا ہے۔

درد کے پاؤں دکھنے لگے ہیں
سانسوں کی سانس اکھڑ گئی ہے
وقت کہرا ہے لگا ہے
آخر
تم چاہتے کیا ہو
ضد اور صرف ضد ہے
تم اسے زندگی کہتے ہو — — !

---

[1] ۔ پروفیسر میر عالم نوید میری: "بیش نامہ" مشمولہ "نادیانت" ص ۸

مختصر ہونے کے باوجود یہ نظم قاری کے ذہن و دل پر
اپنا سکہ جماتی ہے اور شکلیں درد کے دکھتے ہوئے پاؤں
سامنوں کی اکھڑتی ہوئی سانس اور کراہتے وقت سے ہی رہی ہیں۔
ضد کا نتیجہ ہیں۔

"مخدوم کی موت پر" مخدوم کے انتقال کے موقع پر
کہی گئی نظم ہے جو ایک اشاریاتی نظم ہے۔ 1969ء میں مخدوم
کا انتقال ہوا جو اردو کی ترقی پسند تحریک کے علمبردار تھے اور
ادیبوں اور شاعروں کا ایک بڑا حلقہ ان کے زیر اثر تھا۔
اس کے علاوہ وہ کمیونسٹ تحریک کے بھی روح رواں تھے اور
مارکس ازم سے گہرا لگاؤ تھا۔ یہ نظم منتقل میں ہونے والی نہ
صرف سیاسی تبدیلیوں کی نشان دہی کرتی ہے بلکہ اس کا بنیادی
مقصد بھی سیاسی ہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نظم کے شائع
ہونے پر ایک بڑے گروہ نے اس کے خلاف آواز اٹھائی تھی۔
یہ ایک نئی نظم ہے اس کی بنیادی علامتیں چوراہا، راستہ،
پگڈنڈی اور جوتا ہے۔ معنی تہم نے ان علامتوں کو
ایک مخصوص سیاسی اصطلاحی معنوں میں استعمال کیا ہے
نظم اس طرح ہے۔

وہ چوراہے پر کئی بار جا چکا تھا
اور وہ چوراہے پر کئی بار جا چکا تھا
اور ہر بار ایک راستہ مڑ جاتا تھا
پھر
اس کے تمام راستے
پگڈنڈیاں بن گئے۔
اور اس کے جوتوں کو پیدل چلنا پڑا

کانٹوں پر چلے

اور

دھول پھانکے کا عذاب

جھیلے ہوں

بیت ہوں جو اپنی جانیں گنوا دیں

یہ نظم کا پہلا بند ہے جس میں جو راہے کی علامت روس کے Red Square کے لیے استعمال کی گئی ہے ۔ اس نظم کا دوسرا بند اس طرح ہے ۔

جب وارڈ روب کا نچلا خانہ

ویران ہو گیا

تو پھر وہ جو راہے کی جانب چلا

لیکن

وہاں کوئی راستہ نہ تھا

وہ لوٹنے کے لیے مڑا

تو پگڈنڈی ہی غائب ہو چکی تھی

اس کا آخری توتا

مر چکا تھا

اس نظم میں محرومی کے سیاسی نظریاتی سفر کا نہایت خوبصورتی سے احاطہ کیا گیا ۔

" پہلی کرن کا لوٹھ " پر تبصرہ کرتے ہوئے انور سدید لکھتے ہیں ۔

" ان کی نظموں میں، مجھے یاد ہے ، ماضی سے،

دور ہونے کے باوجود تو احساس

ہوتا ہے کہ شاعر کسی دوسرے

میں باہر بولتا ہے اور رہائی کے لیے
جد وجہد کر رہا ہے"[1]

انور سدید کا یہ خیال اس شعر پر بھی پوری طرح صادق آتا ہے:

اب تک کوئی رلا دے تو روشنی آئے
بہت دنوں سے لہو جم رہا ہے آنکھوں میں

یہ غم تو بہ ظاہر رات کا ہے لیکن اس میں غم کائنات کی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں۔ لہو کا ایک دائرہ جو آنکھوں میں جما ہوا ہے اور جس میں معصوم تبسم کی شخصیت پابہ جولاں ہے اور رہائی کے لیے کوشش کر رہی ہے تاکہ روشنی تک پہنچ حاصل ہو۔ اور وہ اس کوشش میں اتنے آگے نکل جاتے ہیں کہ اپنے آپ کو بھول جاتے ہیں۔ اور کہتے ہیں:

میں اپنی ذات میں لوٹا تو پھر کچھ نہ ملا
وہ ایک شخص جو روتا رہا ہے میرے لیے

اپنے آپ کو بھول جانے والی کیفیت بھی ان میں ایک عجیب پراسرار قسم کی تہہ داری کو جنم دیتی ہے۔

معصوم اقبال توصیفی لکھتے ہیں،

"کہیں کہیں معصی کی شاعری میں تجربے
یا حد سے کی پراسراریت
اور تہہ داری کا مشاہدہ
اسیں خود اپنے ماحول
میں اجنبی سا رہتا ہے"[2]

---

[1] انور سدید۔ "اوراق" ص ۳۱۸۔ ستمبر، اکتوبر ۱۹۸۱ء

[2] معصوم اقبال توصیفی "پیلی کرن کا بوجھ"۔ ایک مطالعہ، مشمولہ "پیش رفت" ۱۹۸۰ء جلد ۱ شمارہ ۵، ۶ ص ۶

شعر کا ایک اہم وصف زبان کا تخلیقی استعمال ہے۔
مغنی تبسم کے ہاں یہ وصف پوری طرح نمایاں ہے۔ مغنی تبسم
کے الفاظ میں :

"فن کار کا تجربہ تخلیقی عمل کے
دوران زبان کے اندر وقوع
پذیر ہوتا ہے۔ زبان کا تخلیقی
استعمال دراصل خود زبان کی
تخلیق ہے" [1]

ان کی ایک نظم "باز داشت" دیکھیے جس میں
انھوں نے زبان کا تخلیقی استعمال نہایت خوب صورت انداز
سے کیا ہے۔ یہ نظم ۳۱ / اکتوبر ۱۹۶۷ء کو لکھی گئی۔

رائیگاں وقت کے سناٹے میں
ایک آواز تھی ـــــ پیلی آواز
کوئی دھڑکن تھی گزشتہ دل کی
گریۂ شب کی، چمکتی آنکھیں
تاک میں تھیں کہ کہیں سے نکلے
موجِ بے خواب کوئی
بند آسیب زدہ دروازے
آپ ہی آپ کھلے ـــ بند ہوئے
حجرۂ تار میں جیسے کوئی
روح بھٹکتی ہوئی در آئی تھی
روح کب تھی وہ تری خواہش تھی

---

[1] ۔ پروفیسر مغنی تبسم، جدید اردو نظم کی لفظیات۔ مشمولہ "آواز اور آدمی" ص ۱۱۵

آگ تھی
آگ پینے کی ہوس جاگی تھی
رائیگاں وقت کے سناٹے میں

سلیمان اریب کی موت پر انھوں نے ایک نظم " وداع " کہی جو ایک شخصی مرثیہ ہے ۔ ہم کہے نیندسو رہے ہیں ، کہے جاگتے رہے ہیں ، کہے چل رہے ہیں میں نہ صرف زبان کے تخلیقی استعمال بلکہ خود زبان کی تخلیق کا عمل بھی واضح طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے ۔

ہم کس کو ڈھونڈتے ہیں
کہے ؟
اپنے آپ کو ؟
کیا ہم وہاں نہ تھے ؟
کیا ہم یہاں نہیں ہیں ؟
یہاں
رات کے تلے
دن کے غبار میں ؟
کیا وہ بھی ہم نہ تھے ؟
کیا ہم بھی وہ نہ تھا ؟
وہ کون تھا ؟
حیات کے شکر میں
اپنے ساتھ
یہاں
جس کو دو رہے ہیں ؟
ہم کس کو دو رہے ہیں
ہم کس کو قطرہ قطرہ لہو

یاد بو رہے ہیں ؟
کیسے نیند سو رہے ہیں
کیسے جاگتے رہے ہیں
کیسے چل رہے ہیں
دور سے
قریب سے
قدم قدم ؟
اٹھاکے اپنا بوجھ ہم کہاں گئے
یہاں نہیں ہیں
دیکھنا
درد کے نواح میں
افق کی سمت
لاش جا رہی ہے
کون لوگ جا رہے ہیں شام کی طرف ؟

اس نظم کو پڑھیے تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ سلیمان اریب کی موت سے کتنا بڑا خلا پیدا ہوگیا تھا۔ اور پھر یہ بھی ہے کہ اس نظم میں پوشیدہ علائم سے بھی یہ بات صاف ہو جاتا ہے کہ خود مغنی تبسم، اریب سے ذہنی طور پر کس قدر قریب تھے۔

مغنی تبسم ایک قابل قدر اور کامیاب شاعر ہیں۔ احساس کی طلسماتی کیفیت ان کی شاعری میں موجود ہے اور ساتھ ہی ساتھ ان کی نظمیں مختصر مگر جامع ہوتی ہیں جو محسوسات و تجربات کا بھرپور تاثر ہے جس کو انھوں نے نہایت کامیابی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان کی ایک نظم "آخری شام" دیکھیے۔

اب کوئی رات نہیں آئے گی
خواب ٹوٹے ہوئے لفظوں کے بکھر جائیں گے
نام آنکھوں میں ٹھہر جائیں گے
کوئی آواز نہ آئے گی نظر
کوئی چہرہ نہ سنائی دے گا
دشت قدموں کو نہیں پائیں گے
راستے لوٹ کے آجائیں گے
تو مری یاد سے آہستہ گزر

افسردگی، پژمردگی، خاموشی، اضمحلال، بے بسی، سناٹا، سنسان، مایوسی، نا امیدی، ناکامی مغنی تبسم کی شاعری کی بنیاد ہے۔

میں کیا جانوں، کون ہے سورج
کس نگری کا باسی
کیسا سرچشمہ ہے جس سے
جیون دھارا بہتی ہے
میں کیا جانوں کون ہے بادل
کیوں آوارہ پھرتا ہے
کتنے پیڑ ہرے ہوتے ہیں
کتنی کلیاں مرجھاتی ہیں
ایک نگاہ لطف سے اس کی
اس کے ایک تغافل سے
میں کیا جانوں
شب کے گہرے سناٹوں میں
کتنے تارے ٹوٹ گئے

کتنی پلکیں بھیگ چکی ہیں
صدیوں کے ملبے کو ہٹا کر دیکھو
کتنی روحیں
اپنے اپنے پنجر ڈھونڈ رہی ہیں
میں کیا جانوں کیا ہے دنیا
انسانوں کی بستی ہے یا ایک سرائے فانی ہے۔

مغنی تبسم کی شاعری میں عشق کا ایک ارضی تصوّر بھی
نمایاں ہے جو ان کی نظموں "بازدانشت"، "سمندر بہ نقشِ کفِ پا"
اور "راگ" میں واضح ہوتا ہے۔
ان کی نظم "راگ" ملاحظہ کیجیے۔

ایک ٹوٹا ہوا راگ
ایک بت ہے ٹوٹا ہوا راگ
وہ / اسے / خاموش / گا رہی تھی
وہ اسے خاموش گا رہی تھی
میں / اسے / خاموش / سُن رہا تھا
میں اسے خاموش سُن رہا تھا
پہلو میں / سناٹا تھا
اور / بدن میں / آگ
آگ بدن میں سناٹا
پہلو میں
ایک ٹوٹا ہوا راگ
جلتے جلتے / راگ / بنا / انگارہ
راگ بنا انگارہ جلتے جلتے

ایک اور نظم "شبینہ" دیکھئے۔

اندھیرے ناگ دشن دیوتا کے
سیاہی میں سیاہی میں سیاہی
گناہوں کے سفینے بادلوں سے
رواں بھیگے بدن کی بارشوں میں
کسیلا ذائقہ اجلی تپش کا تھا زباں پر
بجھا کر خواب اپنے سو گئے تھے
نیم وا بستر کی آنکھیں سن رہی تھیں
وہ سرگوشی جو باہر ہو رہی تھی
درختوں سے ہوا کچھ کہہ رہی تھی
سمندر کی کہانی تھی ——————
ہوا کیوں رو رہی تھی؟!

ان نظموں میں ایک انوکھی طرز ہے۔ وہ اپنے اظہار کے لیے نئی زبان اور نئے استعارے تلاش کرتے رہتے ہیں۔ اور نہایت کامیابی سے اپنے اظہار کو موثر بناتے ہیں۔

مظفر حنفی "پہلی کرن کا بوجھ" پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ناقدین میں محمد حسین آزاد تا
شمس الرحمٰن فاروقی سب نے
شاعری محض منھ کا ذائقہ بدلنے
کے لیے کی ایسا کبھی محسوس نہ ہوا کہ شعر
کہنا ان کے لیے ناگزیر بن گیا تھا
البتہ اس فن میں خلیل الرحمٰن اعظمی
اور وزیر آغا جیسی کچھ استثنائی

صورتیں بھی نظر آجاتی ہیں۔ لیکن
پیشِ نظر مجموعے کی نظمیں پڑھ کر
یہ احساس بھی ہیں ہوتا کہ انہیں
محض خوش وقتی اور مُنھ کا ذائقہ
تبدیل کرنے کے لیے لکھا گیا ہے۔
جگہ جگہ ان میں وہ شرارے
کھیلے۔ ہیں جو شدید تخلیقی دباؤ کے
زیرِ اثر ہی ابھر سکتے ہیں۔ ان کی
مثالیں "مخدوم کی موت پر" —
"ہزار آئینوں کی رات" — "دوری"
"ناسی سس" اور "پت جھڑ کا گیت"
میں پوری تابناکی کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔
مجموعی حیثیت سے ان کی نظموں کا یہ مجموعہ
بھی بیشتر دوسرے ناقد شعرا کے
کلام سے نکلتا ہوا ہے"[1]

مغنی تبسم کے شعری مزاج اور شخصیت کا اندازہ اس نظم سے بھی بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ یہ نظم رسالہ "زاویہ" جو اردو اکیڈمی گلبرگہ کا ترجمان ہے ڈسمبر 1976ء کو صفحہ 197 پر شائع ہوا ہے۔

ہوا:
مرا نام مجھ سے نہ کہنا
کہ اب مجھ میں سننے کی طاقت نہیں ہے

---

[1] ۔ مظفر حنفی ۔ تبصرہ ۔ پہلی کرن کا بوجھ ۔ ہماری زبان انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش یکم فروری 1981ء

جو کہنا ہو جا کر سمندر سے کہہ دو
کہ برسوں سے سنتا رہا ہے
ہزاروں ہی بے کار قصے
جو مرقوم کرتا رہا ہے
مرا نام بھی اس کی لہروں پہ لکھ دو۔۔۔!

اس نظم سے مغنی تبسم کا شعری وجدان، تجربہ اور فکر کا احساس غیر معمولی اُجاگر ہوتا ہے۔ یہی ان کا کمال ہے۔ پروفیسر شمیم حنفی اپنے مضمون "مغنی تبسم کا شہر ملال" میں لکھتے ہیں:

"بادی النظر میں ایسا لگتا ہے کہ تخلیقی
تجربوں سے ان کا رالبطہ وجدانی کم،
تجزیاتی زیادہ ہے۔ وہ اپنی
ذاتی پسند و ناپسند اور جذباتی
اصولوں کو الگ کر کے نظم میں چھپی
ہوئی کائنات تک پہنچنا چاہتے ہیں۔
اور ان کی تنقید اپنی ایک واضح
منطق اور دلیل رکھتی ہے"[1]

زندگی کی بے معنویت کا احساس جو ہمارے عہد کی شناخت ہے۔ مغنی تبسم نے اپنے اندرونی تجربوں میں سمیٹ کر جو تخلیقی سطح دی ہے وہ اندرونی لہروں کو جگا دیتی ہے ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے بھی اسی احساس کے زیر اثر Waste Land لکھی۔ ضیا جالندھری نے نظم زمستان کی ایک شام اور مغنی تبسم نے "آنکھ ملتے ہوئے" لکھی ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے:

---

[1] پروفیسر شمیم حنفی۔ "مغنی تبسم کا شہر ملال" شمولہ نذر مغنی تبسم ص۔ ۲۲۱

سنہری شب کہاں جاگی
ضعیف خواب میں لپٹے ہوئے کمرے کی تنہائی کا منظر ادھر آ ہے

ادھر نیلے جزیرے میں
کسی بیتے ہوئے دن کی
کسی بھولی ہوئی انجان خواہش نے ——
ادھر ایک ناشناسا جھیل میں رقصاں کوئی پرتو
سفینے سے ——

چمکتی ریت کی آنکھوں میں جھانکو
وہاں پاتال کی حسرت
اُگل دیتی ہیں آکر

سُن رہے ہو غم زدہ لوبوں کی پھنکاریں
لہو کی گرمیِ آزار —— یہ کس کا مقدر ہے ؟
یہ کس کے سُرخ شعلوں کا بدن ہے ؟
دریدہ بیرہن کے گل کہاں مہکے ؟

اٹھو
تم کو بلاتے ہیں وہ پیمانے
جہاں ——
زنجیر کی جھنکار سنتے ہو ؟
یہی ہے مرگِ خاموشی کا نوحہ

اس طرف دیکھو
وہاں اونچی چٹانوں سے
زمانہ رس رہا ہے

یہی وہ آسماں ہے
جس کو اپنی جیب میں لے کر چلے تھے
یہی وہ زندگی تھی

جس کو کل ہم اپنے بستر میں برہنہ چھوڑ آئے تھے ۔

اس نظم میں مغنی تبسم نے کہیں کہیں مصرعوں کو ادھورا چھوڑ کر وہ تمام باتیں کہہ دی ہیں جسے اپنے دامن میں دبا رکھا تھا
یہی احساس مغنی تبسم کی پہچان بن گئی ہے
جس کی شناخت ہمیں ان کی کئی نظموں مثلاً "نوحہ" ، "موت کا گھر" ، "آخری شام" ، "ہم اپنے نام کی زمین پر رینگتے رہے" "لفظوں کی دوکان" اور "پت جھڑ کا گیت" میں ملتی ہے ۔

کمپیوٹر کی ایجاد نے ہمارے اخلاقی سماجی اور جذباتی سہارے چھین کر نہ صرف فاصلے کم کر دیئے ہیں بلکہ دوریوں کو بھی جنم دیا ہے ۔ اور ہماری قدریں اس طرح ریزہ ریزہ ہوئیں کہ کبھی ہمارے پاؤں میں چبھنے لگتی ہیں تو کبھی پلکوں میں یہی تنہائی ہمیں مغنی تبسم کے پاس بھی ملتی ہیں ۔ نظم داماندگی میں یہی عنصر نمایاں طور پر واضح نظر آتا ہے :

وہی جھنکار پیدا کر
جگا دے ہر بن مو کو
دھڑکتا دل بنا دے
سرد لمحوں کی تھکن کو

ابھی ہم شام کے لمحے کو اپنے سامنے دفنا کے آئے ہیں
ہنسی ـــــ شاید وہ اپنے زرد پچھتاوے کی میت تھی

کسیلی دھوپ کو بھرکا تو سینے کا لہو بھی تھا
ابھی کیا ہے
ابھی قدموں کو اتنی دُور
جتنا فاصلہ آنکھوں میں باقی ہے ـــــ
سفر کرنا ہے
لمحوں سے
جو گزر رہے ہیں
گزرنا ہے

ابھی کیا ہے
ابھی تو چاک پر ڈھلنا ہے
بننا ہے ـــــ بگڑنا ہے

ہٹا زنجیر کا پہرہ
وہی بھنکار پیدا کر
مرا پردہ اٹھا دے
رات بن جائیں گے ہم
بستر لگا دے

ان کی ایک اور نظم "برات" میں بھی ہمیں یہی احساس تنہائی اور قدروں کی شکست ملتی ہیں۔

ہم اپنے مقتل میں
نیزوں پر اپنا سر اُچھالیں گے

تب آسمان روئے گا
اور کئی ندیاں ـــــ کالی، پیلی اور لال، بہہ نکلیں گی
ایک سیلاب اٹھے گا بورات کو بہالے جائے گا
پھر کوئی ہم سے یہ ہنس کے گا رات کا بوجھ سہا نہ سکے

معصف اقبال توصیفی لکھتے ہیں:

"اپنے عہد کی جستی تصویروں میں
مغنی نے جو رنگ آمیزی کی ہے
وہ انھیں جدید اردو شاعری
میں ایک منفرد مقام عطا کرتی ہے
ان کی انفرادی فکر اور تجربوں نے
احساس کو آب گینوں میں جو
پگھلا ہوا سیسہ بھر دیا ہے۔ ان
کی نظموں کے اختصار کے حسن،
استعارے کی زبان اور اظہار
کے نئے سانچوں کی تلاش نے
انھیں جس موڑ پر پہنچا دیا ہے
وہاں سے فن تکمیل کی منزل صاف
نظر آتی ہے، وہ فن تکمیل جس
کی ہر شاعر تمنا کرتا ہے"[1]

مغنی تبسم کی کم گوئی ان کی نظموں میں بھی ملتی ہے۔ "پیلی کرن کا بوجھ" کے آخری صفحات پر دس مختصر نظمیں ہیں جو کہیں کہیں ایک دو مصرعوں پر بھی مشتمل ہیں۔

۱۔ معصف اقبال توصیفی "پیلی کرن کا بوجھ (مغنی تبسم) ایک مطالعہ مشمولہ۔ نذر مغنی تبسم ص۔۱۸۴

ان مختصر نظموں میں ایسے لطیف پیرائے میں استعارے ملتے ہیں جو اندرونی بحرانوں بیرونی اشیا اور اپنے گردوپیش کو اس طرح سمیٹ لیا ہے کہ ایک نئی وحدت شاعر کے جذبات واحساسات کو میرآتی ہے - یہی اثر ان دس مختصر نظموں میں ملتا ہے -

۱

راستے وہاں جاتے ہیں
جہاں کوئی نہیں جاتا

۲

کیا آج بھی کوئی دن ہے ؟
کوئی تاریخ ہے ؟
یا خدا !

۳

بڑی گڑبڑ ہے
مرض اور علاج میں پہچان مشکل ہوگئی ہے

۴

کھلونا ٹوٹ گیا ہے
اسے کس دن کریں

۵

رات کی چادر میں کتنے سوراخ ہیں

کتے دن ہیں

۶

پھر وہ اپنے گھروں کو لوٹ گئے

۷

خوش نصیب ہیں وہ بستر - - -

۸

شیطان سے ہاتھ ملانا ہی پڑے گا

۹

دیواریں کھل گئیں
دروازے بند کرو

۱۰

سناٹے رو رہے ہیں

پروفیسر شمیم حنفی نے مغنی تبسم کی شاعرانہ عظمت کے گن اس طرح گائے ہیں:

"مغنی اپنی شاعری میں جن واردات
کا، دھیان کی جن ڈوبتی ابھرتی
لہروں کا، جس طرح کی ذہنی اور
جذباتی کیفیتوں کا بیان کرتے ہیں
وہ کبھی کبھی اپنی آمد کا اعلان

ہنسیا کرتیں - یہ واردات اور
کیفیتیں چاند کی طرح زمین پر اترتی ہیں،
اتنی آہستگی کے ساتھ کہ ان سے
ہمیں اپنے رابطے کا احساس اس وقت
ہوتا ہے جب وہ ہمارے شعور
میں اپنی جگہ بنا چکی ہوتی ہیں" [1]

نظموں کے علاوہ مغنی تبسم کا ایک گیت بھی ملتا ہے جو ۸/مارچ
۱۹۶۵ء کے رفتارِ سیاست ولیکلی میں شائع ہوا یہاں
وہ گیت درج کیا جارہا ہے

آئے، آئے

سندر سپنوں کی دنیا سے
پاگل آشاؤں کی پھلجھڑی چھایا سے من کی بگیا سے
کل تک جو اپنے کھتے بن کر آج وہی بیگانے آئے

چاروں اور ہے رین اندھیاری
مرے جیون کی کٹیا میں
پھر ایک دیپ جلانے آئے
پریم روپ دکھانے آئے

میں وہ بین کہاں سے لاؤں
سوکھ گئے دو ساگر گہرے
چرنوں میں کیا بھینٹ چڑھاؤں
ٹوٹ گئے موتی اسون کے
سوئے بھاگ اس کے

---

[1] - پروفیسر شمیم حنفی - مغنی تبسم کا شہر ملال - مشمولہ نذر مغنی تبسم
ص ۴۴۰

جس کی نیند چرانے آئے
میں وہ بھاگ کہاں سے لاؤں
میں وہ آگ کہاں سے لاؤں
تم جو آگ بجھانے آئے
جاؤ ، جاؤ
جاؤ ، بھولی بسری یادوں کے گہوارے میں سو جاؤ

اس گیت کو دیکھ کر یہ محسوس ہوتا ہے مغنی تبسم نے ہندی کے مدھر شبدھوں کو نہایت خوب صورتی سے استعمال کیا اور خاص بات یہ ہے کہ ہندی لفظیات سے انھوں نے بڑی خوب صورت علامتیں تراش کر اپنے اظہار کو قوت بخشی۔ سندر سپنوں کی دنیا، پاگل آشاؤں کی چھلتی چھایا، من کی بگیا، جیون کی کٹیا، اسون کے موتی، بھولی بسری یادوں کا گہوارہ جیسے خوب صورت علامتوں اور دل پر اثر کرنے والے استعاروں نے ایک عجیب کیفیت پیدا کر دی ہے۔ ان کی ایک اور نظم "پیلی کرن کا بوجھ" میں شامل ہے جس کا عنوان ہے پت جھڑ کا گیت اس میں بھی ہندی الفاظ نہایت چابکدستی سے استعمال ہوئے ہیں۔ سپنے، پاگل رت، پت جھڑ کا راگ، رین بھی ہندی الفاظ کے برجستہ اور موزوں استعمال سے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ مغنی تبسم کا تخلیقی جوہر ہندی کے سبک الفاظ کے استعمال پر بھی قادر ہے۔ کہا جاتا ہے کہ تخلیق اپنے ہیئت اور الفاظ اپنے ساتھ لاتی ہے یہاں یہ بات پوری طرح صادق آتی ہے تخلیق کی جس لہر کے تحت مغنی تبسم نے یہ نظمیں لکھی ہیں شاید ان الفاظ کا استعمال مغنی تبسم کے لیے ناگزیر ہو گیا تھا ساتھ ہی یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ انھیں ہندی پر بھی عبور حاصل ہے۔

مغنی تبسم کا تیسرا مجموعہ کلام " مٹی مٹی میرا دل " ہر
زاویہ سے قابلِ قدر ہے۔ یہ مجموعہ صرف غزلوں پر مشتمل ہیں۔
پہلی بار یہ مجموعہ مئی 1991ء کو شائع ہوا جس میں (۴۶)
غزلیں شامل تھیں۔ انھوں نے اس مجموعہ کو برادرِ عزیز محمد عبدالمعطی
مرحوم کے نام معنون کیا تھا۔ دوسری بار یہ مجموعہ نئی غزلوں کے
اضافے کے ساتھ اکتوبر ۲۰۰۱ء میں شائع ہوا۔ اس بار اس
مجموعے کو انھوں نے اقبال متین اور شہریار کے نام معنون کیا ہے۔
اس مجموعے میں انھوں نے (۱۶) غزلوں کا اضافہ کیا ہے اس
طرح اس مجموعے میں جملہ (۶۲) غزلیں شائع ہوئی ہیں۔ ہندی
پرچار سبھا کی جانب سے بھی اس مجموعہ کو سوادھین نے ہندی میں
مرتب کیا ہے جو " دکن کے شاعر مٹی مٹی میرا دل " کے نام سے
۲۰۰۲ء میں شائع ہوا ہے۔ اس کتاب کی رسم اجرا ۸/مارچ ۲۰۰۲ کو بدست
شیو۔ کے کمار انجام پائی۔

" مٹی مٹی میرا دل " مغنی تبسم کی شاعری، شخصیت اور
اُن کی مخصوص طرزِ فکر کو نمایاں طور پر پیش کرتا ہے۔ مغنی تبسم کے
اس مجموعے میں بھی وہی کیفیت نمایاں ہے جن کے لیے غالبؔ نے کہا ہے۔

" شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے "

غالبؔ کی طرح مغنی تبسم بھی جب اپنا مجموعہ ترتیب دیا تو بے حد
کڑے انتخاب سے کام لیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی بہت سی غزلیں
اس انتخاب میں جگہ نہ پاسکیں۔ " مٹی مٹی میرا دل " کی دوسری بار
اشاعت کے اس مجموعے میں صرف ایک غزل ایسی ہیں جن میں
(۱۰) شعر ہیں۔ پانچ غزلیں ایسی ہیں جن میں (9) شعر ہیں۔
پانچ غزلیں ایسی ہیں جن میں (۷) شعر ہیں۔ دس غزلیں ایسی ہیں
جن میں (۶) شعر ہیں۔ سب سے زیادہ تعداد میں چوبیس غزلیں

ایسی ہیں جن پانچ شعر ہیں۔ گیارہ غزلیں ایسی ہیں جن میں چار شعر ہیں۔ چار غزلیں ایسی ہیں جن میں تین شعر ہیں دو غزلیں ایسی بھی ہیں جن میں صرف دو شعر ہیں۔ اس طرح یہ ثابت ہوگیا کہ مٹی مٹی مرا دل میں مختصر ترین غزلیں شامل ہیں۔ جس سے مغنی تبسم کی کم گوئی واضح ہوتی ہے۔ اس مجموعے میں مغنی تبسم کا من اپنے عروج پر نظر آتا ہے۔ اس مجموعے میں کوئی پیش لفظ یا مقدمہ نہیں ہے۔ آپ کی غزلوں کے بیشتر اشعار ذہن کو سیرابی اور دل کو بہت نزدیک محسوس ہوتے ہوئے نمی اور نرمی عطا کرتے ہیں۔ مغنی تبسم کی خاص خوبی یہ ہے کہ انھوں نے کبھی کسی بات کو کہنے کے لیے درازی انداز اختیار نہیں کیا۔ یہ حقیقت ہے کہ وہ زندگی میں بہت شاہ خرچ ثابت ہوئے ہیں لیکن انھوں نے لفظوں کے استعمال میں کفایت لفظی اختیار کی ہے۔ بے ہودہ یا بھرتی کے کلام سے انھوں نے ہمیشہ کنارہ کشی اختیار کی ہے۔ یہی وجہ ہیکہ ایسے اشعار جو مغنی تبسم کے نزدیک بھرتی یا حشو کے کہے جا سکتے تھے انھوں نے اپنے مجموعے میں جگہ نہ دی۔

پروفیسر شمیم حنفی نے مغنی تبسم کی شاعری کو شہر ملال کی شاعری کہتے ہیں:

"مغنی تبسم کی شاعری کا آہنگ دھیما
اور لہجہ سرگوشی کا ہے۔ یہ شاعری
ہمارے احساسات کو دھیرے دھیرے
منور کرتی ہے اسی لیے یہ شاعری
نہ تو ہماری سماعت پر بوجھ بنتی ہے،
نہ ہمارے لیے اچانک رونما ہونے
والی واردات بنتی ہے۔ اپنائیت

کی ایک زیریں کیفیت ان کے اشعار
سے بہ تدریج نمودار ہوتی ہے اور
بہت خاموشی کے ساتھ ہمیں اپنی
گرفت میں لیتی جاتی ہے"[1]

جو رکھ رکھاؤ، آہستگی، شائستگی اور پروقار انداز مغنی تبسم کی شخصیت کا پرتو ہے وہی ان کے کلام میں بھی موجود ہے یہی کفایت جو ان کے اظہار کا فن ہے۔ مغنی تبسم کی شخصیت کا وصف ہے۔ یہ شعر ملاحظہ فرمائیے۔

فرصتِ عمر ہے کم، حرفِ تمنا سن لو
بات شکوؤں کی نہ پوچھو کہ وہ دفتر ہے الگ

اس شعر میں مغنی تبسم کہتے ہیں کہ شکوؤں کے لیے تو دفتر موجود ہے لیکن فرصتِ عمر کم ہونے کا احساس ہونے کے بعد "حرف" کا استعمال کم سے کم لفظوں میں تمنا کے اظہار کے لیے کیا گیا ہے۔ یہاں مغنی تبسم "حرفِ تمنا" کہہ کر اختصار کی انتہا کر دی۔

مومن نے کہا تھا:

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

تنہائی کا یہ تخلیقی استعمال غالب کو اس قدر چونکا دیتا ہے کہ وہ اپنا سارا دیوان مومن کو دینا چاہتے تھے۔ عجب نہیں کہ غالب شناس اس بات کو غلط ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا ہو۔ مغنی تبسم کا یہ شعر دیکھیے۔

---

[1] پروفیسر شمیم حنفی۔ مغنی تبسم کا شہر ملال۔ مشمولہ نذر مغنی تبسم ص۔ ۴۴۰

سونپ دی ہے اسے تنہائی بھی
اب مجھے میری ضرورت نہ رہی

مغنی تبسم کی زندگی مختلف حوادث کا شکار ہوتی رہی ہے
یہی وجہ ہے کہ ان کی اپنی ذات کا کرب شاعری میں داخل ہوا ہے۔
تنہائی کا کرب ایک ایسا مسئلہ ہے جو ایک ذہین اور دانشورانہ
مزاج رکھنے والے فنکار کو بے چین رکھتا ہے۔ مغنی تبسم نہ صرف
کرب و بلا سے گزر رہے ہیں بلکہ رنج و الم کی بھٹی میں تپے بھی ہیں۔
یہی وجہ ہے کہ باطنی احساسات اور جذبات کی شدت نے ان کی
شاعری کو چار چاند لگا دیا ہے۔ زندگی کے درد انگیز واقعات
ان کی شاعری میں اس قدر گھل گئے ہیں کہ انھیں علیحدہ کرنا ممکن
نہیں۔ چند اشعار دیکھیے ؎

بے معنی سا لگتا ہے گھر جانا بھی
دیوار و در سے ٹکرانا، مر جانا بھی

رستہ تکتے رہنا ساری رات کبھی
آہٹ سن کر قدموں کی ڈر جانا بھی

بادل اب جو کھیل تماشے کرتا ہے
اس نے میری ناؤ ڈبو کر جانا بھی

اسم مری پہچان کو کھوتے جاتے ہیں۔
مشکل ہے لفظوں سے باہر جانا بھی

مندرجہ ذیل غزل میں مغنی تبسّم بے بسی، بے زاری
اور مایوسی کا مداوا خدا کی ذات میں تلاش کرتے ہیں ملاحظہ ہو:

سفر دیا ہے تو منزل کا بھی پتہ دے گا
مرا خدا مجھے رستہ کوئی دکھا دے گا
قدم قدم پہ دکھائے گا آئینیں اپنی
ہر ایک موڑ پہ منظر مجھے نیا دے گا
لپیٹ دے گا مجھے ظلمتوں کی چادر میں
پھر اک چراغ مری راہ میں جلا دے گا
بڑھا کے دل میں کسی انتظار کی لذت
نظر کے واسطے تاروں کا سلسلہ دے گا
رکھے گا مجھ کو سدا جبر کی پناہوں میں
جو خواب دیکھنے لگ جاؤں تو جگا دے گا
زمیں کی پیاس بڑھائے گا آگ برسا کر
لہو کو حرفِ صداقت کا واسطہ دے گا
کرم کیا کہ عطا کی گناہ کی توفیق!
کرم کرے گا گناہوں کا جب صلہ دے گا

پروفیسر شمیم حنفی اس طرح رقمطراز ہیں:

"اصل میں مغنی مشاہدات اور
واقعات کی بہ جائے کیفیتوں کے
شاعر ہیں۔ چنانچہ اپنے تجربوں تک
رسائی کے لیے انہیں واسطہ اختیار
کرنا پڑتا ہے وہ باہر کی دنیا کی بہ جائے
اس دنیا میں گھری ہوئی، پھر بھی
اس کے علائق سے تقریباً آزاد"

آپ اپنی ہستی کا ہے۔ ایک گہری
خود رفتگی اور داخلی سطح پر
دنیا سے لاتعلقی کے احساس نے
ان شعروں کی غنائیت محفوظ رکھی ہے
اور اس پر گرد و پیش کے شور
شرابے کو اثر انداز ہونے
دیا ہے"[1]

پروفیسر شمیم حنفی، مغنی تبسم کی افسردگی کی گہری کیفیت کو نامرکاظمی اور فراق سے جوڑتے ہیں۔ اور مضطر مجاز "مٹی مٹی میرا دل" پر تبصرہ کرتے ہوئے مغنی تبسم کے فن کو فانی کے فن سے قریب محسوس کرتے ہیں۔ اور اس سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا۔ مغنی تبسم نے فانی کی شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے فانی کے ہاں موضوعاتی نظام کو جدید علم لسانیات کی روشنی میں واضح کرنے کی کوشش کی تھی اور اس بات کا امکان ہے کہ جس انداز سے انھوں نے فانی کا تجزیہ کیا ہو اس کا اثر ان کی شاعری میں در آیا ہو۔ لیکن مغنی تبسم کی شاعری اپنی انفرادی کیفیت کی حامل ہے۔ ان کی شاعری میں ان کی زندگی پوشیدہ ہے۔ ان کی شاعری میں جو افسردگی، اداسی، احساس کی تنہائی، کرب، مجبوری کا بیان اور دردمندی ہے وہ ان کی اپنی زندگی میں در آئے واقعات کا اظہار ہے۔ جو تخلیقی سطح پر جاری و ساری ہے۔ اور اکناف و اطراف کی دنیا سے بے خبر اسی صورت حال کے ادراک سے تعلق رکھتی ہے۔

---

[1] پروفیسر شمیم حنفی۔ مغنی تبسم کا شہر ملال۔ مشمولہ "نذر مغنی تبسم" ص ۴۴۳

چند اشعار ملاحظہ ہوں :

ایک اک پیڑ اکھڑتا دیکھا
زور جنگل میں ہوا کا دیکھا
پاس آتے ہوئے صحرا میں کہیں
دور جاتا ہوا دریا دیکھا
اس کو جاتا ہوا دیکھا گھر سے
رنگ دنیا کا بدلتا دیکھا
راحتِ خواب گئی آنکھوں سے
خواب آنکھوں نے یہ کیا دیکھا

حالی نے "مقدمہ شعر و شاعری" میں شاعری کے تعلق سے جو رائے دی ہے اس کا تذکرہ بے جا نہ ہوگا وہ کہتے ہیں :

"یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ دنیا
میں جتنے شاعر استاد مانے گئے ہیں
ان میں ایک ایسا نہ نکلے گا
جس کا تمام کلام اول سے آخر
تک حسن لطافت کے اعلیٰ درجہ
پر واقع ہوا ہو۔ کیونکہ یہ خاصیت
صرف خدا ہی کے کلام میں ہو سکتا ہے۔
شاعری کی معراجِ کمال یہ ہے کہ اس
کا عام کمال ہموار اور اصول
کے موافق ہو اور کہیں کہیں
اس میں ایسا حیرت انگیز جلوہ
نظر آئے جس سے شاعر کا کمال
خاص و عام کے دلوں پر نقش

ہو جائے البتہ اتنی بات ہے کہ
اس کے عام اشعار بھی خاص
خاص اشخاص کے دل پر خاص
خاص حالتوں میں تقریباً ایسا
ہی اثر کرے جیسا کہ اس کا خاص
کلام ہر شخص کے دل پر ہر حالت
میں اثر کرتا ہے اور یہ بات
اُسی شاعر کے کلام میں پائی جا سکتی ہے
جس کا کلام سادہ اور نیچرل ہو" [1]

جہاں تک مغنی تبسم کی شاعری کا تعلق ہے اُن کے کلام میں ایسے حیرت انگیز جوے اکثر نظر آتے ہیں جس طرح بعض اوقات سمندر کی سطح دیکھیے. میں معمولی اور بے شور و شر نظر آتی ہے لیکن اس کی تہہ میں ہزاروں لہریں موجزن ہوتی ہیں اور ایک کھلبلی مچائے رکھتی ہے بالکل اسی طرح اگر مغنی تبسم کے اشعار، ملائم دھیمے، سلیس اور سادہ ہوتے ہیں لیکن ان کے پس پردہ غضب کا جوش اور درد پوشیدہ ہوتا ہے۔ الفاظ کی سلاست اور ترکیب بیان کی سادگی لوگوں کو اکثر دھوکہ دیتی ہے اور وہ ان پر سے بے خبر گذر جاتے ہیں اور یہ نہیں دیکھتے کہ شاعر نے ان سلیس لفظوں اور معمولی ترکیبوں میں کیسے زہر چھپا رکھے ہیں ؎

اب آ کے کوئی جلا دے تو روشنی آئے
بہت دنوں سے لہو جم رہا ہے آنکھوں میں

---

[1] ۔ خواجہ الطاف حسین حالی۔ "مقدمہ شعر و شاعری"۔ ص ۷۳، ۷۴

سرِ افق سے نظر لوٹ کر نہیں آئی
وہ جا چکا تھا مگر انتظار کیسا تھا

برس رہی تھی جہنم کی آگ صحرا میں
مگر وہ ایک شجر سایہ دار کیسا تھا

منظر ٹھہر گیا ہے کوئی دل میں آن کر
دنیا کے ساتھ اس کو بدلنا نہیں ہے اب

جو سونے کے وہ آنکھوں میں
جو ٹوٹ گئی وہ نیند تو ہے

سونپ دی ہے اسے تنہائی بھی
اب مجھے اپنی ضرورت نہ رہی

زندگی کر کے یہ احساس ہوا
زخم کیسے بھی ہوں بھر جاتے ہیں

یہ حسرت ہے کہوں میں دوستوں سے
ہوئی اب شام گھر جانا ہے مجھ کو

اتنا ضرور ہے کہ میراجی اور ن۔م۔راشد
مغنی تبسم کے محبوب شاعر رہے ہیں اور ان کے اثرات مغنی تبسم
کی شاعری میں واضح طور پر محسوس بھی کیے جا سکتے ہیں لیکن میراجی
کی شاعری نفسیاتی الجھنوں سے دوچار ہے اور بنیں لاقوامی

سیاسی منظرنامے کا حصّہ ن۔م۔ راشد۔ ان دونوں سے جدا
صنفی تبصم کا معاملہ ہے۔ انھوں نے نہ تو نفسیاتی پریشانیوں کو
اپنی شاعری میں جگہ دی اور نہ ہی بین الاقوامی سیاست ان پر
اثر کر سکی۔ ان کے ہاں صرف فرد اور اس کی انفرادیت کا منظر
جگہ پا سکے۔ کیونکہ ان کی شاعری کا مرکز ہی فرد ہے جو زندگی
سے متعلق اپنے تصورات، خیالات، احساسات، جذبات
اور اظہار میں مکمل طور پر آزاد ہے۔

ہرومندر رحمت یوسف زئی کہتے ہیں،

"انگریزی میں ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ
کو "نقاد شاعر" کے نام سے یاد
کیا جاتا ہے کیوں کہ ایک طرف
اس نے نظریاتی اعتبار سے
انگریزی نقد و نظر کو نئی قوت
دی اور دوسری طرف اپنی شاعری
کے ذریعے انگریزی زبان و ادب
کو تخلیق کی نئی جہتوں سے آشنا
کرایا۔ اردو میں وہی مقام
صنفی تبصم کا کہا جا سکتا ہے۔
جنھوں نے جدید تنقیدی نظریات
کو وضاحت کے ساتھ پیش کر کے
شاعرین ادب کو فکر کی طرف
مائل کیا اور ساتھ ہی اپنی شاعری
کے واسطے سے اردو شعر و ادب
کے تخلیقی سفر کے لیے نئی راہیں

متعین کیں۔ اس اعتبار سے
معنی تبسم کو ہندوستان میں
اُردو کا لقادر شاعر" کہا
جائے تو مبالغہ نہ ہوگا"[1]

اور حقیقت بھی یہی ہے کہ اُردو نثر و ادب میں جدیدیت کی جڑیں مضبوط کرنے والے ناقدین میں معنی تبسم سرِفہرست ہیں۔ انھوں نے اپنے جدید طرزِ اظہار سے ایک نسل کو متاثر کیا۔ حیدرآباد کے نوجوان شعرا کو جدید طرزِ فکر کی طرف راغب کرنے کا سہرا معنی تبسم ہی کو جاتا ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر امتیاز اللہ اس طرح رقمطراز ہیں:

"معنی تبسم کی شاعری اس معنی میں
ہمارا بڑا اہم سرمایہ ہے کہ
وہ جدیدیت کے اہم شاعر ہونے
کے باوجود سہل ممتنع کے
شاعر ہیں اور ان کی شاعری بہت
سے ایسے سوالوں کا جواب دیتی ہے
جو نئے پن کے زعم میں خود
جدیدیوں نے اٹھائے تھے"[2]

"مٹی مٹی میرا دل" کے تعلق سے حمید حامل کہتے ہیں:

"پروفیسر معنی تبسم کی شاعری کو "مٹی
مٹی میرا دل" کے شعری مجموعے کے
ذریعے منظرِ عام پر آئی ہے

---

[1] ۔ پروفیسر رحمت یوسف زئی۔ "معنی تبسم کا شعری سفر" مشمولہ نذرِ معنی تبسم ص ۴۶۵

[2] ۔ ڈاکٹر امتیاز اللہ۔ "معنی تبسم۔ ایک جدید شاعر" مشمولہ نذرِ معنی تبسم ص ۴۷۱

ایلیٹ کے خیال کی غمازی دکھائی
دیتی ہے کہ سچی اور حقیقی شاعری
سمجھ میں آنے سے پہلے معنی کی ترسیل
کر سکتی ہے۔ چوں کہ ہر مصرعہ تمام
غزل کے مقام اور اس کے مرتبے کو
ملحوظ رکھتے ہیں ان کا جدید انداز
اظہار خصوصیت کے ساتھ غزل کو
تمام لوازمات کے ساتھ پیش
کرتا ہے"[1]

شاعری کا جدید انداز مندرجہ ذیل اشعار میں ملاحظہ کیجیے۔

سرخی رنگ شفق پر مت بھول
رات ہو جائیں ہرے بھی تو نہ جا
اب کہاں سات سمندر تو نکھیں
آنچ دامن سے اٹھے بھی تو نہ جا

"مٹی مٹی میرا دل" کے تعلق سے اقبال متین نے اپنا
ایک تاثر اس طرح پیش کیا ہے۔

"شعر کے تعلق سے میں کچھ اس طرح
سوچتا ہوں کہ وہ شاعری جو
احساسات اور جذبات کو جھنجھوڑ
کر صرف برانگیختہ کر دیتی ہے
وہ ذہن و دل پر دیرپا ارتسامات
کی اہلیت نہیں رکھتی۔ بلکہ وہ شاعری

---

[1] حمید کامل۔ "مٹی مٹی میرا دل" کا شعر مجموعہ "سرحد آخر ہے" مشمولہ نذر معنی تبسم
ص۔ ۱۰۵

بڑی نرم روی سے آپ کے اندر
اُتر کر آپ کو بھی اپنے ساتھ باہر
للا کر اس طرح بکھیرتی رہتے کہ
آپ خود کو، ریزہ ریزہ،
کنکر کنکر ڈھونڈتے پھریں
اہم بھی ہے اور بڑی شاعری کے
امکانات سے پُر بھی۔ وہیں بھی
مغنی پیرے ہی شعر کہتے ہیں وہ
جو میں کہتا ہوں اور کہہ سکتا ہوں
وہ تو میں کہتا ہی ہوں لیکن وہ
شعر جو میں تڑپ تڑپ کر
بھی نہیں کہہ سکتا وہ مغنی
کہہ جاتے ہیں۔ ایسا شاعر بولنے
پڑھنے والوں کو شعر کہتا ہے،
میرے نزدیک وہ بڑا شاعر ہے"[1]
امتیاز میتھ کے تاثرات کے پیشِ نظر یہ اشعار ڈھل جاتے ہیں۔

گرنا ہی ہے اور سنبھلنا نہیں ہے اب
بیچے ہیں وہ گزار پہ چلنا نہیں ہے اب

یہ عجب کھیل ہے اک نقش بنا دے
اور اس نقش کو پھر خود ہی مٹا دے

---

[1] ۔ امتیاز میتھ (ایک تاثر) "مٹی مٹی میرا دل" روزنامہ سیاست
۱۱/ جون ۲۰۰۱ء

خیالوں کا جہاں آباد کر لیں
خلوصِ رفتگاں کو یاد کر لیں

اجی حال پہ چھوڑ، دلاسا رہنے دے
غم ہی اچھا لگتا ہے سہہ جانے دے

ملنا سفر کا اور بچھڑنا سفر کا ہے
دنیا تو رہ گزار ہے، محفل نہ کہہ اسے

مغنی تبسم کے ہاں ایسی غزلیں بہت کم ملتی ہیں جن کی بحریں طویل ہوتی ہیں انھوں نے چھوٹی چھوٹی بحروں سے دل کو چھو لینے والے اشعار نکالے ہیں۔

دل کی لگی رہ جائے گی
کوئی کمی رہ جائے گی

درد کے پھیلے سایوں میں
تنہائی رہ جائے گی

وقت کسی پر گزرا ہے
وقت کسی نے گزارا ہے

لب اتنی ہے اپنی کہانی
آگ، ہوا، مٹی اور پانی

بھر آئے آنکھوں میں آنسو
یاد آئی اک بات پرانی

مٹی مٹی میرا دل
مٹی میں ہے تیرا گھر

مغنی تبسم کی غزلوں میں جو سرخی ہے وہ غازہ
یا ساغر مینا کی کرامات نہیں بلکہ ان کے اندرونی جذبے اور
احساسات کا وہ فونِ حیات ہے جو ان کے رگ وپے میں
جاری و ساری ہے ان کی شاعری سیدھی سادی سی دل سے نکلنے
والی ایک درد بھری آواز ہے جو دل سے نکل کر دل میں
جا بیٹھتی ہے ؎

چھپا رکھا تھا یوں تو کو کمال میرا تھا
کسی پہ کھل نہیں پایا جو حال میرا تھا

"مغنی تبسم" شاعری کے آئینے میں" مضطر مجاز
یوں رقم طراز ہیں

"مغنی صاحب اپنی شخصیت کی طرح
اپنی غزل کو بھی نک سک سے سنوارتے ہیں
لیکن ان کی غزل کے چہرے پر
جو تازگی اور سرخی ہے وہ
"غازہ یا ساغر و مینا کی کرامات"
نہیں بلکہ جذبے اور احساس کا
وہ فونِ حیات ہے جو اس
کی رگ وپے میں رواں
دواں ہے، مطلب یہ کہ اس کے

میں بڑوں " سے زیادہ "دروں " کی
کارفرمائی ہے - اگرچہ لفظ کو
سدھائے بغیر شاعری کی گاڑی
چل نہیں سکتی لیکن یہ بھی ایک بڑا
دلچسپ قولِ محال ہے کہ جہاں قادر
الکلامی شاعری کی دشمن بھی ہے -
مغنی صاحب کا شمار اساتذۂ سخن
میں ہوتا ہے کہ انھوں نے من اور زبان
کے چونچلوں کو اپنے اوپر مسلط
ہونے نہیں دیا بلکہ کہیں کہیں من امد
زبان کے چونچلوں کو اپنے اوپر مسلط
ہونے نہیں دیا بلکہ کہیں کہیں فن اور
زبان کے اصولوں سے انحراف
بھی برتا ہے جو بے خبری نہیں بلکہ
جذبے اور احساس سے وفاداری
کی مجبوری ہے "[1]

ان کے یہ اشعار بھی ملاحظہ ہوں -

یوں لگتا ہے سب کچھ کھونے آیا تھا
میں اس گھر میں تجھ کو رونے آیا تھا

---

[1] - مضطر مجاز - مغنی تبسم : شاعری کے آئینے میں - روزنامہ منصف ۲۸ / فروری ۱۹۹۹ء

جلانے والے یادوں کے دیے اب
چراغِ جاں بجھا کر سو گئے ہیں

ہر سو دے ہر زیاں سے گزرے
کس دل سے غمِ جہاں سے گزرے

وقت جیسے ٹھہر گیا ہے کہیں
گردشِ ماہ و سال سے گزرے

زندگی اور تو کیا دیتی ہے
غم کی میعاد بڑھا دیتی ہے

خواب، سفر اور تلاش مغنی تبسم کے خاص استعارے ہیں۔ ان کا قلم بلندی پر چڑھتا ہوا ہے جسے صوفیا کی اصطلاح میں "صعود" کہتے ہیں۔ وہ بھی صوفی اور شاعر دونوں اپنی ارتقائی منزلوں میں ہم راہ ہو جاتے ہیں۔

سفر دیا ہے تو منزل کا بھی پتہ دے گا
مرا خدا مجھے رستہ کوئی دکھا دے گا

اک عہدِ وصال چار سو ہے
اور دردِ فراق کو بہ کو ہے

رستہ ہے سخن کا بند تجھ سے
اب اپنے خدا سے گفتگو ہے

ہم کیا اور ہمارا کیا ہے
باقی اللہ ، باقی فانی !

قدم قدم پہ دکھائے گا آبتیں اپنی
ہر ایک موڑ پہ منظر مجھے نیا دے گا

مغنی تبسم کی شاعری کا ایک اہم وصف ان کی امیجری ہے
انھوں نے اپنی امیجری کے پیش نظر مناظرِ فطرت سے بہت کام لیا ہے
جس کی وجہ سے ان کی غزل فطرت کی بوقلمونی اور رنگا رنگی سے
معمور ہوکر فطرت ہی کی طرح قدر لواز ہوگئی ہے ۔

آسماں پر ہے عجب چاند ستاروں کا سماں
دل میں دیکھو تو رات کا منظر ہے الگ

چاند ابھی تو نکلا ہی تھا کیسے ڈوب گیا
میرے آنگن میں یہ کالی رات کہاں سے آئی

شام کا تارہ نجم سحر
دونوں ترے پیماں پر

دھوپ آتی ہے تو کچھ ڈھونڈ کے رہ جاتی ہے
چاندنی درد بچھا دیتی ہے پھر آنگن میں

تنہائی تخلیقی فن کار کا ایک قیمتی اثاثہ
ہوتا ہے ۔ لیکن یہ تنہائی اس وقت ناپید ہو جاتی ہے جب تخلیق کار
کو خود کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی ۔ کوئی عجب نہیں کہ زندگی کے اس

سنیٹا و فراغ کا گہرا اثر تخلیق پر پڑے ۔ یہ شعر دیکھیے ۔

لوٹ کر شام کو طائر سارے
جانے کیوں اپنے ہی گھر جاتے ہیں

اسی طرح ایک اور شعر دیکھیے ۔

یوں لگتا ہے سب کچھ کھونے آیا تھا
میں اس گھر میں تجھ کو رونے آیا تھا

اس شعر میں لفظ گھر بے حد اہمیت کا حامل ہے ۔
پرندے لوٹ کر اپنے گھروں کو جاتے ہیں ۔ کیوں کہ ان کا اپنا گھر ہے
دن بھر تلاش معاش کے بعد گھر اس لیے لوٹتے ہیں کہ سکون حاصل
کیا جائے ۔ لیکن جب گھر میں انتظار کرنے والا کوئی نہ ہو اور
اس گھر سے جڑی ہوئی یادیں کاٹنے کو دوڑ رہی ہو تو گھر کا مفہوم
ہی خبط ہو جاتا ہے ۔ اس صورت میں حیرت اس بات پر
ہوتی ہے کہ یہ سارے پرندے آخر کیوں لوٹ کر گھروں کو جاتے
ہوں گے ۔

زندگی کی تاریک گزرگاہوں میں یادیں سرمایہ
زندگی بن کر روشنی پھیلاتی ہے ۔ ان اشعار کو دیکھیے ۔

ایک اک یاد کو آہوں سے جلاتا جاؤں
کام سونپا ہے مجھے اس نے مسیحائی کا

دل سے جاتی ہیں نہیں ٹھہرے ہوئے قدموں کی صدا
آنکھ نے سوانگ رچا رکھا ہے بینائی کا

جلا نے والے یادوں کے دیے اب
چراغِ جاں بجھا کر سو گئے ہیں

ایک حساس انسان جب اپنے گرد و پیش سے محو ہو جاتا ہے
تو یہ وہ گھڑیاں ہوتی ہیں جو اپنے آپ کو لکھا لجھا نہ رکھنے کے
باوجود خود فراموشی اور بے دلی کے لمحات اسے جھنجوڑتے رہتے ہیں ؎

کیوں آنکھ میں اک آنسو رہا معلوم نہیں
کیا اشکوں سے تاروں نے کہا معلوم نہیں

میں خوابوں کی دنیا میں کھویا رہا
کب رات ڈھلی کب چاند بجھا معلوم نہیں

جب بھور بھئے کوئل کی صدا کانوں میں پڑی
کیوں میرے دل میں درد اٹھا معلوم نہیں

یہ جان گئے ہنسنے کی سزا اب ملتی ہے
اس رونے کا انجام ہے کیا معلوم نہیں

میں اشکوں کے سیلاب میں اپنے ڈوبا رہا
کب ساحل کا منظر بدلا معلوم نہیں

کیا کیا تھے دل نواز مناظر گزر گئے
میں اپنی بے دلی کے اثر ہی میں رہ گیا

اک اعتبار تھا سو وہ دل میں نہیں ہے اب
اک انتظار ہے کہ نظر ہی میں رہ گیا

مغنی تبسم کا ایک سخن "آئینہ اردو غزل کا

ایک استعارہ" ان کی کتاب "آواز اور آدمی" میں شامل ہے۔
اس مضمون میں انھوں نے آئینے کی معنوی اہمیت اور اس سے
جڑے ہوئے استعاراتی اظہار کے لیے اردو شاعری کے سمندر
سے ایسے ہی اشعار منتخب کر کے تجزیہ کیا ہے۔ مغنی تبسم کی شاعری
میں بھی آئینہ" کا استعارہ پوری طرح آب و تاب نظر آتا ہے
یہ اشعار دیکھیے۔

اسی نظر نے مجھے توڑ کر بکھیر دیا
اسی نظر نے بنایا تھا آئینہ مجھ کو

نظر کے سامنے ہے رنگ روشن آئینے میں
مگر یہ سب خمارِ خواب کے ہیں۔

کون سا چہرہ ملے گا تجھ کو
آئینہ بول پڑے بھی تو نہ جا

آئینہ ویران کھڑا ہے انجانا سا لگتا ہے
ہم نے چپ سادھی ہے، وہ بھی کچھ نہ کہے تو بہتر ہے

پھر آئینہ سا بن جانا
پھر منھ تکنا، پھر حیرانی

شاید کہ سراغ اپنا پالے
آئینے کے گھر میں دیکھ جا کر

ان کو دل کی خبر تو ہوگی ہی
آئینے پر نظر تو ہوگی ہی

اگرچہ منتشر رہا ہے آئینے میں عکس
نسائی کا دشِ صورت گراں تو ہوتا رہا

ان اشعار سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ معنی نسیم نے اپنی ذات میں آئینے کو سمیٹ کر تخلیقی عمل کو انکشافِ ذات کا وسیلہ قرار دیا ہے ان کا یہ شعر دیکھیے۔

لگا ہوں ہے لگل کر جو گئے ہیں
وہ چہرا آئینوں میں کھو گئے ہیں

انھوں نے آئینہ کو ابدی زندگی کا استعارہ بنا دیا ہے اور یہ آئینہ ان کے ہاں کبھی میں ذات تو کبھی ادراکِ کون و مکاں کا ایک ذریعہ بن کر خیال کے پیکر میں سمو جاتا ہے۔ معنی نسیم کہتے ہیں کہ

آئینہ خیال بن گیا ہے
اک چہرہ یقین کا روبرو ہے

معنی نسیم کے مکدم میں رومانیہ خیالات کی بہتات ہے۔ انھوں نے رومانیہ خیالات پر علمیا نہ انداز سے روشنی ڈال کر ادب میں ایک نئی اضافہ کیا ہے۔ معنی نسیم "مغربی آئینہ اردو شاعری کا ایک مقبول استعارہ" میں لکھتے ہیں کہ

"اس کے آئینے کا ذریعہ جہاں وحدت وکثرت، غیبت وغیریت، خیر و شر، جبر و قدر کے اسرار کھولے گئے اور تخلیقِ کائنات کی ماہیت اور غایت پر روشنی ڈالی گئی ہے وہیں زندگی کے

راز سربستہ سے پیدا ہو نہ والے
تحیر کے اظہار میں بھی اسے کام
لیا گیا ہے"[۱]

مغنی تبسم کی غزل کا ایک شعر دیکھیے جو اس مجموعے
میں شامل نہیں ہے۔ آئینے کے استعارے میں راز زندگی سے
سربستہ ہو کر تحیر کو اپنے دامن میں چھپا لیا ہے ؎

شاید کہ سراغ اپنا پالے
آئینے کے گھر میں دیکھ جا کر

اس طرح یہ آئینہ مغنی تبسم کے ہاں ادراک کی
منزلوں تک پہنچنے کا ایک ذریعہ بن جاتا ہے۔

اک انتظار اپنی روانی میں آئے گا
آنکھوں کا لمس دوڑتے پانی میں آئے گا

خیال میں ہیں وہ دشت و صحرا جہاں گزر ہو نہ آدمی کا
نہ کوئی اپنا پتا بتائے، نہ کوئی اپنا سراغ پائے

گداز لمس نے دھوکے دیئے ہواؤں کے
میں اس کو اپنے بدن میں اتارتا کب تھا

یوسف ناظم "مٹی مٹی میرا دل" پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مغنی تبسم بے حد بنی اور شخصی اور

---

[۱] پروفیسر مغنی تبسم۔ "آئینہ اردو شاعری کا ایک مقبول استعارہ"
مشمولہ "آواز آدمی"، ص ۱۹۴

شاعری کے حامل ہیں۔ یہ تو اتفاق
کی بات ہے کہ ان کی ذاتی شاعری
صفاتی شاعری سے بھی زیادہ دل کش
اور لطیف ہے۔ میں نے تو یہ محسوس
کیا ہے کہ ان کی غزلوں میں ہجر اس
طرح رواں دواں ہے کہ اس کے
سوا کوئی دوسری کیفیت ان کے
ہاں لمحہ وار ہی نہیں ہوتی ہے۔ شعر
تو ہمارے یہاں اس بہتات سے کہے
گئے ہیں کہ دنیا کی پوری خواندہ
آبادی کے ہر فرد کے حصے میں دو چار
شعر تو شاید آ ہی جائیں لیکن کھرا شعر
وہ ہوتا ہے جو ادا تو شاعری کی
زبان و قلم سے نکلے لیکن اتر ے
قاری اور سامع کے دل میں۔ یہی
کیفیت مغنی تبسم کے اشعار کی ہے۔
اس کیفیت کو ادبی لغت میں خوصیت
اور خوبی کہا جاتا ہے "[۱]

مغنی تبسم کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے اپنی شعری تخلیقات
کو وجدانی تجربات کی آنچ اور فکر کے شعلوں میں تپا کر فن کے
سانچوں میں ڈھال دیا ہے۔

---

[۱] - یوسف ناظم - تبصرہ "مٹی مٹی میرا دل" سب رس - جون ۲۰۰۲ء
ص ۸۱

میری آواز کومٹی میں ملادے
پھر کہیں دور سے تو مجھ کو صدا دے

مغنی تبسم کا یہ شعر منیر رضا کی دلیل دیتی ہے۔
جس میں غیر متداول بحر (رمل مسدس مخبون) ہونے کے ساتھ
ساتھ ایک پوشیدہ روانی ظاہر ہوتی ہے جو ایک طرف تاریکی
کا مزاج پوچھتی ہے تو دوسری طرف ان کی مہارت عروض کا
ثبوت پیش کرتی ہے۔ جس پر مغنی تبسم کی گرفت مضبوط ہے۔
مضطر مجاز مغنی تبسم کے متعلق کہتے ہیں:

"اس گفتگو میں ہم مغنی تبسم صاحب کے
فن سے صرف نظر نہیں کر سکتے۔
فن پر ان کے عبور کا اندازہ
ٹھمروں و صوتی آہنگ و غیرہ سے
کیا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں
مغنی تبسم صاحب کا فن فانی سے
بہت قریب محسوس ہوتا ہے۔ فانی
ان کا فاضل مطالعہ بھی رہا ہے ان
کے کلام کی صوفیانہ لے بھی فانی کے
متصوفانہ رنگ سے ماخوذ سمجھی
جا سکتی ہے۔ لیکن یہ ان کے
اپنے نفسی اور روحانی تجارب
ہیں"[1]

ساجدہ زیدی یونگ کے تجزیاتی نفسیات کا جائزہ

---

[1] ۔ مضطر مجاز "تبصرہ" مٹی مٹی میرا دل"

لیے ہوئے لکھتی ہے کہ

"وجدانی قوت حسن فکری و جمالیاتی
ملتی ہے تو تخلیقی سائنس داں
اور فلسفی پیدا ہوتے ہیں اور جب
جذباتی اور فکری دونوں ملتی
تو شاعرانہ فکر کو جنم دیتی ہے"[1]

اس نظریہ کی روشنی میں جب ہم معنی قسم کی شخصیت
پر نظر ڈالتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ معنی تبسم کے اندر بھی ایک
زبردست وجدانی قوت موجود ہے۔ ان کے ہاں فکر کے ساتھ
ساتھ گہری جذباتیت کا سمندر بھی موجزن ہے۔ معنی تبسم کی شاعری
کا جائزہ لیتے ہوئے یہ محسوس کیا جا سکتا ہے کہ فکر جذبے
اور وجدان کا امتزاج ان کے ہاں بھرپور انداز میں
موجود ہے ؎

صنم کدے کا سا عالم رہا ہے آنکھوں میں
یہ اس طرح تو کوئی کم رہا ہے آنکھوں میں

کسی فراق کی تمہید بن کے رہ جانا
ترے وصال کی تسکین بھی کیا ہے میرے لیے

ترا خیال تھا تازہ ہوا کے جھونکے سا
جو گرد اڑ کے گئی ہے ملال میرا نہا

---

[1] ۔ ساجدہ زیدی۔ شخصیت کے نظریات ص ۱۳۴ ، ۱۳۵

ایک چہرے کی صدا ڈوب گئی
ایک آواز کا چہرہ دیکھا

یوں دیکھ رہا ہوں آسماں کو
بادل کے عقب میں جیسے تو ہے

میں سوچ رہا ہوں تو نہیں ہے
میں دیکھ رہا ہوں اور تو ہے

رنگِ رخسار وہی اور وہی نوشِ لبِ بدن
پھول یا دو نے کھلائے ہیں عجب گلشن میں

خواب میں تجھ سے ملتے ہیں اور بات دعا میں کرتے ہیں
تو بھی ہم کو دیکھے اور کچھ بول سکے تو بہتر ہے

ان کے یہ جذبات ان کے اپنے ذاتی ہیں لیکن
یہ دوسروں کے جذبات و احساسات کی ترجمانی بھی کرتے ہیں۔
"من مندر میرا دل" کی شاعری ان کے مخصوص مزاج، منفرد
اسلوب اور تخلیقی رویّے کی نشان دہی کرتی ہے۔ مغنی تبسم کی
عشقیہ شاعری کے متعلق پروفیسر سلیم حنفی کہتے ہیں:

"مغنی کے عشقیہ اشعار میں
ذاتی تجربے کی آنچ بہت تیز ہے
لیکن انھوں نے اس تجربے کو
ہجر و وصال کے ایک ذاتی
قصے تک محدود نہیں رہنے دیا۔

اس طرح نہ صرف یہ کہ ان کے
ذاتی ملال میں گہری شائستگی
اور وقار کا رنگ شامل
ہو گیا ہے، عشقیہ تجربے کے
تناظر میں وسعت بھی پیدا
ہو گئی ہے"[1]

غرض مغنی تبسم کے کلام میں رنج و غم کے مضامین
جس خوبی سے ادا کیے گئے ہیں کہ ہر شخص انھیں اپنے دل درد مند
کی آواز سمجھنے پر مجبور ہو جاتا ہے ؎

سر جھکاتا ہے کہاں تیرا مقدر ہے الگ
گھر کی دیوار جدا راہ کا پتھر ہے الگ

راکھ کے ڈھیر میں پوشیدہ شرر ہے کتنا
امید اس آگ میں جل جانے کا ڈر ہے کتنا

کلیم نوازؔ اس مجموعہ کے متعلق اس طرح رقمطراز ہیں:

"اس مجموعے کی ایک بڑی خوبی یہ ہے
کہ اس میں ایک فضا اور مزاج
کا احساس ہوتا ہے۔ یہ فضا غم لگین
ہنس کرتی اداس کر کے اک High
Seriousness پیدا کر کے
زندگی، موت، انسان، کائنات
اور وقت کے بارے میں بہت کچھ

---

[1] - پروفیسر شمیم حنفی۔ مغنی تبسم کا شہر ملال۔ مشمولہ "نذر مغنی تبسم"
ص ۴۲۵

سوچنے پر مجبور کرتی ہے ۔ اکثر نظموں
میں شخصی تجربے مختلف فکری
عناصر سے میل کھا کر ایک نئی
حقیقت کا اثاثہ بن جاتے ہیں اور
اشاریے شعر کی اوپری سطح پر
نہیں تیرتے بلکہ اس کی پوری بنت میں
شامل ہوتے ہیں"[1]

شاعری کی جن تین آوازوں کا ایلیٹ نے ذکر کیا ہے مغنی تبسم کی شاعری میں وہ تینوں آوازیں ملتی ہیں ۔ اور یہ بالکل صحیح ہے کہ مغنی تبسم کے یہاں شاعر خود سے بھی بات کرتا ہے، دوسروں سے بھی بات کرتا ہے اور اپنے ڈرامائی کرداروں کے ذریعہ بھی بات کرتا ہے ۔ جو شاعری کی ایک غیر شخصی جہت ہے ۔

حقیقت اور سچائی کو ہے کلام کا جزو بنا کر زمانہ کو حیران کر دیا ۔ زمانہ چونک پڑا اور مغنی تبسم دیکھتے ہی دیکھتے شہرت کی بلندیوں پر پہنچ گئے ۔ چنانچہ مغنی تبسم کی شاعری میں حقیقت و سچائی کا عنصر انھیں شاعرِ اعظم بنانے کے لیے کافی ہے ۔ اور اس کی بنیادی وجہ ان کی اپنی ذاتی زندگی ہے ۔

---

[1] ۔ بشر نواز ۔ "مٹی مٹی میرا دل" مغنی تبسم ۔ مشمولہ "نذرِ مغنی تبسم" ص ۔ ۴۸۲

مطبوعہ نظمیں	رسالہ	تاریخِ اشاعت
۱۔ فرصتِ یکس نفس	طلباے جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن کا سٹمائی ترجمان شمارہ ۔ 1 جلد ۔ ۲۳ صفحہ نمبر ۳۶	جنوری ۱۹۵۱ء
۲۔ آگ اور پانی	صبا	جولائی ۱۹۵۶ء
۳۔ تلاشِ سایۂ گل میں	صبا جلد ۳ شمارہ ۸، ۹	۱۹۵۷ء
۴۔ سراب	افکار (کراچی)	دسمبر ۱۹۵۹ء
۵۔ حرفِ ناشندہ	نظامِ ادب نظام کالج۔ حیدرآباد	۱۹۶۰ء، ۱۹۶۱ء
۶۔ چہرے	ملاپ (ادبی ایڈیشن) حیدرآباد	۳۰ دسمبر ۱۹۶۱ء
۷۔ خاک زاد	سوغات۔ بنگلور	۱۹۶۲ء
۸۔ واپسی	ہم قلم (کراچی)	دسمبر ۱۹۶۲ء
۹۔ اشارت	سب رس۔ حیدرآباد	مئی ۱۹۶۳ء
۱۰۔ شب و روز	قلم کار۔ حیدرآباد	مئی ۱۹۶۳ء
۱۱۔ رباط	محور۔ دہلی	دسمبر ۱۹۶۳
۱۲۔ نئی رُت	اُردو کالج۔ میگزین	۱۹۶۳ء، ۱۹۶۴ء

۱۳۔ حرزِ جاں صبا۔ حیدرآباد جنوری ۱۹۶۴ء

۱۴۔ اجنبی صبا۔ حیدرآباد جنوری ۱۹۶۴ء

۱۵۔ زمان نورد ادبی دنیا۔ لاہور ۱۹۶۵ء
شمارہ ۱۴

۱۶۔ بے نشان صبا۔ حیدرآباد جولائی ۱۹۶۶ء

۱۷۔ خود نوردی انتخاب ۱۵ر اگست ۱۹۶۹ء
میں ایک خود کلامیہ

۱۸۔ ایک منظر "ایک آرمینا گرل" جدید اردو تلگو ادب میں ۱۹۹۳
پہلا دو لسانی شعری مجموعہ

تحقيق

تحقیق کے لغوی معنی چھان بین، دریافت، کھوج، تفتیش جانچ پڑتال، سچائی، صداقت، اصلیت، یقین، تصدیق اور پایۂ ثبوت کو پہنچنا وغیرہ۔

تحقیق حقائق کی تلاش یا جستجو کا نام ہے تحقیق حقائق کی بازیافت ہے تحقیق میں کوئی بات حرفِ آخر نہیں ہوتی۔ تحقیق تحقیق کی دشمن ہوتی ہے۔

کیرافورٹ کے تحت تحقیق کی ابتدا کسی مسئلہ سے ہوتی ہے پھر وہ مواد جمع کرتی ہے اس کا تنقیدی تجزیہ کرتی ہے اور صحیح شہادت کی بنا پر کسی نتیجے پر پہنچتی ہے۔

WEBSTER کی لغت کے مطابق تحقیق محتاط یا سرگرم تلاش۔ گہری جستجو انہماک کے ساتھ جستجو یا چھان بین یا مخصوص ناقدانہ اور سیر حاصل تفتیش یا جستجو جس کا مقصد نئے حقائق کا انکشاف اور ان کا صحیح تاویل۔

OXFORD ڈکشنری کے مطابق تحقیق کسی مخصوص چیز

یا شخص سے متعلق گہری یا محتاط تلاش، کسی حقیقت کے
انکشاف کی غرض سے محتاط غور و فکر یا کسی مضمون کے مطالعہ کے
ذریعہ تلاش یا چھان بین، کسی مضمون کی چھان بین یا مسلسل تلاش،
تحقیق حقائق کی تلاش ہے اسلئے، آلمل کے قول کے مطابق ہر
قسم کی تفتیش یا چھان بین کو جو بنیادی ذرائع سے کی گئی ہو
تحقیق کہا جا سکتا ہے۔

اس طرح تحقیق اس عمل کا نام ہے جس کے ذریعہ سے
مسائل کے قابلِ اعتبار حل تک پہنچا جا سکتا ہے اور اس میں منصوبہ
بندی اور باضابطہ طریقہ سے معلومات کو جمع کیا جاتا ہے۔
ان کا تجزیہ کیا جاتا ہے اور پھر ان کی توضیح و تابع کی جاتی ہے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ اس طرح رقمطراز ہیں۔

"تحقیق کے معنی کسی شئے کی حقیقت
کا اثبات ہے اصطلاحاً ایک ایسی
طرز مطالعہ کا نام ہے جس میں
موجود مواد کے صحیح یا غلط کو بعض
مسلمات کی روشنی میں جانچا جائے" [1]

ڈاکٹر جمیل جالبی کہتے ہیں:

"تحقیق ایک بڑا مشکل فن ہے۔ جب
تک کسی میں پیدائشی صلاحیت نہ ہو
کام کرنے کی دھن نہ ہو اور اپنی منزل
تک پہنچنے کا عزم نہ ہو وہ یہ کام انجام
نہیں دے سکتا۔ اس میں آدمی

---

[1] ڈاکٹر سید عبداللہ۔ "تحقیق و تنقید"، تنقیدی نظریات جلد اوّل
ص۔ ۱۶۱، ۱۶۲

کو پتّا مار کر بیٹھنا ہوتا ہے، تیاری کرنی
پڑتی ہے مطالعہ کرنا پڑتا ہے اور
سوچ کر اپنے نقطہ نظر کو پیش کرنا
پڑتا ہے۔ فطری صلاحیت اور ذہانت
کے ساتھ ساتھ یہ بڑا صبر آزما اور
وقت طلب کام ہے۔ تحقیق دراصل
تلاش و جستجو کے ذریعہ حقائق کو
دریافت کرنا اور ان کی تصدیق
کرنے کا نام ہے۔ کسی محقق کے لیے یہ
ضروری ہے کہ اُسے پہلے ہی سے یہ
معلوم ہو کہ وہ کیا لکھنا چاہتا ہے
اور کیوں لکھنا چاہتا ہے اور اس
کو لکھنے کے لیے اُسے کیا تیاری کرنی ہے۔
اگر مطالعہ کے بعد یہ محسوس ہو کہ ایک
زاویہ ایسا بھی ہے جو ابھی تک سامنے
نہیں آیا تو لکھنے کی طرف مائل ہونا چاہیئے۔
دراصل زاویہ اور نقطہ نظر ہی بنیادی
چیز ہے جو تحریر کو وقعت اور
انفرادیت عطا کرتی ہے"[1]
تحقیق کی تعریف مالک رام نے اس طرح کی ہے:
"تحقیق عربی زبان کا لفظ ہے جس کے

---

[1] ۔ ڈاکٹر جمیل جالبی، تنقیدی اور تحقیقی موضوعات پر لکھنے کے اصول
"اردو میں اصولی تحقیق" جلد اوّل ۔ ۱۹۸۶ء ص ۵۹ ۔ ۶۹

معنی ہیں کھرے کھوٹے کی چھان بین
یا کسی بات کی تصدیق کرنا ہے۔
دوسرے لفظوں میں تحقیق کا یہ مقصد
ہونا چاہیے کہ ہم اپنے علم و ادب میں
کھرے کو کھوٹے سے، مغز کو چھلکے
سے، حق کو باطل سے الگ کریں "[1]

اسی طرح قاضی عبدالودود لکھتے ہیں:

"تحقیق کسی امر کو اس کی اصلی شکل
میں دیکھنے کی کوشش ہے"[2]

پی۔ ایچ ڈی کے لیے مغنی تبسم کا تحریر کردہ مقالہ "فانی بدایونی — حیات، شخصیت اور شاعری" اپنی نوعیت کا ایک اہم مقالہ ہے۔ اس میں طالب علمانہ تحقیق کے ایک خاص رخ سے ہٹ کر ادبی سے بھی کام لیا گیا ہے اس کی وجہ غالباً یہ بھی ہے کہ مغنی تبسم خود بھی شاعر تھے اور شعر کو سمجھنے اور اس کے اندر اترنے کی بے پناہ صلاحیتوں کے حامل تھے اور اس پر پروفیسر مسعود حسین صاحب کی رہنمائی اور سرپرستی نے ان کے اندر چھپے ہوئے نقاد اور محقق کو اجاگر کیا ہے۔

مغنی تبسم کے اس مقالے کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس طرح کے تحقیقی کام شاذ ہی ہوں گے۔ (۴۳۴) صفحات پر مشتمل یہ کتاب پہلی بار ۱۹۶۹ء میں شائع ہوئی۔

---

[1] ۔ مالک رام ۔ اردو میں تحقیق" مجموعہ مقالات رہبر تحقیق"۔ لکھنؤ ۱۹۷۶ء ۔ ص۔ ۵۵

[2] ۔ قاضی عبدالودود ۔ اصول تحقیق" مجموعہ مقالات رہبر تحقیق" لکھنؤ ۱۹۷۶ء ص ۱۰۹

(۱۷۹) صفحات، حیات، شخصیت اور فانی کی شاعری میں تقسیم ادوار کا احاطہ کرتے ہیں۔ دوسرا حصہ کلام فانی پر تنقید کا ہے۔ انہی اس کتاب کو انھوں نے مشفق استاد پروفیسر ڈاکٹر سعود حسین خاں کی خدمت میں معنون کیا۔ فانی نے زندگی میں جو حزن کی کیفیت اور غم کا تجربہ اور مشاہدہ کیا مغنی تبسم نے اسے ترقی پسندی سے وابستگی کی روشنی میں کلام فانی کا بھرپور جائزہ لیا ہے اس کے علاوہ انھوں نے صوتیاتی اور اسلوبیاتی نقطہ نظر سے فانی کی شاعری میں اصوات کا نہایت تفصیل سے تجزیہ کیا ہے۔ انھوں نے فانی کے کلام کا جس قدر گہرائی گیرائی اور علمی وزن و وقار کے ساتھ جائزہ لیا وہ کسی بھی ہم عصر نقاد شاعر کے کلام کا نہیں لیا گیا۔ فانی پر یہ تحقیقی مقالہ فانی کا کارنامہ ہے۔ اس تحقیق پر شمس الرحمٰن فاروقی تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "ساڑھے چار سو صفحوں سے اوپر کی اس کتاب پر ریسرچ تھیسس کا اطلاق مشکل ہی سے ہو سکتا ہے۔ آج کل جس طرح کے تحقیقی مقالے لکھے جا رہے ہیں جن میں علم، فہم، مطالعہ، محنت، سائنسی اور تجزیاتی طرز اظہار ہر چیز کا فقدان ہوتا ہے اس کو دیکھتے ہوئے اس عظیم الشان مقالے کو تھیسس کہنا ایک طرح اس کا منھ چڑھانا ہے۔ یہ تو ایسی کتاب ہے جسے عمر بھر کا کارنامہ

کہا جا سکتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں
اردو میں کسی ایک شاعر کا اتنا
جامع اور مفصل مطالعہ شاید
ہی ہوگا۔[1]
فانی بیسویں صدی کے غزل گو شعرا میں
بہت ممتاز حیثیت کے حامل ہیں لیکن نہ جانے کیوں نقادوں نے
ان کو نظر انداز کیا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ مغنی تبسم نے اپنے
مقالے کے لیے "فانی بدایونی۔ حیات، شخصیت اور شاعری"
کا انتخاب کر کے اردو غزل کے اس اہم سنگِ میل کو سمجھنے اور
سمجھانے کی کوشش کی۔ اگرچہ فانی کی شخصیت اور اُن کے فن پر
کئی معتبر ناقدین نے مضامین لکھے لیکن کوئی جامع کتاب منظرِ
عام پر نہ آ سکی۔ مغنی تبسم نے اپنے پیش لفظ میں ایسے کچھ مضمون
لگاروں کے نام لیے ہیں جن کے مضامین میں فانی کے کلام کا مفصل
جائزہ نہیں بلکہ اختصار سے کچھ باتیں کہہ دی گئی ہیں ان میں پروفیسر
رشید احمد صدیقی، پروفیسر آل احمد سروری، مجنوں گورکھپوری،
پروفیسر احتشام حسین، پروفیسر خواجہ احمد فاروقی، پروفیسر فراق
گورکھپوری، ڈاکٹر عبادت بریلوی، میکش حیدرآبادی، مسعود
حسین ذوقی، نثار واحدی، محمد سبطین اور مجتبیٰ حسین وغیرہ۔
قابلِ ذکر ہیں۔ مغنی تبسم نے نفسیاتی تجزیہ کو مناسب حد تک
اپنی تنقید میں جگہ دی ہے چونکہ جدید دور میں لسانیات
کا علم بہت ترقی کر چکا ہے جس کی مدد سے انھوں نے ادبی اور
شعری تخلیق کے اسلوب اور صوتی حسن کی انفرادی خصوصیات

---

[1] شمس الرحمٰن فاروقی۔ تبصرہ رسالہ شب خون۔ جنوری ۱۹۷۰ء
ص۔ ۷۶

کا سائنٹیفک تجربہ ممکن کر دیا جو ادبی تخلیق کی قدر و قیمت کے تعین میں مدد دیتا ہے۔ فانی کی شاعری کے صوتی آہنگ کا تجزیہ لسانیاتی نقطہ نظر سے مغنی تبسم کی ابتدائی اور کامیاب کوشش ثابت ہوئی۔

فانی کی سوانح حالات جمع کرنے کے لیے بھی مغنی تبسم کو کافی تگ و دو کرنی پڑی۔ اگرچہ فانی کے چاہنے والے اور ان سے قربت رکھنے والوں نے کچھ مضامین لکھے لیکن ایسی کئی باتیں تھی جو پس پردہ تھی لیکن مغنی تبسم نے نہایت باریک بینی سے ان کی بازیافت کی اور اپنے مقالے میں شامل کر لیا اس اعتبار سے ان کا مقالہ فانی کو سمجھنے اور ان کے مقام کا تعین کرنے میں اہم ثابت ہوتا ہے۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں کے الفاظ میں:

"فانی کی حیات، شخصیت اور سیرت کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے سلسلے میں انہوں نے وہ سب جتن کیے جو کسی سوانح نگار کو کرنا پڑتے ہیں۔ فانی کے عزیزوں، دوستوں اور واقف کاروں سے انٹرویو لیے ان کے ملازمین اور ماماؤں کے در تک بلا تکلف پہنچے اور نتیجے کے طور پر فانی کی زندگی کے بعض دلچسپ گوشوں کو کامیابی کے ساتھ بے نقاب کیا اور ان گوشوں کو سامنے لاتے وقت انھوں نے اس بات کا

لحاظ رکھا ہے کہ وہ ایک شاعر کی
زندگی سے دست و گریباں ہیں
اور ادبی نقاد کے لیے شاعر کی زندگی
کے صرف وہ پہلو اہمیت رکھتے ہیں
جو اصلی ادبی شخصیت کو اجاگر
کرتے ہیں"[1]

مغنی تبسم نے فانی کے نسل اور خاندان کے بارے
میں فانی کے خود نوشت حالات کو حاصل کیا جو کہ "نگار" جنوری۔
فروری۔ ۱۹۴۱ء میں صفحہ ۱۲۵ پر شائع ہوا تھا۔ جس سے
ثابت ہو گیا کہ فانی نسلاً پٹھان تھے اور ان کا وطن کابل تھا۔ اور
ان کے مورث اعلیٰ اصالت خاں، شاہ عالم بادشاہ دہلی کے
زمانے میں ہندوستان آئے۔ انھیں اور ان کے جانشینوں کو
دربار دہلی نے بہت نوازا اور انھیں اچھے عہدوں پر فائز کرنے
کے ساتھ ساتھ جاگیرات، خطبات اور منصب وغیرہ سے سرفراز
کیا گیا تھا۔

فانی کے حسب و نصب کے بارے میں معلومات
حاصل کرنے کے لیے انھوں نے جو کتابیں دیکھی ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ
مغنی تبسم نے کس قدر دیدہ ریزی سے کام کیا۔ علی گڑھ میگزین۔
فانی نمبر میں صفحہ ۲۶ پر مختار احمد بدایونی فانی کا نسلی تعلق
متلیہ اڈمرڑ سے بتاتے ہیں لیکن اس بارے میں مغنی تبسم نے جو
معلومات حاصل کی تھی ان کے پیش نظر یہ خیال انھیں درست
معلوم نہیں ہوا اور انھوں نے فانی کا خاندانی تعلق یوسف زئی

---

[1] ڈاکٹر مسعود حسین خاں۔ پیش لفظ۔ فانی بدایونی۔ حیات، شخصیت اور شاعری
ص۔ ۵

افغانوں کے قبیلے غرخیل سے بتایا۔ آگے چل کر افغانوں کی تقدیر کے بننے اور بگڑنے میں خارجی حالات کے علاوہ نسلی خصوصیات کا جو حصہ رہا ہے اس سلسلے میں جمال الدین افغانی کے الفاظ میں روشنی ڈالی ہے "افغان قوم غیرت، خودداری، عزتِ نفس اور حیرت انگیز شجاعانہ کارناموں کے باعث روئے زمین پر اپنی نظیر نہیں رکھتی۔ یہی وہ غیرت مندانہ واقعات ہیں جو کسی قوم کو حریت اور استقلال کی زندگی ودیعت کرتی ہیں اس کے علاوہ انتقام، عداوت، خصومیت، دشمنی، نزاع اور کینہ اس قوم کے نمایاں اوصاف ہیں۔ ان کا لباس، زبان اور ہیت کذائی ان خصوصیات کے روشن ثبوت ہیں۔ چنانچہ ان کی تیوری چڑھی ہوئی ان کی تنگ دلی کا پتہ دیتی ہے۔ خندہ پیشانی کا ان میں تقریباً فقدان ہی ہوتا ہے۔ تاہم ان کی زندگی کے بعض اطوار بُردباری اور متانت کے بھی آئینہ دار ہوتے ہیں۔ یہ وہ خصوصیات ہیں جو ایک نظر میں نہایت قبیح اور دوسری نظر میں ان کی بقا کی ضامن کہی جا سکتی ہیں۔ فانی کے نسب کے بارے میں مغنی تبسم نے نجم الغنی خاں محمد کی اخبار الصنادید کے ذریعہ فانی کے بزرگوں میں نواب بشارت خاں کا ذکر کیا ہے۔ جس کا تذکرہ خود فانی نے بھی کیا تھا۔ بشارت خاں، نجیب خاں (نجیب الدولہ) کے چچا تھے۔ نجیب خاں اپنے چچا بشارت خاں کے ہمراہ اپنے وطن موضع مانا ری سے جو اٹک پار پشاور سے پچیس کوس کے فاصلہ پر واقع ہے روانہ ہو کر ہندوستان آئے تھے۔ اللہ نجش یوسفی اور نجم الغنی کی اخبار الصنادید کے ذریعہ انھوں نے بشارت خاں کے بھائی اصالت خاں، نجیب خاں کے

والد قرار دیا۔ اور اصالت خاں کے والد کا نام عنایت خاں بتایا۔ خلاصۃ الانساب مولفہ رحمت خاں اور حیاتِ لودی مولفہ عبد الحکیم خاں لودی میں دیے گئے شجروں سے انھیں بخیب خاں کی ولدیت کا پتہ نہیں چلا، صرف عمر خیل سے ان کا تعلق ظاہر ہوا۔ یوسف زئی افغان سے جو شجرے ملے ان میں بخیب خاں کے والد کا نام بجم اور دادا کا نام "نبات" کا پتہ چلا۔ یوسف زئی افغان نے بشارت خاں کا جو شجرہ منسب ظاہر کیا اس کو انھوں نے اپنے مقالے میں پیش کیا۔ فانی کے پردادا کے نام سے بھی کئی اختلافات رہے ہیں خود فانی نے بھی بشارت خاں کو اپنا پردادا قرار دیا تھا اور مختار احمد بدایونی نے انھیں پردادا بتایا تھا۔ لیکن ضیا احمد بدایونی نے ان دونوں سے اختلاف کرتے ہوئے بتایا کہ وہ فانی کے دادا علام بنی خاں کے حقیقی بھائی تھے۔ خود مغنی تبسم نے فانی کی حقیقی نانیہال زادبہن سے بدایوں میں ملاقات کی اس کے علاوہ دوسرے لوگوں سے بھی انھوں نے استفسارات کیے اور جن سے ربط نہ ہو سکا مختار احمد بدایونی نے ان سے معلومات حاصل کر کے مغنی تبسم کو بہم پہنچائیں۔ مختلف بیانات کی روشنی میں انھوں نے یہ واضح کیا کہ فانی کے پردادا نواب اکبر علی خاں تھے اور نواب بشارت علی خاں ان کے رشتے کے بھائی تھے۔

بدایوں میں مقیم فانی کے عزیز و اقارب کی فراہم کردہ معلومات کی مدد سے مغنی تبسم نے فانی کے خاندان کا شجرہ تفصیل سے پیش کیا۔ فانی کے سگے دادا داؤد خاں کے بیٹے نواب اکبر علی خاں ان کے تین بیٹے علام رسول خاں،

غلام نبی خاں اور غلام محی الدین تھے غلام نبی خاں کی اولاد میں ولایت علی خاں، شجاعت علی خاں، منگلی بیگم، چاندنی بیگم، الٰہی بیگم اور ستارہ بیگم شامل ہیں۔ شجاعت علی خاں کی اولاد میں شوکت علی خاں فانی، مشیت علی خاں، عشرت علی خاں، وجاہت علی خاں اور نسیم بیگم شامل تھیں۔

"شجاعت علی خاں کی بیوی مہتاب بیگم ان کے چچازاد بھائی ہادی یار خاں کی بیٹی تھیں۔ انھیں کے بطن سے شوکت علی خاں پیدا ہوئے"[1]

فانی کے پیدائشی وطن بدایوں کے تعلق سے انھوں نے صفا، محمد عبدالحی کی عمدۃ التواریخ بتمل کی کنز التاریخ اور خلیق احمد نظامی کی "بدایوں۔ اسلامی ہند کے دورِ اوّل میں" کا مفصل جائزہ لیتے ہوئے کہتے ہیں کہ بدایوں کی سرزمین سے کئی ایسی باکمال ہستیاں ابھریں جنھوں نے ہندوستان گیر شہرت حاصل کی۔ ان علما، ادبا اور شعرا میں جو بدایوں میں پیدا ہوئے تھے یا جنھوں نے اپنی زندگی کا قابل لحاظ حصہ بدایوں میں گزارا تھا ان میں چند قابل ذکر نام انھوں نے یہ پیش کیے ہیں۔ ملا عبدالقادر بدایونی، شیخ شہاب الدین مہمر، ولد ناصی الدین صفانہ، نواب ظہوراللہ نوا، علی احمد اختر، بیخود بدایونی، دیبی سہائے شعر، قمر بدایونی، غلام امیر نقاد وغیرہ بے شمار شہدا اور بزرگان دین جنھوں نے اس خطۂ ارض کو اپنے قدوم سے شرف بخشا اور ان میں سے بیشتر بدایوں میں ہی پیوندِ خاک ہوئے۔

---

[1] ۔ پروفیسر مغنی تبسم ۔ فانی بدایونی حیات شخصیت اور شاعری ۔ ص ۱۶

فانی کی پیدائشی تاریخ کے لیے انھوں نے نگار (جنوری، فروری ۱۹۴۱ء) کا مطالعہ کرکے بتایا ہیکہ شوکت علی خاں فانی ۱۳/ ستمبر ۱۸۹۷ء کو بدایوں کے قصبے اسلام نگر میں ایک ایسے ماحول میں آنکھ کھولی جبکہ بدایوں کے سارے مسلمان اور بالخصوص افغان اپنی اولاد کو انگریزی پڑھانا گوارا نہیں کرتے تھے۔ "مختار" علی گڑھ میگزین فانی نمبر سے استفادہ کرکے بتاتے ہیں کہ فانی کے والد شجاعت علی خاں پولیس کے تھانے دار تھے۔ وہ اپنے والدین کی دوسری اولاد تھے ان سے پہلے ایک لڑکی تولد ہو کر چھٹی کے دن انتقال کر گئی تھی۔ فانی کے گھریلو ماحول کا تذکرہ کرتے ہوئے مغنی تبسم لکھتے ہیں کہ فانی نے جب ہوش سنبھالا تو ان کے اطراف ایک ایسا ماحول تھا جس میں ماضی کی روایات خوب و زشت کا پیمانہ بنی ہوئی تھیں۔ بزرگوں کی زندگی کے واقعات اور خاندانی امارت کے تذکرے کانوں میں پڑتے رہتے تھے۔ محلہ ابراہیم پور میں شجاعت علی خاں اور ولایت علی خاں وغیرہ کی کوٹھیاں تھیں سارے علاقے میں انھیں کے خاندان کے لوگ آباد تھے ان میں وراثت کی تقسیم، جائداد کی ملکیت کے جھگڑوں اور رشک و حسد کی وجہ سے پھوٹ پڑی ہوئی تھی۔ شجاعت علی خاں اپنے "محل" میں اس آن بان سے رہتے تھے کہ دیکھنے والوں کو گمان ہوتا تھا کہ وہ بے انتہا دولت کے مالک ہیں۔ شاید اس شہرت کی بنا پر محمد سبطین، مختار احمد اور حیرت بدایونی نے ان کی امارت اور دولت مندی کا ذکر مبالغہ کے ساتھ کیا ہے۔ آبائی جائیداد کے تعلق سے کہتے ہیں کہ کچھ تو جائیداد غدر کے ہنگاموں کی نذر ہو گئی اور جو باقی رہ گئی تھی، تقسیم در تقسیم کے بعد اس کا قلیل حصہ تھوڑی سی زمینداری اور چند مکانات کی صورت میں شجاعت علی خاں کو ورثہ میں ملا تھا۔ مغنی تبسم نے رسالہ "نگار" کے ذریعہ

فانی کا بیان پیش کیا جس سے صاف ظاہر ہو گیا کہ فانی کے والد شجاعت علی بوکہ پولیس کے تھانہ دار تھے اپنی قلیل آمدنی کے سہارے مرحوم نے اپنی ساری زندگی شرافت، دیانت، غیرت اور جرات کے ساتھ گزار دی۔ اس گھرانے کے طرزِ زندگی سے متعلق انھوں نے کہا کہ ان کی زندگی میں مذہب کا رنگ نمایاں تھا۔ مغنی تبسم لکھتے ہیں:

"فانی کی ابتدائی تعلیم و تربیت بدایوں
میں ہوئی جب وہ پانچ برس کے ہوئے
تو والد نے ان کے لیے گھر پر مکتب
جمع دیا۔ قرآن شریف ختم کرنے کے بعد
مولوی وحید اللہ خاں صاحب سے فارسی
پڑھنا شروع کی جو گورنمنٹ ہائی اسکول
بدایوں میں ٹیچر تھے"[1]

فانی کی ابتدائی شاعری کے بارے میں انھوں نے کہا کہ فانی کی طبیعت بچپن سے ہی شاعری کی طرف مائل تھی کہتے ہیں:

"ابتداً ان کے مذاقِ شعری کی
تربیت میں مکتب کے استاد مولوی
وحید اللہ خاں کا بڑا حصہ رہا ہو
ایک خوش فکر شاعر تھے۔ اور فارسی
اور اردو شاعری کا ستھرا ذوق
رکھتے تھے۔ مکتب کی تعلیم کے زمانے
میں فانی نے محض اپنے شوق سے

---

[1] ۔ پروفیسر مغنی تبسم۔ فانی بدایونی ــــ حیات شخصیت اور شاعری۔ ص ۲۲

مختلف اساتذہ کے دواوین پڑھ
ڈالے تھے۔ ابھی ان کی عمر مشکل سے
گیارہ سال ہوگی کہ خود بھی شعر کہنے
لگے اور نام کی مناسبت سے ٹوکت
تخلص اختیار کیا"[1]

دیوانِ فانی میں جو نظمیں اور غزلیں شامل ہیں ان کے مطالعے سے انھوں نے فانی کی شاعری پر علی گڑھ تحریک اور علی گڑھ کے ادبی ماحول کے اثرات کو نمایاں طور پر محسوس کیا۔ کیوں کہ فانی کو اس زمانے میں سرسید احمد خاں کی شخصیت سے والہانہ عقیدت ہو چکی تھی جو ان کے دل میں آخری دم تک رہی۔ مغنی تبسم کی تحقیقانہ اور ناقدانہ نظروں نے یہ ثابت کیا کہ فانی کی شاعری خاص طور سے حالی سے متاثر کن رہی ہے۔ ان کی نظموں "علم"، "دارِ فانی"، "غمازی"، اور مختلف مقامات پر حالی کی گہری چھاپ کو داغ کیا ہے۔

فانی کی شادی، حیات مکرم معاش، معلمی اور
نظارت علی گڑھ کالج میں داخلہ اور قانون کی تعلیم، لکھنو میں
وکالت کا آغاز، والدین کا انتقال، شعر گوئی تجدید اور پھر دوبارہ
لکھنؤ میں قیام، دیوانِ فانی کی اشاعت، لکھنؤ کو روانگی تقسیم جائداد
سے مراسم، آبائی جائیداد کی فروخت، کلکتہ اور بمبئی کی سیاحت،
دوبارہ اٹاوے میں قیام، نورجہاں سے مراسم، باقیاتِ فانی
کی اشاعت، آگرہ کو روانگی، حیدرآباد کا پہلا سفر پھر دوسری بار
حیدرآباد میں وغیرہ کی تفصیلات "روحِ فانی کی خدمت میں
نذرِ عقیدت"، علی گڑھ میگزین۔ فانی نمبر، فانی کے برادر

---

[1] ۔ پروفیسر مغنی تبسم "فانی بدایونی۔ حیات شخصیت اور شاعری۔ ص ۔ ۲۳

زادہ فراست علی خاں سے معلومات، فانی کے سسرالی عزیز جو
بدایوں میں موجود ہیں ان کی مدد سے فانی کے خاندان کا شجرہ، نثار
اٹاوی نے مولوی الطاف علی، ہیڈ ماسٹر اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ
کے حوالے سے مسمریزم کے واقعات تحریر کیے گئے ہیں۔ رسالہ شاعر،
عبدالحکیم۔ حیاتِ لودی۔ عشرت رحمانی "مقدمہ" کلیاتِ حسرت
موہانی، کول پنڈت کشن پرشاد۔ "حسرت موہانی کی یاد میں"، ادبی
اور قومی تذکرے، دیوانِ فانی، فانی۔ لنگار، شخصی انٹرویو،
حسرت بدایونی شخصی انٹرویو، وحید احمد، شخصی مکتوب، سلطان
احمد واقف بوانی، مرقع ادب حصہ دوم، ماہنامہ ساقی
(کراچی)، فیاض حسین، منشی۔ شخصی انٹرویو (اٹاوہ)، شاعر،
نورجہاں شخصی انٹرویو اٹاوہ میں، "اشارات" (ایڈیٹوریل)
علی گڑھ میگزین، ماہر القادری شخصی، مجلہ عثمانیہ (مہاراجہ نمبر)،
میکش اکبر آبادی۔ "فانی بدایونی"۔ اردو ادب کا شمارہ،
آگرے میں قیام۔ ادبی محفلیں اور مشاعرے۔ روحانی مشاغل۔
ستارہ شام۔ معاشی مشکلات۔ مہاراجہ گوالیار کی اتالیقی کی
پیش کش، ماہنامہ "تسنیم" کا اجرا۔ ادارت سے دست کشی۔
مہاراجہ کشن پرشاد سے مراسلت، ترکِ قیامِ آگرہ۔ حیدرآباد کو
روانگی، مہاراجہ کی سرپرستی۔ مہاراجہ کا دربار۔ لڑکی کا انتقال۔
ملازمت کے لیے تگ و دو، صدر مدرسی، معاشی آسودگی،
صحبت احباب، ادبی دلچسپیاں، مشاعرہ جے پور۔ شہزادہ معظم
جاہ کے دربار سے توسل، معظم جاہ کے کلام پر اصلاح۔ "دربار
دربار" تبادلہ ناندیڑ، "عرفانیاتِ فانی" کی اشاعت،
ملازمت سے سبک دوشی، بے روزگاری اور تنگ دستی، بیگم
فانی کا انتقال، مہاراجہ کی وفات، جامعہ عثمانیہ میں ملازمت

کی کوشش اور ناکامی ۔ "وجدانیاتِ فانی" کی اشاعت۔ مشاعرہ بھوپال ۔ آخری ایامِ حیات، طویل علالت ۔ وفات، فانی کا سوگ اور وفات کی تاریخیں، اولاد اور شاگردوں کی تفصیل شخصی انڈیکس، "ادابِ" تسنیم، ساقی، عرفانیاتِ فانی، تابش دہلوی، صدق جائسی ۔ دربار دربار، علامہ پنجبتن سے شخصی انڈیکس، یادِ ایامِ محبتِ فانی، "جوش حیدرآباد دکن میں" (افکار جوش نمبر)، نقوش اردو ادب اور معزالدین اورنگ آبادی سے معظم جاہ بہادر کے دربار کے بارے میں بیشتر تفصیلات حاصل کی گئی ہیں۔

فانی کی شخصیت کا نفسیاتی مطالعہ مختلف جدید ماہرین نفسیات کے نظریات کی روشنی میں لیا گیا ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی لکھتے ہیں:

"ڈاکٹر مغنی تبسم کی ضخیم کتاب کو پڑھ کر فانی کے بارے میں مجھے اپنی رائے بہت کچھ بدلنی پڑی۔ اگرچہ میں ان کی طرح یہ ماننے کو تیار نہیں ہوں کہ وہ جنیئس تھے، لیکن اس مفصل مقالے نے فانی کی قدر دوبارہ متعین کرنے میں یقیناً کامیابی حاصل کی ہے۔ ان کی شخصیت کے بھی بہت سے پہلو بے نقاب ہوتے ہیں جو ان کی شاعری پر روشنی ڈالتے ہیں"[1]

---

[1] شمس الرحمٰن فاروقی۔ تبصرہ "فانی بدایونی حیات شخصیت اور شاعری۔ شب خون۔ جنوری ۱۹۷۰ء ص ۷۵

مغنی تبسم ان محققین میں سے ہیں جنھوں نے اُردو تحقیق کو ایک نئی راہ دکھائی ہے۔ اردو میں تحقیقی کاوش دوسرا ادبیات کے مقابلے میں نہ ہونے کے برابر ہیں اور جو کارنامے منظرِ عام پر آئے ہیں ان میں اکثر قدیم روایات کے علمبردار ہیں۔ مغنی تبسم کے اس تحقیقی کارنامے کی ایک اہم خصوصیت کی طرف میں اشارہ کرنا چاہتی ہوں کہ فانی کو اب تک ایک یاسیت پسند شاعر کے نام سے یاد کیا گیا کہیں ان کی شاعری پر کسی نے توجہ نہیں دی۔ جس میں فکر کی گہرائی بھی موجود ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی کے الفاظ ہیں:

"فانی کے کلام کی یاسیت دراصل
اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ
اصلی یاسیت کا کوئی خاص تعلق شاعر
کے ظاہری حالات سے نہیں ہوتا، بلکہ
یاس انگیزی اس کا مزاج ہی ہوتی ہے۔
فضول خرچ، زود رنج، بال بچوں
کی ذرا پروا نہ کرنے والے، اپنی ہڈی
اور خون پر ناز اں فانی میں خود
ترحمی کا جذبہ بھی شدید تھا ——
فانی کے قدرداں بھی ملے، عشق میں
وہ زیادہ تر کامیاب رہے، بلکہ اکثر
محبوب ہی رہے، اس کے باوجود ان کا
کلام اس قدر غم انگیز صرف اس
وجہ سے ہے کہ ان کا مزاج ہی اس طرح
کا تھا۔ مغنی تبسم کے مقالے نے

یہ بات واضح کردی ہے"۔[1]

مغنی تبسم نے زیادہ تر شاعری کو اپنی تنقید کا موضوع بنایا ہے۔ ان کی تنقید کا باضابطہ آغاز اپنے تحقیقی مقالہ فانی بدایونی۔ حیات شخصیت اور شاعری میں شروع ہوتا ہے۔ جس میں انھوں نے فانی کی شاعری میں اصوات کا نہایت گہرائی اور علمی وزن و وقار سے جائزہ لیا ہے۔ اس مقالے میں فانی کی شاعری کو ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے۔ "صوتی آہنگ" میں فانی کی شاعری کے آئینے میں اردو زبان کی اصوات، رمزیت اور موسیقیت کا جائزہ لیا گیا ہے۔ مغنی تبسم شعر اور نغمگی کے باہمی اٹوٹ ربط و تعلق پر روشنی ڈالتے ہیں۔ شعر کی صوتی کیفیت اور معنی کی تاثر کی بات کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے کہ شعر کو محض مسلسل اصوات کا مجموعہ قرار دینا مہمل سی بات ہے لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ شعر کی ہیئت میں اصوات کو بنیادی مقام حاصل ہے۔ کیوں کہ ان ہی اصوات کی مخصوص ترتیب سے شعر کی خارجی موسیقی ترتیب پاتی ہے اور شعر کی تفہیم میں صرف معنی و مفہوم تک مطالعہ کو محدود رکھنا شعر کو پوری طرح سمجھنے میں ممد نہیں رہتا اس لیے صوتی آہنگ کے مطالعہ پر زور دیا جانا چاہیے۔

مغنی تبسم فانی کے تصور غم کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ فانی نے زندگی کی غایت اور بقا کی آرزو اور تلاش کا اظہار دو لفظوں "غم" اور "عشق" میں سمو دیا ہے۔ حقیقت کے ادراک اور اظہار کے لیے انھوں نے جو طریقہ اختیار کیا ہے وہ شاعرانہ منطق ہے۔ ——— ان کی منطق جذبے کی تابع ہے

---

[1] شمس الرحمٰن فاروقی۔ تبصرہ۔ فانی بدایونی۔ حیات شخصیت اور شاعری شب خون۔ جنوری ۱۹۷۰ء۔ ص ۷۵

عقل پر حاکم ہیں ۔ یہ منطق علت و معلول میں کچھ ایسے رشتے قائم کرتی ہے ۔ زندگی بے ثبات ہے ۔ بے ثباتی موت ہے ۔ موت زندگی ہے ۔ غم خواہش ہے ، خواہش عشق ہے ، عشق فنا ہے ۔ فنا بقا ہے ۔ بقا زندگی ہے ۔ زندگی عشق ہے ۔ حسن کمال ہے ۔ عشق ناتمام ہے ۔ زندگی ابدی ہے ۔ اس طرح ان الفاظ کے ایہام کو ملحوظ رکھتے ہوئے مغنی تبسم فانی کی شاعری اور دیگر تحریروں سے ان کے وجدان فکر اور تصورِ حیات تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ فانی کے فکر و وجدان کے باب میں مغنی تبسم نے فکر و وجدان کا آغاز خواہش بقا اور غایت کی جستجو کے علاوہ ایرانی ، ہندی اور مغربی فکر کے اثرات ، فانی کے تصورِ حیات کی تشکیل میں خارجی اور داخلی موثرات کا مطالعہ ۔ شخصی اسبابِ غم ۔ آلام روزگار ۔ جنسی محرومیاں ۔ دو نیم شخصیت ، زندگی کا المیہ احساس ۔ بے ثباتی اور جبر ۔ بدھ مت ، ہندو نظام ہائے فکر اور قنوطی فلاسفر کی تعبیرِ حیات سے عارضی دلچسپی ، اسلامی تصوف کے فکری نظام میں " بقا " کی بہتر صورت کا تحقیق ۔ انا کے مطالبہ آزادی کی عدم تسکین ۔ عجز بندگی کا احساس ۔ اشاعرہ کے عقید ہ جبر پر ایقان رواقیت اور تسلیم و رضا ۔ مابعد الطبیاتی فکر سے انحراف ، عشق اور فن میں بقا کی تلاش ، حسن و عشق اور نظریہ شعر کا تنقیدی جائزہ لیا ہے ۔ اظہار و زبان کے سلسلے میں انھوں نے زبان اور شاعری ۔ شاعر کی بازیافتہ شخصیت کا صوتی ، رمزی اور ایمائی اظہار ۔ غزل کی زبان ، فانی کے اظہار کے نمایاں پہلو ۔ ابتعادی زبان ۔ صنائع کا استعمال ۔ تضاد بین و تضاد آرائی ۔ طنز نگاری ۔ استعادات کی تشکیل ۔ ڈرامائیت ۔ ڈرامائی مواقع ۔ تشخص ، مکالماتی زبان ۔ ڈرامائی مکالمے ۔ شاعری کی پہلی اور دوسری آواز ، مکالماتی لہجہ ۔ تخاطب ۔ اسمائے ضمیر کا استعمال ۔

بول چال کے فقرے۔ خجائیے۔ استفہام، رمزیت اور خیال
افروزی۔ فانی کی شاعری میں زبان سازی کا انتخابی عمل۔ فانی
کی مصطلحات شعر، استعارہ و تمثیل۔ غزل کے رموز و علائم
کا احیا اور انفرادی اسلوب کا جائزہ لیا ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی اس طرح رقمطراز ہیں:

"مغنی تبسم کا یہ نکتہ بہت صحیح ہے کہ
"خود شاعری نظری علم اور فلسفے کا
ذریعہ اظہار قطعاً نہیں ہے۔ غزل گو
شاعر کی فکر اور وجدان کا مطالعہ
دراصل یہ جاننے کی کوشش ہے کہ شاعر
نے زندگی کو کیسا پایا، یا زندہ رہ کر
اس نے کیا محسوس کیا۔" (ص ۱۹۰) میں
اس میں صرف اتنا اضافہ کرنا
چاہوں گا کہ مجھے فانی کے یہاں فلسفیانہ
علم یا وجدانی علم کی جگہ صرف جذباتی
علم ملتا ہے۔ ان کا یہ نکتہ بھی بہت
درست ہے کہ "فانی مجموعی طور پر ہم کو
ایک غم گین اور اذیت پسند شاعر
نظر آتے ہیں ——— ہر دور کے کلام
میں ایسے اشعار مل جاتے ہیں جن سے
فانی کا انفرادی غم آشکار ہوتا ہے"۔
ص (۱۹۰/۱۹۱) ۔ فانی نے اگرچہ غالب
کے لہجہ کا اتباع کرنے کی کوشش کی،
لیکن چوں کہ وہ ان کی طرح کا ذہن

نہیں رکھتے تھے - اس لئے وہ بے دلی کے
ایسے آفاقی اظہارات کو گرفت میں
نہ لا سکے جیسے کہ غالب کے کلام میں
بکھرے ملتے ہیں - فانی اگر وجدانی فکر
کے شاعر ہوتے، جیسے کہ غالب تھے، تو
وہ استعاروں میں بات کرتے اور
بے دلی ان کے لیے غالب کی طرح ذات
و حیات کا استعارہ بن جاتی - فانی
کے کلام کے بارے میں یہ انکشاف
کہ وہ بے دلی کو برداشت نہیں کر سکتے تھے
اور سمجھوتے پر آمادہ ہو جاتے تھے"
مغنی تبسم کا کارنامہ ہے"[1]

فانی کی شاعری کا مغنی تبسم نے جس بصیرت انداز سے جائزہ لیا ہے وہ اُن ہی کا حق تھا۔ مغنی تبسم نے فانی کے فکر و فن کا تجزیہ کرتے ہوئے لسانیاتی تحقیق سے کام لیا ہے جو شاید اُردو ادب کی تنقید کے لیے ایک نیا زاویہ نظر ہے۔ مغنی تبسم کے اسلوب اور اندازِ بیان کے بارے میں مسعود صاحب نے بہت صحیح لکھا ہے۔

"مغنی تبسم نے ایک غزل گو کی شخصیت
اور اس کے مکلم کے طلسم کو کھولنے میں
ان تمام حربوں کو استعمال کیا ہے
جن سے تا حال کوئی نقاد مسلح ہو سکتا ہے۔

---

[1] - شمس الرحمٰن فاروقی - تبصرہ "فانی بدایونی - حیات شخصیت اور شاعری"
شب خون - جنوری ۱۹۷۰ - ص ۷۶

یہ حربے ابھی تک یورپی نقادوں کی
گرفت میں تھے اردو میں پہلی بار
وسیع پیمانے پر ان کا استعمال
ڈاکٹر مغنی تبسم نے کیا ہے"[1]
فانی کی شاعری کا لسانیاتی تجزیہ متوازن اور
اسلوب بیان میں وہ خصوصیات ہیں جو مغنی تبسم کو دوسرے
محققین سے ممتاز کرتی ہیں ۔ انھوں نے فانی کی شاعری کا جائزہ
جس زاویے سے لیا ہے وہ اپنی شکل اختیار کر چکا ہے ۔ اسلوبیاتی
جائزے میں مغنی تبسم لکھتے ہیں .

"انتخاب اصوات شاعر کا بالکلیہ
ارادی فعل نہیں ہوتا کیوں کہ وہ محض
اصوات کو جوڑ کر اپنا نغمہ نہیں
بنا سکتا ۔ بعض اصوات شاعر کو
زیادہ مرغوب ہوتی ہیں . وہ اس
کے سامنے خاص رنگوں کا لباس پہنے
جلوہ گر ہوتی ہیں . شاعر غیر شعوری
طور پر ایسے الفاظ کو ترجیح دینے
پر مائل رہتا ہے جن میں یہ اصوات
زیادہ ہوں شاعر کا ذخیرۂ الفاظ
اس کے الفاظ کی مخصوص عادتیں،
اس کے جملوں کی نوع ساخت، اس کے
تجربات و جذبات کی نوعیت، صنف

---

[1] ڈاکٹر مسعود حسین خاں ۔ پیش لفظ " فانی بدایونی ۔ حیات شخصیت اور شاعری
ص ۔ ۸

یا اصناف کی روایات اور کئی عوامل ہیں
جو انتخاب اصوات پر اثر انداز
ہوتے ہیں۔ شاعر کا اسلوب اصوات
کے خارجی ہیئت ہی میں ظاہر ہوتا اور
پہچانا جاتا ہے"[1]

مغنی تبسم نے فانی کے کلام کا صوتیاتی تجزیہ کیا ہوئے
اس بات کا انکشاف کیا ہے کہ ان کے ہر دور میں 'ا' 'ک' اور
'ر' سب سے زیادہ استعمال ہوئے ہیں۔ مغنی تبسم نے فانی کی شاعری
میں کلموں اور حروف کے انتخاب اور ان کی نحوی ترکیب میں تکرار
الفاظ پر بہت غور و فکر کر کے ہر دور میں تکرارِ الفاظ میں استعمال
کیے گئے صنائع کے خارج اور ان کی ادائیگی کو سامنے رکھ کر زوف
نگاہی سے تجزیہ کیا ہے اور تفہیم و تحسین کی خاطر صاف اور روشن
ترسیمی جدول بھی پیش کیے ہیں۔ پروفیسر اشرف رفیع لکھتی ہیں:

"شاعر کے اسلوب اور لہجے کی تعمیر میں
بحروں، اوزان اور ردیف و قوافی
سے بڑی مدد ملتی ہے۔ فانی کے صوتی
آہنگ کے مطالعہ میں بحور و اوزان
اور ردیف و قوافی کے ابواب نہایت
دلچسپ ہیں جنھیں لسانیاتی مباحث سے
دلچسپی ہیں وہ قاری بھی ان دونوں
ابواب کی روشنی میں فانی کے آہنگ
سے خوب لطف اندوز ہو سکتے ہیں"[2]

---

[1] ۔ پروفیسر مغنی تبسم۔ "فانی بدایونی۔ حیات شخصیت اور شاعری" ص ۳۲۰

[2] ۔ پروفیسر اشرف رفیع۔ مغنی تبسم۔ ایک مطالعہ۔ مشمولہ نذر مغنی تبسم
ص ۱۰۴

غزل مغنی تبسم نے تجزیے کے بعد اس بات کی وضاحت کی ہے کہ شاعر کا لہجہ، بحر اور ردیف و قوافی کے فراہم کردہ صوتی آہنگ کے نظام کے تابع ہوتا ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی کے مطابق:

"اس مقالے کا ایک بہت اہم حصہ
وہ ہے جس میں فانی کے طرز اظہار
کا تجزیہ کیا گیا ہے، اور ان کے
شاعرانہ اسلوب کے مخصوص پہلوؤں
کی نشاندہی کی گئی۔ یہاں بھی صوتیاتی
تجزیہ کے علاوہ، جو بذاتِ خود ایک
نئی چیز ہے، مغنی تبسم نے فانی کے
بارے میں بعض نئے اور دلچسپ
انکشاف کئے ہیں۔ مقالے کا ایک
طویل حصہ صوتیاتی اور کوروہ
اوزان کے مطالعے اور آہنگ کے
پیچیدہ مسائل پر بحث کی نذر کیا
گیا ہے۔ جدید اصولِ تنقید کو مغنی تبسم
نے جس طرح برتا ہے وہ انھیں کا حصہ ہے"[1]

مغنی تبسم نے فانی کے کلام کے تین ادوار میں دائرے بحریں اور اوزان کا تجزیہ کرتے ہوئے ایک جدول پیش کیا ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ فانی نے مختلف ادوار میں کون سی بحریں استعمال کی ہیں اور کون سے اوزان کس تناسب میں استعمال کیے ہیں۔

---

[1] شمس الرحمٰن فاروقی۔ تبصرہ۔ فانی بدایونی۔ حیات شخصیت اور شاعری
شب خون، جنوری ۱۹۷۰ء۔ ص ۷۶

فانی نے میر کی پندید ہ متدارک (فاعلن فاعلن فاعلن فاعلن) میں ۶۱۲ غزلیں کہی ہیں۔ چند بحروں میں خاص مضمرں اور مضمتوں کا مخصوص استعمال جن سے لہجے میں نکھار آجاتا ہے معنی تبسم نے اس کی بھی نشان دہی کی ہے۔

معنی تبسم کے مقالے کا آخری باب جس میں فانی کے کلام میں ردیف و قوافی کے استعمال کا تجزیہ کیا گیا ہے اس کے متعلق پروفیسر اشرف رفیع کہتی ہیں:

"ردیف و قوافی کا باہمی ربط و
ارتباط اور ان کی صوتی تنظیم سے
جہاں شاعر کے مزاج کا انکشاف
ہوتا ہے وہیں غزل کی نغمگی کا بھی
اظہار ہوتا ہے۔ اس باب میں
پروفیسر معنی تبسم نے قدیم علم قافیہ
پر کچھ تنقیدیں بھی کی ہیں۔ علم قافیہ
اور من و عروض ایک ایسا بحر ذخار ہے
جس میں ہزار بار غوطہ لگائیں
تو ایک آدھ موتی ہاتھ آتا ہے ان
ابواب میں معنی صاحب کئی موتی نکال
لاتے ہیں جن سے ان کی بصیرت بلند
آگہی جان سوز محنت، باریک بینی،
ہنرمندی اور حسن اظہار کا پتہ
چلتا ہے"[1]

---

[1] ۔ پروفیسر اشرف رفیع ۔ "معنی تبسم ایک مطالعہ ۔ مشمولہ نذر معنی تبسم ص ۱۰۴

اس مقالے کے متعلق پروفیسر رشید احمد صدیقی اس طرح رقمطراز ہیں:

"مقالے کی ممتاز خصوصیات میں سے
ایک یہ ہے کہ مقالہ لگا رہے ان
اشخاص سے ضروری اور مستند معلومات
فراہم کی ہیں جو فانی سے گہرا اور قریب
تعلق رکھتے ہیں اور بیانات اور
روایات کو پرکھنے کے جو اصول مقرر ہیں
ان کا لحاظ رکھنا ترتیب مقدمات
اور استخراج نتائج میں تحقیق
و تدقیق، دیانت و امانت کو
کہیں ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے میرا
خیال ہے کہ فانی پر اب تک کہیں اور اتنا
مستند مقالہ نہیں لکھا گیا۔"[1]

پروفیسر ضیا احمد بدایونی لکھتے ہیں:

"تحلیل نفسی کے ذریعے شاعر کے تخلیقی
جینیس، اس کی فکر اور جذبات کی
تعبیر و تفسیر، اس کی قوت ابلاغ، ڈکشن،
موزوں الفاظ و مصطلحات شعر کے
انتخاب، عروضی اور صوتی طریقوں کے
استعمال کا یہ جائزہ کسی بھی غیر جانبدار
قاری کو متاثر کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

اردو میں کسی شاعر پر اس قدر بسیط تنقید
بہت کم میری نظروں سے گزری ہے یقیناً یہ ایک عمدہ
شاعر کی خدمت میں عمدہ خراج تحسین ہے جو ایک عمدہ نقاد کی طرف سے پیش کیا گیا ہے"[2]

---

[1] ۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی ۔ "بازیافت" مقدمہ آخر
[2] ۔ پروفیسر ضیا احمد بدایونی ۔ "بازیافت" مقدمہ آخر

اس مقالے کے آخر میں کتابیات کے بعد فانی کی دو غزلیں جو ماہنامہ دستور (لاہور) مدیر دستور کو فانی کی یہ غزل فانی ہی کی تحریر میں دستیاب ہوئی تھی اس تحریر کا عکس انھوں نے اپنے رسالے میں شائع کیا تھا یہاں پیش کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور غزل جو ماہنامہ شاعر نومبر ۱۹۸۰ء کو شائع ہوئی تھی وہ بھی شامل کی گئی۔ ان دو غزلوں کے علاوہ فانی کے متفرق چھ اشعار اور ایک رباعی بھی ملتی ہے ایک انگریزی نظم کا منظوم ترجمہ "یادMemory" بھی ملتا ہے۔ جو مطبوعہ "نگار" جولائی ۱۹۴۰ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کے علاوہ فانی آخری زمانے میں جب وہ حیدرآباد آئے تھے اپنے مکلم کا انگریزی میں بھی ترجمہ کرنا شروع کیا تھا۔ چند رباعیاں اور غزلوں کے ترجمے کیے پھر کسی وجہ سے انھوں نے یہ خیال ترک کر دیا۔ ان غزلوں کے ترجمے ابن ملی صاحب کے پاس محفوظ رہ گئے تھے یہ ترجمے جو پروفیسر آل احمد سرور کے نوٹ کے ساتھ "اردو ادب" علی گڑھ جون ۱۹۵۶ء میں شائع ہوئے تھے مغنی تبسم نے ان دو غزلوں کو انگریزی ترجمے کے ساتھ اپنی کتاب میں پیش کیا ہے۔

"فانی بدایونی حیات شخصیت اور شاعری" اردو میں پہلی بار ایک ایسا مقالہ ہے جسے واقعی مقالہ کہا جا سکتا ہے۔ آپ نے صرف فانی کو Discover نہیں کیا بلکہ پڑھنے والوں کو سخن فہمی کے وہ ضابطے اور اسرار بتائے ہیں جن کا ہمارے ادب میں فقدان تھا۔

مغنی تبسم نے جتنی محنت اور تحقیق و جستجو کی وہ مشکل ہی سے کوئی کر سکتا ہے اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ آپ

نے فانی پر استناد کا درجہ حاصل کرلیا ہے ۔ فانی پر یہ مقالہ حرفِ آخر کی حیثیت رکھتا ہے اور آنے والے ان گنت دنوں تک طالب علموں، ناقدوں اور تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے مشعلِ راہ بنا رہے گا ۔ اس تحقیق کے علاوہ مغنی تبسم کی ایک اور گراں قدر تحقیق "فانی کی نادر تحریریں" ہے جس کو انھوں نے مرتب کرکے اردو تنقید کو میانہ روی کا درس دینے والے اور تنقید کو تحقیق کا ہم خیر بنانے والے پروفیسر آل احمد سرور کے نام معنون کیا ہے ۔ یہ کتاب دسمبر ۱۹۶۸ء میں مکتبہ "صبا" حیدرآباد کی جانب سے شائع ہوکر منظرِ عام پر آئی ۔

مغنی تبسم نے اپنے مقالے "فانی بدایونی ۔ حیات، شخصیت اور شاعری" کی تیاری کے دوران فانی کی چند ایسی نایاب تحریریں دستیاب کیں جن سے ادبی دنیا واقف نہیں تھی ۔ انھوں نے اپنے مقالے کی تکمیل کے بعد ان تمام تحریروں کی تلاش جاری رکھی اور اس سلسلے میں انھیں جو کچھ سرمایہ حاصل ہوا اس کو "فانی کی نادر تحریریں" کا نام دے کر اردو دنیا کو ایک چھپے ہوئے گوشہ سے واقف کروا کے اپنی ادب دوستی کا ثبوت دیا جو لائقِ تحسین ہے ۔ "فانی کی نادر تحریریں" اس مجموعہ میں فانی کی غیر مطبوعہ تحریریں پہلی بار شائع ہوئی ہیں ۔ اس کے علاوہ بعض مضامین خطوط اور منظومات جو کافی عرصہ قبل مختلف رسالوں میں شائع ہوچکی تھی اور اب دستیاب نہ ہونے کے برابر تھی انھیں بھی مغنی تبسم نے اپنے مجموعہ میں جگہ دی ۔

مغنی تبسم نے فانی کی تحریروں کو نظم اور نثر دونوں کو الگ الگ حصوں میں منقسم کردیا ہے ۔ "فانی کے خود نوشت حالات" یہ ایک نثری تحریر ہے جس کو انھوں نے نظم میں جگہ دی ہے ۔ کیوں کہ فانی نے اپنے ذاتی حالات مختصراً طور پر اپنے اشعار کے

انتخاب کے ساتھ قلم بند کیے تھے۔ جو ماہنامہ "نگار" کے ایک خاص نمبر میں شائع ہوئے تھے۔ مغنی تبسم کو فانی کی ان نادر تحریروں کو جمع کرنے میں جن لوگوں نے مدد کی ہے اور ان کی تحریروں اور ضروری معلومات کو بہم پہنچایا ہے ان میں حکیم محمتا راحمد بدایونی سبزواری، حضرت میکش اکبرآبادی، جناب ضیاالدین شکیب، جناب سلیمان اریب، ڈاکٹر وحیداختر، جناب کنور اخلاق، محمد خاں شہریار، جناب وقار خلیل اور فانی مرحوم کی بہو سعیدہ بیگم کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

حصہ نظم میں نقشِ فانی، ارمغانِ فانی، انتخابِ فانی، بیاضِ فانی شامل ہیں۔ نقشِ فانی میں فانی کے تربیتی دور کے کلام کا انتخاب کیا گیا ہے جو کلیاتِ فانی یا کسی اور مجموعے میں بھی شامل نہیں ہیں۔ مغنی تبسم نے فانی کی وہ بیاض حاصل کی جو فانی کے فرزند وجاہت علی خاں مرحوم کی بیوہ سعید صاحبہ کو ان کے بڑے بھائی سعادت علی خاں کے انتقال کے بعد ملی تھی۔ یقیناً یہ بیاض مغنی تبسم کے لیے نہایت قابلِ قدر سرمایہ تھی جس کو انھوں نے شائع کرکے ایک بہت بڑے شاعر کے کلام کو دنیائے ادب سے روشناس کیا۔ وحید احمد صاحب جنھوں نے دیوانِ فانی کو مرتب کیا تھا اپنے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ فانی نے ۱۹۰۶ء سے ۱۹۱۷ء تک شاعری سے کنارہ کشی اختیار کرلی تھی۔ لیکن مغنی تبسم نے بعض شہادتوں سے پتہ چلایا کہ فانی نے ۱۹۰۶ء کے بعد بھی پہلے کے مقابلے میں کم ہی سہی لیکن شعر کہتے رہے اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی قیاس آرائی کی کہ ہوسکتا ہے کہ فانی نے ۱۹۰۶ء سے ۱۹۱۷ء کے درمیان کبھی کبھار جو غزلیں کہی ہوں انھیں دیوان میں "قدیم" یا "جدید" کلام کے تحت شامل کردیا ہو۔

فانی کے غیر مطبوعہ کلام سے جو بیاض میں شامل تھی
اس کے مطالعہ سے انھوں نے فانی کے ذوقِ شعر گوئی کی ابتدائی
تربیت اور نشوونما کے مراحل کا اندازہ لگانے میں بڑی حد تک
کامیابی حاصل کی۔ امیر مینائی کی وفات پر فانی کے کہے گئے اشعار
سے ان کے معتقد اور مقلد ہونے کی حقیقت کو پیش کیا اس کے
علاوہ فانی نے امیر، داغ، جلال، تسلیم، سودا، آتش، ناسخ
اور مومن سے جو اکتسابِ ہنر سیکھا اور ان کے اسلوب کو اپنا کر
ان شعرا کی شاعری سے جو مضامین مستعار لی ہیں ان کی بہترین
مثالیں پیش کی ہیں۔

ارمغانِ فانی میں فانی کا وہ کلام جو کلیاتِ فانی
یا کسی اور مجموعہ میں شامل نہیں ہے اور ان کی غزلوں کے انگریزی
ترجمے بھی شامل کیے گئے ہیں۔

رازِ ہر جلوہ نہاں سازِ انا سازمیں ہے
حسنِ نظارہ ابھی پردۂ آوازمیں ہے

فانی کی یہ غزل مدیر "دستور" لاہور کو فانی ہی کی
تحریر میں دستیاب ہوئی تھی اور اس تحریر کا عکس انھوں نے اپنے
رسالے میں شائع کیا تھا۔ مغنی تبسم نے ایسی تمام غزلوں اور
تحریروں کی تلاش میں جاں توڑ محنت کرکے یکجا کیا ہے۔

پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی "فانی کی نادر تحریریں" پر تبصرہ کرتے
ہوئے لکھتے ہیں:

"فانی کی کم یاب تحریروں پر مشتمل
یہ چھوٹی سی کتاب ڈاکٹر مغنی تبسم نے
ترتیب و توضیح و تحشیہ کے بعد سلیقہ
سے شائع کی ہے۔ فانی بہت بڑے

شاعر نہ سہی، لیکن اہم اور اچھے شاعر
یقیناً تھے، مجھے اکثر یہ خیال آیا ہے کہ
فانی نے میر و غالب کا تتبع کرنے
اور ان کا امتزاج پیدا کرنے کی
کوشش غلط ہی کی، کیوں کہ ان کا
اسلوب اپنی بہترین منزل میں رزم
جذباتیت کا اسلوب تھا اور اصلاً
اسے مومن، ظفر اور داغ سے
علاقہ تھا۔ ان کے اوائلی دور
کے کلام کا انتخاب جو مغنی تبسم نے
پیش کیا ہے، اور خود مغنی تبسم
کی رائے میرے اس خیال کی تائید
کرتی ہے"[1]

فانی کے غیر مطبوعہ اشعار جسے ضیاالدین شکیب نے اپنی ایک خاندانی بیاض سے نقل کرکے انھیں عنایت کی تھی۔ بعض متفرق اشعار اور رباعی بھی پیش کی گئی ہیں۔ انتخاب فانی میں مغنی تبسم نے فانی کے خود منتخب کردہ اشعار اور خود نوشت کے طور پر اپنی مختصر حالات زندگی جو انھوں نے ماہنامہ "نگار" کے ایڈیٹر نیاز فتحپوری کی فرمائش پر اپنی وفات سے برس ڈیڑھ برس پہلے لکھے تھے جوں کا توں پیش کرکے ان کی زندگی کے بعض اہم گوشوں پر روشنی ڈالی ہے۔

بیاض فانی میں فانی کے پسندیدہ فارسی اشعار داخل ہے جسے فانی نے خود اپنے رسالے "تسنیم" میں "منتخبات فانی"

---

[1] - پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی۔ تبصرہ۔ "فانی کی نادر تحریریں" "شب خون" اگست ۱۹۶۹ء ص ۷۷

کے عنوان سے شائع کیے تھے ان کی پہلی اور دوسری قسط سے اندازہ
لگایا کہ فانی نے اپنے مذاق سخن اور نظریۂ حیات کے مطابق
کلام کا انتخاب کیا ہے۔ اور پھر اس سے فانی کی فارسی شاعری سے
دلچسپی کا بھی اندازہ لگایا ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ فارسی کے شعرا
جن کا کلام فانی کے زیر مطالعہ رہا اس کا بھی سیر حاصل جائزہ لیا
گیا ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی اپنے تبصرہ میں اس طرح رقمطراز ہیں۔

"فانی کا کارنامہ یہ ہے کہ آئندہ
چل کر انھوں نے عشقیہ شاعری کو وقار
بخشا اور انفعالی شاعری میں بھی
ضبط و احتیاط سے رشتہ نہ توڑا۔
فانی کا مزاج اصلاً میر و غالب
دونوں سے بے گانہ تھا۔ چناں چہ
مغنی تبسم نے ان کے بارے میں
(فارسی) اشعار کی جو فہرست دی ہے
اس میں غالب، بیدل، عرفی،
سعدی کا ایک بھی شعر نہیں ہے۔
صائب اور کلیم کے شعر البتہ ہیں،
لیکن کلیم سے انھوں نے ایک ہی
غزل کے چار شعر اور ایک غزل کا
ایک شعر لیا ہے۔ صائب کے چھ شعر ہیں،
مختلف غزلوں کے۔ نظیری اور آملی
کے بالترتیب سات اور تین شعر ہیں۔
خسرو اور حافظ کا ایک شعر ہے،

دونوں بہت مشہور ۔ صائب اور
کلیم کے بھی کچھ اشعار اسی طرح کے ہیں۔
بقیہ اشعار گم نام شاعروں کے ہیں۔
نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ان کی نگاہ
انتخاب ان شعروں پر زیادہ
پڑی جو معصوم سادگی لیکن
وقار کے حامل تھے ۔ ماورائی،
جذباتیت، دونوں سے انھیں
کوئی علاقہ نہ تھا"[1]

"فانی کی نادر تحریریں" کا حصہ دوم نثر پر مشتمل ہے۔
جس میں فانی کے دو تنقیدی مضامین "شعر و شاعری" اور
"موازنۂ نظم و غزل" کے علاوہ فانی کی تیسری تحریر سیماب
اکبر آبادی کی تالیف "دستور الاصلاح" پر مختصر تبصرہ بھی
شامل ہے۔ "شعر و شاعری" یہ مضمون دراصل ایک ریڈیائی
تقریر تھی جسے فانی نے اپنی وفات سے چند ماہ قبل نشر کیا تھا۔
اس مضمون کے مطالعہ کے بعد مغنی تبسم کا کہنا ہے کہ فانی کے
نزدیک شاعری کا مرتبہ دوسرے فنونِ لطیفہ سے بلند تھا۔ فانی
کے خیال میں شاعری کو فن کہنا شاعری کی توہین ہے اور شاعری
فطرت کی امانت ہے۔ حقیقی شاعر مستقبل کا انسان ہوتا ہے وہ
بنتا نہیں پیدا ہوتا ہے۔ شعریت کو فانی نے شاعری کا بنیادی لازمہ
قرار دیا ہے۔ مغنی تبسم نے شبلی کے شعری نظریہ کو فانی کے نظریہ
شعر سے ملتا جلتا قرار دیا ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی

---

[1] ۔ پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی۔ تبصرہ "فانی کی نادر تحریریں" شب خون، اگست 1969ء
ص ۔ ۷۷، ۷۸

کہا کہ حالی اور شبلی کی طرح فانی بھی وزن کو شعر کے لیے ایک اضافی چیز سمجھتے تھے۔ فانی کہتے ہیں کہ "شعر کا حاصل خود شعر ہے" اس کا مطلب مغنی تبسم کے نزدیک فن برائے فن ہیں اور نہ ہی شعر کسی محدود اور موقتی مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے اور پھر خود فانی نے بھی اس مضمون میں اپنے خیال کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے

"شعر کا تعلق کسی قوم یا کسی خاص شعبۂ زندگی تک محدود نہیں رہ سکتا۔ وہ بنی نوعِ انسان بلکہ تمام عالم موجودات کے وجود اور اس کے غیر محدود کشاکشِ حیات سے تعلق رکھتا ہے"[1]

اس وجہ سے بعض نقادوں میں اختلاف پیدا ہوا تھا اور انھوں نے یہ سمجھا کہ فانی شاعری کو سماج کے لیے فائدہ چیز سمجھتے تھے۔ اس سلسلے میں فانی کیا کہنا چاہتے تھے اس بات کو مغنی تبسم اس انداز سے واضح کرتے ہیں کہ شاعری سے شاعر کو مادی فائدہ حاصل نہیں ہوتا کیوں کہ حقیقی شاعر کی قدر اس کی زندگی میں بہت کم ہوتی ہے ورنہ وہ شعر کی افادیت کے بہت زیادہ قائل تھے۔ اور پھر انھوں نے ایسی شاعری کی سخت الفاظ میں مزمت کی ہے جس سے محض من گھڑت اور زبان پر مہارت کا اظہار مقصود ہوتا ہے۔ اس طرح جو شعر کہا جاتا ہے وہ خاموش مگر قاتلِ زہر ہے جو ملک اور قوم کو بالآخر تباہ کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس طرح انھوں نے یہ ظاہر کیا ہے کہ فانی شاعری کو بے مقصد چیز نہیں سمجھتے تھے اور ان کا خیال تھا کہ شاعری میں وہ محدود مقصدیت بھی نہیں ہونا چاہیے

---

[1] ۔ پروفیسر مغنی تبسم۔ "فانی کی نادر تحریریں" مضمون "شعر و شاعر" ص۔ 97

جو موقتی سیاسی اور سماجی تحریکات کے تابع ہوتی ہے ۔ فانی نے شاعری کے مقصد کی وضاحت کے لیے جو بات بتائی ہے وہ فانی کے الفاظ میں ہی انھوں نے پیش کی ہے

"حقیقی شاعری کبھی زمانے کے ساتھ
نہیں بدلتی ہاں زمانے کو کبھی بدل
دیا کرتی ہے" [1]

فانی کے اس خیال کی وضاحت مغنی تبسم نے اقبال کے اس شعر سے کی ہے ؎

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا

"موازنہ نظم غزل" فانی کا یہ مضمون بھی ایک ریڈیائی تقریر تھی جس کو انھوں نے اپنی وفات سے چند روز قبل قلمبند کیا تھا۔ مغنی تبسم کو اس مضمون کا ادھورا مسودہ خود فانی کی تحریر میں دستیاب ہوا تھا لیکن اس کے ابتدائی صفحات موجود نہیں تھے۔ فانی کے ان دو مضامین کے مطالعہ کے بعد مغنی تبسم نے نہ صرف فانی کے نظریۂ شعر پر روشنی ڈالی ہے بلکہ ان کے تخلیقی رویے کو سمجھنے اور فانی کی شاعری کی صحیح قدر و قیمت جاننے کی بھی کامیاب کوشش کی ہے۔

اسی اثنا کے دوران مغنی تبسم کو دستور الاصلاح جو سیماب اکبر آبادی کی تصنیف ہے جس پر فانی نے تبصرہ کیا تھا حاصل ہوئی۔ فانی نے "دستور الاصلاح (از سیماب اکبرآبادی) پر ایک نظر" کے عنوان سے اس کتاب کے متعلق کہا کہ یہ کتاب

---

[1] ۔ پروفیسر مغنی تبسم "فانی کی نادر تحریریں" "مضمون شعر و شاعر" ص۔101

صرف تلامذہ ہی کی حد تک تا بلِ استفادہ نہیں بلکہ اساتذہ فن کے لیے بھی بہت مفید ہے۔ اس کتاب میں دورِ قدیم سے عصرِ حاضر تک کے اساتذہ کی اصلاح کے نمونے پیش کیے گئے ہیں۔ مختصر طور پر اس تصنیف پر اپنی آرا دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس کتاب سے ضرور استفادہ کرنا چاہیے۔ اس کے بعد اداریہ پیش کیا گیا ہے جس میں رسالہ ماہنامہ "تسنیم" کے پہلے شمارے میں اداریہ بعنوان "گزارش" جو خود فانی ہی کی تحریر تھی۔ اس تحریر کو دیکھ کر میکش اکبر آبادی نے کہا تھا کہ شاعری میں جو فن کاری اور نوک پلک ان کے یہاں ہے وہی ان کی نثر میں بھی تھی۔ مغنی تبسم نے اس رسالے کے بند ہونے کے اسباب مالی خسارہ بتایا ہے۔ جس کی وجہ سے ۱۹۳۲ء کے بعد یہ رسالہ ہمیشہ کے لیے شائع ہونا بند ہو گیا۔ اس کے بعد بیادِ شاد کے شخصی تاثرات کا خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ مغنی تبسم نے یہ خاکہ حیرت بدایونی سے انٹرویو کی مدد سے پیش کیا ہے۔ اس کے بعد فانی کے خطوط پیش کیے گئے ہیں۔ اس سلسلے میں مغنی تبسم کو جو سرمایہ حاصل ہوا ہے وہ اتنا کم ہے کہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ ان خطوط سے فانی کے مخصوص اسلوب اور لہجہ کی بلند آہنگی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ ان خطوط سے فانی کی زندگی کے بعض گوشوں پر بھی روشنی ڈالی جا سکتی ہے۔ جس سے ان کی شخصیت اجاگر ہوگی۔ ان خطوط میں پہلا خط علی گڑھ میگزین کے ایڈیٹر کے نام ہے۔ دوسرا خط بھی علی گڑھ میگزین کے ایڈیٹر ہی کے نام چھپا ہے۔ اس کے علاوہ میکش اکبر آبادی کے نام فانی کا خط بھی شامل ہے جو فانی کے آگرے کے زمانہ قیام کی ایک یادگار رہا۔ حکیم مختار احمد بدایونی سبزواری

کے نام فانی کے دو خطوط (تیسرا اور پانچواں) جو پہلی بار علی گڑھ میگزین فانی نمبر ۱۹۶۱ء میں شائع ہو چکے تھے۔ اس کے علاوہ پہلا دوسرا اور تیسرے کے ساتھ نقوش (لاہور) کے مکاتیب نمبر (جلد دوم) میں شائع ہوا تھا۔ الطاف علی بریلوی کے نام خط بھی شامل ہے۔ یہ تحریر اس زمانے کی ہے جب فانی کا تبادلہ ضلع حیدرآباد پر کر دیا گیا تھا۔ عشرت علی خاں کے نام فانی کے پانچ خطوط مغنی تبسم کو "نقوش" لاہور سے حاصل ہوئے ان میں فانی کا تیسرا خط موجود تھا جو انھوں نے اپنی بیوی کے انتقال کے بعد تحریر کیا تھا۔ اس کے بعد فانی کے خطوط کی اہمیت اس لحاظ سے بھی قابل قدر ہو گئی تھی کہ اس میں فانی کے آخری زمانۂ حیات کے مصائب اور روحانی کرب کی منہ بولتی تصویریں سامنے آجاتی ہے۔ چوتھا خط زاہد سعید خاں لودی کے نام ہے۔ مکاتیب فانی کا سب سے آخری خط کنڈولر لنسنگا حیدرآباد کے نام جو فانی کی وفات سے چند روز قبل تحریر کیا ہوا تھا۔ مغنی تبسم کو اس خط کا صرف ملا جو کہیں شائع نہیں ہوا تھا۔ اس خط کے بعد فانی کا ہی انتقال ہو گیا۔

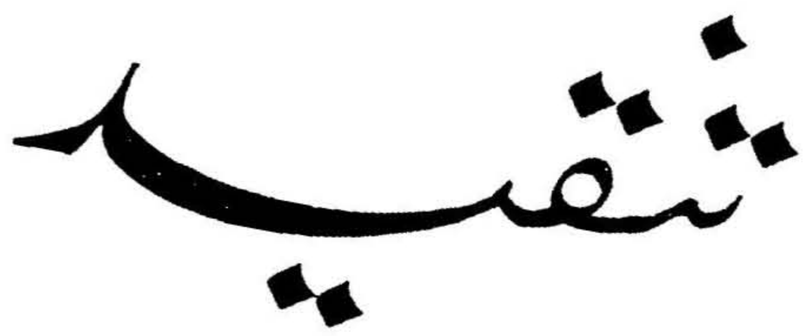

تنقید کے معنی کھوٹا کھرا پرکھنا یا بُرے بھلے کا فرق
معلوم کرنا ہے ۔ اصطلاح میں محاسن اور مصائب کا صحیح اندازہ
کرنا اور اس پر کوئی رائے قائم کرنا تنقید کہلاتا ہے ۔ ایک تنقید نگار
میں بیک وقت ایک پڑھنے والے، سمجھنے، پرکھنے اور تشریح کرنے والے
ایک مصنف کی تمام خصوصیات جمع ہونی چاہیے ۔ کیوں کہ تنقید انھیں
تمام چیزوں سے مرکب ہوتی ہے ۔ مختلف لوگوں نے تنقید سے متعلق
مختلف نظریے قائم کرلیے ۔ بعض لوگ تنقید کو محض تعریف اور
مدح سرائی کا ذریعہ سمجھتے ہیں. بعض تشریح کو تنقید سمجھتے ہیں
اور بعضوں کا خیال ہے کہ تنقید ایک قسم کے تجزیے کا نام ہے.
تنقید کا اولین اصول یہ ہے کہ وہ ذاتی بغض و عناد سے پاک ہو
لیکن تنقید کے متعلق یہ خیال کرلینا کہ وہ نکتہ چینی کا دوسرا نام ہے
یا یہ کہ وہ فنکاروں کی غلطیاں نکالنا ہے صحیح نہیں ہے لیکن یہ
غلط فہمی عام ہے . اس کے نیچے میں نقاد اچھے نام سے یاد نہیں کیے جاتے. مثلاً
ا۔ "DARYDAN" جو خود بھی ایک نقاد تھا اس نے اس خیال کا

اظہار کیا ہے کہ نقادوں میں نزاعت کا جذبہ بہت زیادہ شدید ہوتا ہے۔
جس کے باعث وہ اچھائیوں سے بھی چشم پوشی کر جاتے ہیں۔
۲۔ "EMERSON" نے لکھا ہے کہ نقاد وہ شخص ہوتا ہے
جس کو شعر گوئی میں ناکامی ہوتی ہے اور اس ناکامی کے بعد جھنجھلا
کر وہ تنقید نگاری کا پیشہ اختیار کرتا ہے۔
۳۔ بائرن کا خیال ہے کہ ہر ناممکن بات کے متعلق یقین کر لو قبل اس کے
کہ تم نقادوں پر بھروسہ کرو۔ علی احمد جلیلی کا خیال ہے

"اردو میں تنقید مغرب کی دین ہے۔
مغربی ادب ہی نے اس کے اصول
وضوابط دیئے ہیں۔ اردو کے قدیم
دور میں تنقیدی ادب کا کوئی
شعبہ جدا نہ تھا۔ صرف چند شعرا"
میر تقی میر کی "نکات الشعرا"
مصحفی کی "تذکرہ ہندی گویاں" اور
شیفتہ کی "گلشن بے خار" میں اس
کے خدوخال ملتے ہیں۔ محمد حسین آزاد
پہلے شخص ہیں جنھوں نے "آب
حیات" میں تنقید کی طرف قدم
اٹھایا لیکن حقیقت میں حالی کی
تصنیف "مقدمہ شعر وشاعری"
سے تنقید نگاری کی ابتدا ہوئی۔
حالی پہلے نقاد ہیں جنھوں نے سائنٹفک
رجحان کو پیش نظر رکھا۔ شبلی حالی
سے زیادہ مغرب آشنا تھے۔

موازنۂ انیسؔ و دبیرؔ کی اہم تنقیدی

کتاب ہے"[1]

مغنی تبسم کے تنقیدی مضامین کے دو مجموعے پہلے

"آواز اور آدمی" مئی/۱۹۸۳ء اور "لفظوں سے آگے"

دسمبر ۱۹۹۳ء میں منظرِعام پر آچکے ہیں۔ ان دونوں

سے کافی عرصہ پہلے ان کے مختلف تبصرے "بازیافت" کے عنوان

سے ۱۹۶۹ء میں شائع ہو چکے ہیں۔ "بازیافت" سے "آواز اور

آدمی" اور پھر اس کے بعد "لفظوں سے آگے" کا مطالعہ کرتے

ہوئے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ نقاد مغنی تبسم کا ذہنی سفر کن

منزلوں سے ہمکنار رہا ہے۔ اس کے علاوہ مغنی تبسم کے تنقیدی

مضامین بھی ہیں جو مختلف رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ "آواز

اور آدمی" اس تنقیدی مجموعے کو مغنی تبسم نے والدۂ مرحومہ

اور رفیقۂ حیات ناز صدیقی مرحومہ کی یاد میں معنون کیا ہے۔

"آواز اور آدمی" بڑا ہی معنی خیز عنوان ہے جو مغنی تبسم کے

موضوعاتی تجزیہ و تحلیل کے رویہ سے ہم آہنگی پیدا کرتا ہے۔ اس

کے بعد ایک خوب صورت نظم پیش کی گئی ہے۔ ملاحظہ کیجیے۔

کوئی آواز جیسے قطرہ قطرہ نغمگی ٹپکے

کوئی آواز کوئل کی صدائے مضطرب افسردہ، آوارہ

کوئی آواز نغماتِ طرب کا ڈوبتا سایہ

کسی آواز میں ساری لگاوٹ تاجرانہ، عجز سرتاسر گدایانہ

مرے اطراف چہروں کا سمندر ہے

---

[1] ۔ ڈاکٹر علی احمد جلیلی۔ اردو تنقید کا ایک جائزہ "سب رس" ماہنامہ حیدرآباد
اگست ۱۹۸۹ء

ہر اک چہرہ ہے اک لمحہ شب و روزِ تمنا کا
ہر اک لمحہ صدا دیتا ہے
ہر آواز کرتی ہے تعاقب دوسری آواز کا
بازیچۂ اصوات ہے دنیا
یہ سب چہرے کسی سازِ شکستہ کی صدائیں ہیں
اس بہترین نظم کے بعد

YOU VOWELS 'A' THE
BLACK WHITE 'E'
GREEN 'U' BLUE 'O'
SOME DAY WILL I
REVEAL YOUR
NATIVITY
(RIMBAUD)

اس تنقیدی مجموعے میں گیارہ مضامین شامل ہیں۔
ان مضامین کو تین زمروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اسلوبیاتی اور فنی تنقید کے پہلے زمرے میں چار مضامین شامل ہیں۔ جن میں پہلا "اصوات اور شاعری" دوسرا "قافیہ" تیسرا غالب کا آہنگِ شعر اور بحروں کا استعمال اور چوتھا غالب کی شاعری میں بازیچۂ اصوات۔ اسی طرح دوسرا زمرے میں آنے والے مضامین جدید شاعری سے متعلق ہیں جن میں تین مضامین شامل ہیں۔ پہلا "محمد علوی، گھر اور جدید غزل" دوسرا "جدید اردو غزل کی لفظیات" اور تیسرا "آئینہ۔ اردو غزل کا ایک مقبول استعارہ" تیسرے زمرے میں چار مضامین

شامل ہیں جو عام تنقید سے متعلق ہیں۔ ان میں پہلا "اقبال اور غزل" دوسرا "حسرت کی غزل گوئی کے چند پہلو" تیسرا "کلام غالب میں اسالیب کی آویزش" اور چوتھا مضمون "تیر کا لہجہ" شامل ہیں۔

یوں تو مغنی تبسم نے تنقید نگاری کے میدان میں قدم اسی وقت رکھا تھا جب "فانی بدایونی: حیات شخصیت اور شاعری" منظر عام پر آئی تھی۔ اس مقالے میں انھوں نے جس طرح فانی کے کلام کا صوتیاتی تجزیہ کیا تھا اردو میں پہلی بار اس تغیر و بسیط کے ساتھ کسی شاعر کے کلام کا لسانیاتی و صوتیاتی تجزیہ پیش کیا گیا تھا۔ تنقید کا یہ بالکل نیا تجربہ مغنی تبسم کی پہلی کوشش تھی جس کو عام طور سراہا گیا۔ فانی کی شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے آخر میں مغنی تبسم لکھتے ہیں کہ فانی:

"الفاظ کے معنوی اور صوتی حسن کے بڑے اداشناس تھے اور ان اداؤں سے اپنی شاعری کے نگارخانہ کی زیبائش بڑھانے میں خاصی مدد لیتے تھے۔ لفظ کی تکرار سے معانی کی دنیا آباد کرنا اور تکرار اصوات سے نغمے بکھیرنا فانی کے اسلوب کا خاص وصف ہے"[1]

"آواز اور آدمی" اس کتاب کے متعلق ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ کے خیالات ملاحظہ کیجیے۔

---

[1] ۔ ہرومیر مغنی تبسم ۔ فانی بدایونی ۔ حیات شخصیت اور شاعری ۔ ص ۔ ۵۶۳

"غالباً اس امر کا ذکر بیجا نہ ہوگا کہ
ادب پر لسانیات، بالخصوص صوتیات
کے اطلاق کا آغاز بہت پہلے پروفیسر
محمود حسین خاں کے علمی مضامین
و مقالات سے ہو چکا تھا اور
اسلوبیات" یا لسانی اسلوبیات
کے نام سے اردو میں اس علم
کی ایک باقاعدہ شاخ قائم ہو چکی تھی۔
ڈاکٹر مغنی تبسم کا کارنامہ یہ ہے کہ
انھوں نے ادب پر لسانیات
و صوتیات کے اطلاق کو تمام کیا
اور اسلوبیاتی تجزیہ و تحلیل
کے کام کو آگے بڑھایا جس کے
بہترین نتائج سامنے آئے۔ آج
اردو میں یہ موضوع خاصا مقبول
ہے۔ اور کئی اچھے لکھنے والے اس کی
جانب اپنی توجہ مرکوز کر چکے ہیں۔
حالیہ دور میں اسلوبیات کے
موضوع پر نہ صرف کئی اچھے مقالے
لکھے گئے بلکہ کئی بہترین کتابیں بھی
منظر عام پر آئیں۔ ڈاکٹر مغنی تبسم
کی تصنیف "آواز اور آدمی" اسی
سلسلے کی ایک کڑی ہے[1]۔

---

[1] ۔ ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ "آواز اور آدمی" مشمولہ نذر مغنی تبسم
ص ۔ ۴۱۰

اصواتِ شاعری" یہ مضمون مغنی تبسم کے صوتی و صرفی درک کا ٹھوس ثبوت پیش کرتے ہیں۔ وہ نہ صرف ادب اور زبان کی نزاکتوں سے واقف ہیں بلکہ زبان کی ساخت اور اس کی توضیع پر بھی ان کی بہت گہری نظر ہے اور یہاں اٹھائے گئے موضوعات صوتی رمزیت، بحور، موسیقیت، اوزان اور ردیف وقوافی پر بھی یہی بات عائد ہوتی ہے۔ تنقید کے اس نظریے کے پیشِ نظر ہروِمیر گیان چندجین کہتے ہیں:

"پندرہ بیس سال پہلے اہلِ لسانیات
نے ریاضیاتی ڈھنگ پر شاعری
کے تجزیے اور تاویل کی کوشش
کی جسے اسلوبیاتی یا ہیئتی تنقید
کہا گیا۔ اس میں بعض مصرعوں
اور مصوتوں کے کم یا زیادہ ہونے
یا بالکل نہ ہونے سے کچھ نتائج اخذ
کیے جاتے ہیں۔ اس انداز تنقید
میں ہندوستان میں ڈاکٹر مسعود حسین خاں،
ڈاکٹر مغنی تبسم اور ڈاکٹر
گوپی چند نارنگ ممتاز رہے ہیں"[1]

اس مضمون میں مغنی تبسم نے اُردو کے تمام مصوتوں اور مصمتوں کی وضاحت اور طرزِ ادائیگی اور مخارج کو مدِنظر رکھتے ہوئے اس کی درجہ بندی کی ہے۔ اس کے علاوہ ان کے صوتی و سماعی اثرات اور ان کی رمزیت و موسیقیت کا

---

[1] ہروِمیر گیان چندجین۔ آواز اور آدمی۔ مشمولہ نذرِ مغنی تبسم
ص۔ ۴۰۳

بھی جائزہ لیا گیا ہے۔ شعری اسلوب کے صوتیاتی پہلوؤں پر
مغنی تبسم سیر حاصل روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

"یہ ایک حقیقت ہے کہ شعر کی ہیت
میں اصوات کو بنیادی مقام
حاصل ہے۔ شعر کی خارجی موسیقی
اصوات ہی کی مخصوص ترتیب سے
تشکیل پاتی ہے۔ شاعر اصوات
کے بامعنی مجموعوں کے ذریعے اپنے
جذبات کا اظہار کرتا ہے اور
ہم ان آوازوں کو سن کر شعر سے
متاثر ہوتے ہیں"[1]

انھوں نے شاعری کا مطالعہ صرف موضوع اور
مفہوم تک محدود نہیں رکھا بلکہ اس کے علیحدہ علیحدہ اجزا ہیئت اور
آہنگ کا جائزہ بھی بخوبی لیا ہے۔ اس کے علاوہ شعر کی غنائیت
کی تشکیل میں صوتی کیفیات، تکرار اصوات، بحر کا آہنگ
اور ردیف و قوافی حصہ لیتے ہیں۔

مغنی تبسم نے اردو زبان کے صوتی نظام کو مدنظر
رکھتے ہوئے اردو شاعری کے آہنگ کا صوتیاتی نقطہ نظر سے
مطالعہ کیا ہے۔ اردو ایک ریختہ زبان ہے اور اس کی بنیاد میں
ہند آریائی اصوات کا نظام ہونے کے باوجود اس پر عربی فارسی
کے لسانی اثرات کی شدت نے نفوذ کو اصوات تک پہنچا دیا۔
اور خالص عربی صوت "ق" خالص فارسی صوت "ژ" اور

---

[1] ۔ پروفیسر مغنی تبسم ۔ آواز اور آدمی ۔ اصوات شاعری ۔ ص ۱۰

عربی و فارسی کی مشترک اصوات ف ، ز ، خ اور غ کی داخلیت کی وجہ سے اُردو کا صوتی نظام ہندوستان کی بڑی زبانوں کے صوتی نظام سے مختلف ہے۔

مغنی تبسم نے اردو مصمتوں کی بہ اعتبار مخارج اور بہ اعتبار ادائیگی مخارج کے اعتبار سے جو دس قسمیں پیش کی ہیں وہ اس طرح ہیں ۔ ۱۔ دولبی ۲۔ لب دندانی ۳۔ دندانی ۴۔ لثوی ۵۔ کوز ۶۔ حنکی ۷۔ غشائی ۸۔ لہاتی ۹۔ حنجروی ۱۰ حلقی ہیں ۔ اس پس منظر میں انھوں نے اردو کے اصوات کا باریک بینی سے جائزہ لیا ہے جو جزیاتی بھی ہیں اور اس پر مختلف اصوات کے زیر اثر شعر کے آہنگ پر سلسلہ وار اثرات بھی شامل ہیں اور نیز مصموع ہکار مصمتوں ، کوز مصمتوں ، بندشی مصمتوں ، پہلوی مصمتوں ، ارتعاشی مصمتوں ، صفیری مصمتوں کے استعمال سے شاعری پر مرتب ہونے والے اثرات بھی پیش کیے گئے ہیں ۔ غرض مغنی تبسم نے مختلف بحروں میں مصمتوں کی نہ صرف گنجائش بلکہ ارکان کی نوعیت اور تعداد سے بھی بحث کی ہے ۔ اس سلسلے میں مغنی تبسم نے اردو عروضیوں کے اُن مشاہدات پر بھی غور کیا ہے جن پر ہمارے اساتذہ نے عمل کیا ہے۔ ان میں چھوٹے مصوتوں کا حذف جائز اور لانبے مصوتوں والے الفاظ میں شامل ہیں۔ صوتی رمزیت اور موسیقیت میں انھوں نے لفظ سازی کے تمام طریقوں کا بھرپور جائزہ لیا ہے ۔ مغنی تبسم کہتے ہیں :

"اکثر زبانوں میں ایسے الفاظ
موجود ہیں جو تقلید صوت کے
طریقے ۔ فجائی اظہار ، پر وجود

میں آئے۔ یہ نظرے ہماری
توجہ زبان کی صوتی رمزیت کی
طرف مبذول کراتے ہیں۔ اس
نقطۂ نظر سے جب ہم زبان کی
اصوات کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ
محسوس ہوتا ہے کہ بعض الفاظ کا
سماعی تاثر معانی سے پیدا
ہونے والی کیفیات سے مطابقت
رکھتا ہے"[1]

مصوتوں اور مصمتوں کی باہم ترتیب و تنظیم سے بحور اور اوزان کے وجود کا بھی مغنی تبسم نے میر، آتش، غالب، ذوق، فانی، امیر اور تسلیم کے اشعار سے بھرپور جائزہ لیا ہے۔ اسکے علاوہ ان شعرا کے مطلعوں میں للبے مروان اور چھوٹے مصوتوں کا بھی تناسب جدول میں تجزیہ کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ مغنی تبسم نے یہ بھی کہا ہے کہ شعر میں لے، نغمگی روانی اور خاص سماعی کیفیت پیدا کرنے میں مصوتے اہم حصہ لیتے ہیں۔ شعر کی روانی اور غنائیت کا انحصار بڑی حد تک مصمتوں کے مقابلے میں مصوتوں کی کثرت پر ہوتا ہے۔ غرض انھوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ اصوات کی بندشی کیفیت سے شاعروں نے ایمائیت اور محاکات کا تاثر پیدا کرنے میں مدد لی ہے۔

غزل کی موسیقیت کو بڑھانے میں خاص کر یا بند

---

[1] ۔ پروفیسر مغنی تبسم۔ "آواز اور آدمی" مشمولہ اصوات اور شاعری
ص ۔ ۲۳

شاعری میں ردیف اور قافیہ اہم حصّہ ادا کرتے ہیں۔ قافیہ اور ردیف کی مختتم صوت م، ن، ر، یا، ل جیسے بجتے ہوئے مصرعوں میں ردیف و قوافی کے زیادہ خوش آہنگ کے امکانات کو پیش کیا ہے۔ مغنی تبسم کے بموجب:

"اب ضرورت اس بات کی ہے کہ
ہماری زبان کی اصوات ان کی
ترتیب اور تکرّر کو ملحوظ
رکھتے ہوئے صوتیاتی نقطۂ نظر
سے علمِ بلاغت، علمِ بدیع،
عروض اور علم قافیہ کو از سرِ نو
مدوّن کیا جائے ——————
ہمارا من شاعری جو تقلیدی اور
روایتی ہونے کی وجہ سے از کار
رفتہ ہوتا جا رہا ہے اسے اگر
سائنٹفک بنایا جائے تو وہ
ہیئت اور آہنگ کے نئے تجربوں
میں بھی ہماری رہنمائی کر سکے گا"[1]

اس ضمن میں پروفیسر مغنی تبسم ان چند کا ذکر کرتے ہیں کہ مغنی تبسم اسلوبیاتی تنقید کی افراط سے بچتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ علم عروض و قافیہ کے ماہر بھی جانے جاتے ہیں:

"میں نے اس قسم کے مضامین کو
اسلوبیاتی کے ساتھ فنی بھی کہا ہے۔

---

[1] پروفیسر مغنی تبسم۔ "آواز اور آدمی"، "اصوات اور شاعری"، ص ۳۳

کیوں کہ ان میں مغنی صاحب ایک
ماہر لسانیات، ماہر عروض اور
ماہر قافیہ کی حیثیت سے سامنے
آتے ہیں - میرا خیال تھا کہ مغنی
صاحب عروضیات میں شدید
رکھتے ہیں - عروض اور قافیے کے
علم کے بارے میں دور تک بھی
گمان نہ تھا کہ وہ ان میں بھی
نظر رکھتے ہیں - ان مضامین میں
انھوں نے پوری قدرت کے ساتھ
مہارتِ لسانیات اور عرفان
عروض کا ثبوت دیا ہے - جدید
کے ساتھ قدیم کا یہ امتزاج
خوش گوار ہے" [1]

"قافیہ" اس مضمون میں بھی مغنی تبسم نے نہایت گہرائی اور گیرائی کے ساتھ علم قافیہ اور اس کے تمام پہلوؤں کو زیر بحث لایا ہے۔ انھوں نے مکرر لائے جانے والے مصرعوں اور مصمتوں کی تعداد میں تبدیلی اور ان کی ترتیب کے فرق سے مختلف آہنگ کے قافیوں کے نمونے پیش کیے ہیں۔ مغنی تبسم کے ہاں قافیہ ایک سادہ سی تنظیم ہے - جسے کو قدما نے غیر ضروری مرصع قافیوں سے پیچیدہ بنا دیا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے نزدیک علم قافیہ کی حیثیت اول

---

[1] - ہر و منیر گیان چند جین - آواز اور آدمی" مشمولہ نذر مغنی تبسم
ص ۴۰۴

ٹیڑھی ہے اور یہ علم چند غلط مفروضات پر قائم ہے۔ انھوں نے قافیہ کے متعلق ماہرین قافیہ کے بعض فروگذاشتوں کی بھرپور نشاندہی کی ہے۔ مثلاً حرفِ روی کے بارے میں یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

"ماہرین علمِ قافیہ نے لفظ کے با
معنی جزو کے حرفِ آخر کو روی
ٹھہرا کر اس کے قبل اور بعد آنے
والے حروف کے مختلف
نام دیے ہیں۔ موتی لفظ، نظر
سے قافیہ میں معنی کی رعایت
رکھنا ہی غلط ہے۔ اس اعتبار
سے حرفِ روی خود غیر معتبر ٹھہرتا ہے
اور سارے علم قافیہ کی بنیاد
اکھڑ جاتی ہے"[1]

صوت سے قافیہ کا تعلق ہونا چاہیے یا نہیں۔ آگے ماہرین علم قافیہ نے جو شرط لگائی ہے وہ دیکھیے:

"ایک طرف تو وہ قافیہ کے لیے الفاظ مختلف کی
شرط لگاتے ہیں، دوسری طرف
اگر ایک لفظ کئی بار مختلف معنوں
میں آئے تو اسے قافیہ مانتے ہیں
مثلاً
بھیجی ہے مجھ کو شاہِ جم جاہ نے دال
ہے لطف و عنایاتِ شہنشاہ پہ دال

---

[1] پروفیسر مغنی تبسم - آواز اور آدمی" قافیہ ص ۳۹

اس شعر میں "دال" حرتی
اعتبار سے قافیہ بنتا ہو سکتا لیکن
ماہرین علم قافیہ اس پر معترض
نہیں ہوتے"[1]

قافیہ کے باب میں مغنی تبسم نے حروفِ قافیہ کی حرکتوں کا بیان بتایا ہے جس میں انھوں نے قافیہ کی چھ قسمیں بتائی ہیں ان میں توجیہ، مجرے، رس، اشباع، حذو اور نفاذ شامل ہیں۔ حروف قافیہ کا مکمل جائزہ لینے کے بعد مغنی تبسم قافیہ کے عیوب کا تجزیہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں:

"ماہرینِ علم قافیہ نے عیوب
قافیہ کے بیان میں سب سے
زیادہ ٹھوکریں کھائی ہیں"[2]

صوتی اعتبار سے انھوں نے قافیہ کا پہلا عیب اقوال کا کہا ہے اور اسی سلسلے میں قافیہ کا دوسرا عیب اکفا قرار دیا ہے۔ مغنی تبسم کے الفاظ میں:

"'تزاق' کا قافیہ 'قزاک'
لایا جائے اسے قافیہ میں شمار
نہیں کرنا چاہیے۔ قافیہ مان کر
عیوب ٹھہرانا کیا معنی رکھتا ہے
اگر مخرج حروف اگر بطور روی
آئیں تو قافیہ داں اسے بھی اکفا

---

[1] ۔ ہرو منیر مغنی تبسم ۔ "آواز اور آدمی" ۔ قافیہ ص ۳۹
[2] ۔ ہرو منیر مغنی تبسم ۔ "آواز اور آدمی" قافیہ ص ۴۰ ۔

سے تعبیر کرتے ہیں جیسے "تخصیص"
اور "مقتضائیں" صوتی اعتبار سے
یہ قافیہ درست اور بے عیب ہے۔
اس لیے کہ اردو میں ص اور س
دو الگ آوازیں نہیں ہیں
اہل عرب کی ہم ان کا تلفظ
جدا گانہ طریقہ سے نہیں کرتے۔
محض تحریری شکل کے اختلاف
پر انھیں اصوات قرار دینا درست
نہیں ہے۔ اسی طرح "راز"
کا قافیہ "اغماض" اور عبث
کا قافیہ "ہوس" لایا جا سکتا ہے"[1]
اس طرح مغنی تبسم نے یہ بات واضح کر دی کہ
علم قافیہ کی تدوین میں قدما سے چند غلطیاں سرزد ہوئیں ہیں۔
اور قافیہ کی صوتی ماہیت کو دریافت کرنے میں ناکام رہے اور
ان قدما کا تصورِ حرف نیز علمی قرار دیا ہے۔ دوسری بات
یہ بتائی کہ ان قدما نے لفظ کی معنوی اکائی پر غیر ضروری
طور پر زور دیا ہے جبکہ صوتی اکائی کو اہمیت دینی چاہیئے تھی۔
اور قدیم علم قافیہ کو ناقص قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ
اسے ایک سرے سے مسترد کر دینا چاہیئے۔ آخر میں قافیے
کی جدید معنویت کو گرفت میں لاتے ہوئے کہتے ہیں:
"ہماری شاعری میں غزل کو چھوڑ

---

[1] پروفیسر مغنی تبسم۔ 'آواز اور آدمی' قافیہ۔ ص۔ ۴۰

دیگر اصناف میں قافیے کا استعمال
بہت کم ہوتا جا رہا ہے لیکن
دوسری شکلوں میں قافیے کے
استعمال کی اہمیت کو نظر انداز
نہیں کیا جا سکتا۔ یعنی قافیہ اپنے
مقررہ مقام سے ہٹ کر نظم
کے مصرعوں یا سطور میں کسی
اور مقام پر لایا جائے۔ دوسری
شکل غیر منظم قافیے کی ہے جو
مصرعوں یا سطور کے آخر میں کسی
مقررہ ترتیب اور التزام کے
بغیر لایا جاتا ہے۔ غیر منظم اور
اندرونی قوافی نظم کے صوتی
ڈھانچے اور مجموعی صوتی آہنگ
کی تشکیل میں خاص حصہ ادا
کرتے ہیں"[1]

مغنی تبسم نے غیر منظم اور اندرونی قافیوں کے
استعمال کی ایک بہترین مثال منیف کی نظم "سوچنے دو" کی
دی ہے
پروفیسر گیان چند جین لکھتے ہیں:

علم قافیہ پر اس قدرت کے ساتھ
وہی شخص لکھ سکتا ہے جو اس

---

[1] ۔ پروفیسر مغنی تبسم۔ "آواز اور آدمی" قافیہ۔ ص۔ ۴۴

کے عوامض کا مکمل عرفان رکھتا ہو۔
میں نے اردو میں علم قافیہ پر
اس مرتبہ کی اور کوئی تحریر نہیں
دیکھی۔ اس سے مجھے بھی تحریک
ہو رہی ہے کہ مہات سے قبل میں بھی
اس علم سے کس قدر، یاد اللہ
کر لوں"[1]

علم صوتیات اور علم قافیہ کے بعد مغنی تبسم نے غالب کے بعد میر، غالب، اقبال اور حسرت و عزیز کی شاعری کا اسلوبیاتی نقطۂ نظر سے بہترین جائزہ لیا ہے۔ انھوں نے غالب کا آہنگ اور بحروں کا استعمال" کے عنوان سے جو نتیجہ برآمد کیا ہے وہ یہ ہے کہ غالب نے آہنگ کے نت نئے تجربے مختلف اوزان میں مصوتوں اور وقفوں کی تبدیلی سے کیے ہیں۔ اس مضمون میں مغنی تبسم نے علم عروض کے قدیم معیاروں کو لسانیات کی کسوٹی پر رکھ کر ان کے صوتی حسن کی انفرادی خصوصیت کا علمی اور معروضی تجزیہ نہایت خوبی سے پیش کیا ہے اور ان امور کے پیش نظر انھوں نے غالب کے آہنگ شعر میں بحروں کے انتخاب اور استعمال کا جائزہ تفصیل سے جدول میں پیش کیا ہے۔ جس سے مندرجہ ذیل نتائج اخذ کیے ہیں۔

۱۔ غالب نے سب سے زیادہ اشعار بحر مضارع کے اوزان مثمن اخرب مکفوف (محذوف و مقصور) میں کہے ہیں۔

---

[1] ۔ پروفیسر گیان چند جین۔ "آواز اور آدمی" مشمولہ نذر مغنی تبسم ص ۔ ۴۷

۲۔ غالب کے کلام میں وزن رمل مثمن مخبون مختلف ذیلی زحافات کے ساتھ زیادہ استعمال ہوا ہے۔

۳۔ وزن رمل مثمن محذوف کا استعمال بھی شاعری میں زیادہ ہے

۴۔ رمل مثمن محذوف سے کچھ کم ہزج مثمن سالم کا استعمال بھی غالب نے کیا ہے۔

۵۔ محبت مثمن مخبون (محذوف، مسکن، مقصور) کے وزن میں اشعار کی تعداد بھی زیادہ ہے۔

۶۔ متقارب مثمن اثرم، منسرح مطوی مکشوف

۷۔ ہزج مدس اخرب مقبوض محذوف الذخر اور محبت مثمن مخبون

۸۔ ہزج مثمن سالم اور منسرح مثمن مطوی منحور۔

مغنی تبسم نے ان امور کو پیش نظر رکھتے ہوئے غالب کے کلام میں بحور کے استعمال کا نتیجہ خیز جائزہ لیا ہے۔ شعر سے صحیح طور پر لطف اندوز ہونے کے لیے مغنی تبسم نے اس کی قرأت میں وزن کے معینہ وقفوں کے بجائے حسب ذیل اُمور کو ضروری قرار دیا ہے کہتے ہیں:

۱۔ باہم معنوی تلازمے سے منسلک کلموں کو ایک ساتھ ادا کیا جائے۔

۲۔ وقفے رموز اوقاف کے مطابق قائم کیے جائیں۔

۳۔ تعقید لفظی کی وجہ سے اگر ایسے کلموں کے درمیان فصل آجائے جنہیں ایک دوسرے سے متصل رہنا چاہیے تو ایسے ہر ٹکڑے کی ادائیگی کے بعد ہلکا سا وقفہ دیا جائے۔

۴۔ لفظ میں دو ساکن مسلسل آئیں تو کسی حرکت کو ساقط نہ کیا جائے۔

ان ہی امور کو مدِ نظر رکھتے ہوئے مغنی تبسم نے

غالب کے اشعار میں آہنگ کی تلاش کی اور صرفی و نحوی خصوصیات کا بھی جائزہ لیا ہے۔ "غالب کی شاعری باز یچۂ اصوات" مغنی تبسم کے نزدیک غالب کی شاعری باز یچۂ اصوات ہے جس میں انھوں نے غالب کی شاعری میں نہ صرف اصوات کا انتخاب کیا بلکہ اصوات کی تنظیم اور ان کے تکرار کو بھی لسانیاتی نقطۂ نظر سے پیش کیا ہے کہ غالب شعوری یا غیر شعوری طور پر الفاظ میں صوتی رعایت کو بھی ملحوظ رکھا ہے اور ان کی شاعری محض آوازوں کا کھیل نہیں ہے۔ اس مضمون کے متعلق پروفیسر اشرف رفیع کہتے ہیں:

"غالب پر مغنی تبسم کے مضامین
غالب سے تحسین غالب کی علمی
اور معروضی سطحیں سامنے آتی ہیں۔
یہ مضامین غالب شناسی کے لیے
اس کے گنجینۂ معنی کی تفہیم میں
اہم اضافہ ہیں" [1]

مغنی تبسم نے شعر کے مفہوم سے نظر ہٹا کر اس کے اصوات کی ترتیب اور تکرار سے بننے والے نمونوں کا جائزہ لے کر غالب کے آرٹ کا ایک اہم گوشہ ہمارے سامنے لایا ہے۔ تاکہ غالب کے اشعار سے لطف اندوز ہو سکے۔ غالب کی خرنگ، شعر میں اصوات کی منظم اور نیز منظم تکرار کی بے شمار مثالیں نمونے کے طور پر پیش کی ہیں۔ تکرار اصوات کے متعلق مغنی تبسم کہتے ہیں:

---

[1] - پروفیسر اشرف رفیع - مغنی تبسم ایک مطالعہ - مشمولہ نذر مغنی تبسم ص ۳۹۶

تکرارِ اصوات اگر نظم کے ساتھ
ہو یعنی اس کے نمونے تبدیل ہوتے
رہیں تو اس کی وجہ سے شعر کی نغمگی
میں اضافہ ہوتا ہے اور اس کا شمار
محاسنِ شعر میں کیا جاتا ہے۔ ہر
زبان کے علم بدیع میں ایسی
بہت سی لفظی صنعتیں اور بعض
معنوی صنعتیں ملتی ہیں جن
کا مقصود ہی وہی اصوات
کی تکرار ہے یا جن کا استعمال
بیشتر صورتوں میں تکرار
اصوات کا باعث ہوتا ہے۔
انگریزی میں Alliteration
اور Assonence ایسی
ہی صنعتیں ہیں اردو میں تجنیس،
اشتقاق، شبہ اشتقاق، قلب، ردّ
العجز علی الصدر، ردّ العجز علی
الحشو، تکریر، مطا رالبعیر،
واسع الشقین، واصل الشقین،
متتابع، لمباقِ سلبی، عکس اور
مسمّط وغیرہ۔ دراصل موخر
صنعتیں ہیں۔ غالب نے اپنے اشعار
میں یہ ساری صنعتیں استعمال
کی ہیں۔ ان کے علاوہ بھی

تکرارِ اصوات کے ایسے کئی نمونے
ملتے ہیں جن کے لیے علم بدیع میں
کوئی نام نہیں دیا گیا ہے "[1]

اصوات کی تکرار اور ان کی ترتیب سے پیدا ہونے
والے صوتی آہنگ سے انھوں نے غالب کے کئی اشعار جن میں
ایک دو اصوات ایسی ہوتی ہیں جن کا تکرر سب سے زیادہ
ہوتا ہے کا تجزیہ پیش کیا ہے اور اس تجزیے سے انھوں
نے اس بات کی بھی وضاحت کی کہ شعر کی نغمگی میں مصوتوں
کی ترتیب اور تکرار کی وجہ سے اضافہ ہو گیا ہے۔ اور
پھر غالب کے اسلوب کو مغنی تبسم نے اس طرح مشخص کر دیا ہے:

" موزوں اصوات کا انتخاب اور
ان اصوات سے ترکیب پانے
والی لفظیات کا استعمال،
غالب کے اسلوب کی نمایاں
خصوصیت ہے۔ غالب کے
کلام میں ایسے اشعار کی تعداد
قابلِ لحاظ ہے جن کا لطف
بڑی حد تک صوتی محاکات میں
مضمر ہے "[2]

مغنی تبسم نے غالب کے کلام میں اصوات کا
انتخاب اور ان کی تنظیم اور تکرار کے اس جائزے سے

---

[1] ۔ پروفیسر مغنی تبسم ۔ "آواز اور آدمی"۔ "غالب کی شاعری بازیچہ اصوات" ص ۸۵

[2] ۔ ایضاً ایضاً ص ۔ ۸۶

حقیقت کی طرف رانب کرتے ہیں لکھتے ہیں،

"غالب کی شاعری کے حُسن اور
اس کی تاثیر میں امواج کے
انتخاب امران کی تنظیم کو
خاص دخل ہے۔ امواج کی
بازی گری اور طلسم آفرینی
کو محسوس اور معلوم کیے بغیر غالب
کی تحسین ادھوری رہ جائے گی۔
شعرِ غالب گنجینۂ معنی ہی نہیں
بازیچۂ امواج بھی ہے"[1]

"اقبال اور غزل" اس مضمون میں مغنی تبسم
نے داغ کا وہ مرثیہ پیش کیا ہے جس کو اقبال نے داغ کی
موت پر لکھا تھا جس کا اندازہ انھوں نے مندرجہ ذیل مرثیے
سے لگایا ہے۔

تھی زبانِ داغ پر جو آرزو ہر دل میں ہے
لیلیٰ معنی وہاں بے پردہ یاں محمل میں ہے
اب صبا سے کون پوچھے گا سکوتِ گل کا راز
کون سمجھے گا چمن میں نالۂ بلبل کا راز
تھی حقیقت سے نہ غفلت فکر کی پرواز میں
آنکھ طائر کی نشیمن پر رہی پرواز میں

مغنی تبسم نے اقبال کے ہاں انحراف کے
امکانات کی نشاندہی کی ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے اس

---

[1] ۔ پروفیسر مغنی تبسم۔ "آواز اور آدمی"۔ غالب کی شاعری بازیچۂ امواج
ص۔ ۸۶

بات کا بھی تجزیہ کیا کہ اقبال نے غزل میں کوئی نیا استعاراتی
نظام تشکیل دینے میں کس قدر قاصر رہے جو وہ اپنی استعاراتی
نظام کی جگہ لے سکے۔ اور اس دشوار گزار منزل کو سر کرنے
میں وہ کس قدر کامیاب رہے۔ انھوں نے اقبال کی
غزلوں کا سیر حاصل جائزہ لیتے ہوئے "بالِ جبریل" میں
شامل غزلوں کے اشعار کو غزل کے اشعار سے کہاں تک
موسوم کیا جا سکتا ہے اس کا تجزیہ قابلِ قدر ہے۔

اقبال کی ابتدائی شاعری کے متعلق سفی تبسم
کہتے ہیں:

"یہ انحراف غزل ہی تک محدود
نہیں رہا بلکہ ابتدائی دور
کی چند ایک نظموں کے بعد
ان کی شاعری میں عشقِ مجاز
کی کوئی لہر ابھرتی نظر نہیں آتی
——— "شاعرہ حسن" کی
گفتگو کے لیے دھیما بادہ و ساغر
کی زبان سے مضر نہیں تھا۔
وہ "حقیقتِ منتظر" کو
"لباسِ مجاز" میں دیکھ
نہیں پائے لیکن انسان اور
فطرت کے تضاد کے حوالے
سے وجود کی ماہیت کو دریافت
کرنے کی خواہش نے جو اضطراب
کی شکل اختیار کر گئی تھی اور

سلسلے میں وحدت الوجود کے تصور
سے ان کی دلچسپی نے ان کی غزل کو
ایک جذباتی بنیاد عطا کردی"۔[1]
اس سلسلے میں انھوں نے اقبال کے دور کی غزل گوئی
کے نمونے مثال کے طور پر پیش کیے ہیں۔ مفتی تبسم کہتے ہیں کہ اقبال کے
ہاں بعض تخلیقات ایسی بھی ملتی ہیں جنھیں مناسب عنوان دے
دیا جائے تو وہ نظم بن جائیں گی۔

سفر یورپ کے بعد اقبال نے احساس پر خیال
اور اظہار پر بیان کو ترجیح دینے پر اس قدر مجبور ہوئے کہ
اپنے خیالات میں رمزیت کو یکسر مسترد کردیتے ہیں۔ اقبال کی
شاعری میں عشق، خودی اور مومن کے تصورات کے متعلق
کہتے ہیں:

"خودی اور مومن کے تصورات
کے لیے اقبال نے استعارے
وضع نہیں کیے۔ ایسا کرنا ممکن بھی
نہیں تھا کیوں کہ مجرد تصورات
کو زیادہ سے زیادہ نشان
یا sign میں ڈھالا جاسکتا
ہے۔ علامتوں میں نہیں۔
یہی وجہ ہے کہ غزل میں
جہاں اقبال نے یہ اصطلاحیں
استعمال کی ہیں وہ غزل کے

---

[1] ۔ پروفیسر مفتی تبسم۔ آواز اور آدمی۔ اقبال اور غزل۔
ص ۸۸

شعرا نہیں ہے۔ اسی طرح فقر،
ملوکیت فرنگ جیسی مصطلحات
اور بعض اشخاص و مقامات
کے ناموں کو استعمال کرتے
ہوئے بعض کا تعلق معروف
تلمیحات سے ہوتا ہے و ہ
غزل کا شعر تخلیق کرنے
قاصر رہے[1] ہے

اقبال کی غزلوں میں بعض ایسے اشعار ہیں
جنھیں اگر علیحدہ دیکھا جائے تو غزل کے شعر نہیں معلوم ہوں گے
اور ان کی نظموں میں ایسے اشعار بھی مل جاتے ہیں جو اپنی
جگہ غزل کے شعر کہلائے جا سکتے ہیں۔ اقبال کی غزل گوئی کا
محاکمہ کرتے ہوئے مغنی تبسم لکھتے ہیں:

"غزل کے سانچے میں اقبال
نے جو تخلیقات پیش کی ہیں
اگر وہ غزل کے مسلمہ معیار
پر پوری نہیں اترتیں تو
انھیں غزل کہنے سے احتراز
کیا جائے۔ غزل کے معیار
سے گرے ہوئے اور ناموس
اشعار کو اقبال کا اجتہاد
قرار دینا خود اقبال کے

---

[1] ۔ ڈاکٹر مغنی تبسم۔ "آواز اور آدمی"، اقبال اور غزل
ص ۔ ۹۰

ساتھ نا انصافی کرنے کے مترادف
ہوگا"[1]

غزن مغنی تبسم "اقبال اور غزل" میں اقبال
کی غزلیات کو غزل کہنے سے گریز کرتے ہیں۔

" محمد علوی ـــ گھر اور جدید غزل " محمد علوی کی شاعری
کا استعارہ "گھر" کا مغنی تبسم نے اس مضمون میں سیر
حاصل جائزہ لیا ہے۔ یوں تو بالخصوص غزل کی روایت میں "گھر"
کا لفظ کبھی علامت اور کبھی استعارہ کے طور پر مخصوص تشبیہی
علاقوں میں بہت زیادہ برتا گیا۔ غالب کی غزل گوئی میں
بھی انھوں نے اس استعارہ کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب
میں نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

اس شعر میں غالب نے مجاز اور حقیقت سے ماورا
جاکر وحشتِ عشق کو انسان کی حدِ رہائی کی خواہش کے
اظہار کا جائزہ لیا ہے۔ اس کے علاوہ غالب کے چند اشعار
ملاحظہ فرمائیے جس میں مغنی تبسم نے گھر کے استعارے پر اپنے خیالات
کا اظہار کیا ہے۔

یک قدم وحشت سے درسِ دفترِ امکاں کھلا
جادہ اجزائے دو عالم دشت کا شیرازہ تھا

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو

---

[1] ۔ پروفیسر مغنی تبسم۔ آواز اور آدمی ۔۔ اقبال اور غزل ۔ ص ۹۴

بے در و دیوار سا اک گھر بنانا چاہیے
کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو

عاشق کا جہاں میں گھر نہ دیکھا
ایسا کوئی در بہ در نہ دیکھا

کون و مکاں سے ہے دلِ وحشی کنارہ گیر
اس خانماں خراب نے ڈھونڈا ہے گھر کہاں

دل غم سے ترے لگائے ہم
کس آگ سے گھر جلا گئے ہم

کیفیتِ ظہورِ فنا کے سوا نہیں
ہستی کی اصطلاح میں دنیا کہیں جسے

اپنے دیوانے پہ اتمامِ کرم کر یا رب
در و دیوار دے اب انہیں ویرانی دے

ان اشعار میں معنی تبسم کہتے ہیں۔
" بے در و دیوار گھر" خانہ مجنوں "
یعنی صحرائے خیال " اور "دشتِ تمنا "
ہے۔ "در و دیوار" "ہمسایہ "
اور "پاسباں " تقلید اور روایت
کے تحفظ کی علامتیں ہیں۔ غالب
"گھر" کے حصار سے توہینِ لعل کے

لیکن انھوں نے در و دیوار کو بال و پر
بنا لیا اور زنداں میں بھی ان
کا خیال "بیاباں نوردی" کرتا تھا"[1]
اسی طرح "گھر" اپنے تکرار کی وجہ سے محمد علوی کی
غزلوں کا بھی مخصوص جزو بن گیا ہے اور انھوں نے اپنے مجموعے
کا نام ہی "خالی مکان" رکھا ہے۔ جس کا معنی تبسم نے جائزہ
لیا ہے۔

خالی مکان سے ذہن میں کئی خیالات
ابھرتے ہیں۔ خالی مکان غیر آباد ہے۔
غیر آباد ہونے کی وجہ سے آسیب زدہ
بھی ہو سکتا ہے۔ مکان گھر کا کنایہ
ہے۔ مکان دفتر بھی ہو سکتا ہے
اور گھر بھی دفتر گھر نہیں ہو سکتا بلکہ
دونوں ایک دوسرے کے نقیض ہیں۔
لوگ گھر میں بھی رہتے ہیں اور سرائے
میں بھی۔ فرق طویل اور مختصر قیام
کا ہے ——— گھر انسان کی خلوت
اور اس کی نجی زندگی کا محل ہے"[2]

محمد علوی کی غزلوں میں "گھر" مکان یا جائے قیام سے لے
کر ایک تہذیبی ادارے تک ہر رنگ میں ہونے کی وجہ سے اس کا پھیلاؤ
استعارے کی شکل میں ہوا ہے۔ اس کے علاوہ مغنی تبسم نے حاتم

---

[1] ہرو منیر مغنی تبسم "آواز اور آدمی"۔ محمد علوی۔ گھر اور جدید غزل ص ۹۸
[2] ایضاً ایضاً ص ۱۰۱

حالی، یرحسن، مجروح سلطان پوری، سلیم شاہد، باقی، خلیل الرحمٰن اعظمی، نثار ناسک، باقی صدیقی، شاہد شیدائی، کشور ناہید، ساقی فاروقی، انور شعور، عادل منصوری، ناصر کاظمی، جون ایلیا، نثار ناسک، سرمد صہبائی، کمار پاشی، زبیر رضوی، وزیر آغا، نذیر قیصر، سلطان اختر، صحف اقبال توصیفی، احسن رضوی اور شہر یار کے اشعار میں استعمال کیے گئے استعارے سے محمد علوی کے اشعار کا تقابلی جائزہ لیا ہے۔ قدما کے اشعار میں گھر کا استعارہ تنہائی، جدائی، غم، عشق کے مفہوم کے لیے استعمال کیا جاتا تھا اس کے برعکس جدید شعرا کے کلام میں یہ استعارہ محبوب کی گود، وطن، اداس کی آزادی میں تبدیل ہو گیا ہے۔ ترقی پسند شعرا کے نزدیک گھر کا استعارہ انقلاب کے لیے مخصوص ہو گیا اور جدید شعرا کا احساس غالب اور فانی سے قریب تر ہے لیکن مختلف ہے۔ زیب غوری، شاذ تمکنت، چندر بھان خیال، شہزاد احمد، لطف الرحمٰن، باقر مہدی، شمس الرحمٰن فاروقی، سبط علی صبا ان شعرا نے بھی اپنے تجربوں اور مشاہدوں کو عصری مسائل کے ساتھ عصری حسیت کے اظہار کے لیے علامتوں اور پیکروں میں ضم کر دیا ہے۔ محمد علوی کے کلام میں استعارہ کے متعلق مغنی تبسم لکھتے ہیں:

> محمد علوی اپنے منفرد اور مخصوص انداز تخیل ممتنع کے استعمال کے ساتھ غیر جذباتی اظہار (واقعہ) میں گھر کی تنہائی کے ان تجربوں کو اس طرح سمو دیتا ہے کہ ہم غور

کرتے چلے جائیں تو نت نئی کیفیات

سے دوچار ہوں گے "[1]

مغنی تبسم کی شاعری میں بھی اس استعارہ کا استعمال کیا گیا ہے۔

"جدید اردو غزل کی لفظیات" اس مضمون میں مغنی تبسم نے

متعدد علامتوں اور استعاروں کی مدد سے قدیم غزل اور

جدید غزل میں اس کے استعمال پر بحث کی ہے۔ ان علامتوں

میں انھوں نے پانی، آگ، مٹی، خاک، ہوا، زمین،

درخت، سمندر، دریا، وحشت، صحرا، پتھر، سورج،

دھوپ، دیوار، سایہ، اور سفر سے متعلق بہت

سے قدیم و جدید اشعار تلاش کیے اور ثابت کیا کہ جدید شعرا نے

ان میں کس طرح نئی معنویت کو پیدا کیا ہے اور بعض ایسی

علامتیں بھی ہیں جنھیں صرف جدید شعرا ہی نے استعمال کیا ہے

ان میں سگریٹ، اجنبی، آسیب، برف، پرند، تتلی،

جزیرہ، دریچہ، دستک، دہلیز، دھواں، کمرہ وغیرہ کا

بھی انھوں نے ذکر کیا ہے۔ رام پرکاش راہی "آواز آدمی"

اس مجموعہ پر تبصرہ "کتابوں کی باتیں" پروگرام کے تحت اردو

سروس آل انڈیا ریڈیو سے ۴ دسمبر ۱۹۸۳ء کو رات ۹ بجے

نشر کیا۔ اس مضمون کے متعلق کہتے ہیں،

"جدید اردو غزل کی لفظیات

ایک اہم مطالعے کا دوسرا نام ہے۔

ان الفاظ کا استعمال جو اساتذہ

اور قدما کے یہاں ملتا ہے اس

---

[1] ۔ پروفیسر مغنی تبسم "آواز آدمی" محمد علوی۔ گھر اور جدید غزل

ص ۱۱۱

مقالے میں موازنہ کے انداز میں
اسیا پس منظر بن کر سامنے آیا ہے کہ
ڈاکٹر موصوف اپنی کوشش میں
نمایاں طور پر کامیاب ہیں جس
سے انھوں نے ظاہر کیا ہے کہ
نئے شعرا نے مروجہ لفظیات
ہی کو اپنے جداگانہ استعمال سے
کچھ کا کچھ بنا دیا ہے۔ گویا جدید
اردو غزل کا نیا مزاج
ان لفظیات کے متنوع
استعمال سے ہی تشکیل پاتا ہے۔
اور یہ غزل کے ہر لحاظ سے صحت مند
ہونے کا دم بھرتا ہے"[1]
مفتی تبسم کہتے ہیں:

جدید اردو غزل میں روایت
سے انحراف کی متعدد ناکام اور
چند کامیاب کوششیں ملتی ہیں
ظفر اقبال، عادل منصوری اور
اس قبیل کے بعض دوسرے
شاعروں نے غزل کی زبان کو
بدلنے کے انتہا پسندانہ اقدامات
کیے جن کا سلسلہ نئے الفاظ گھڑنے

---

[1] ۔ رام پرکاش رائی۔ تبصرہ "آواز اور آدمی" شمولہ نذر مفتی تبسم
ص ۱۵۱م

اور قواعدِ زبان کی شکست و ریخت
تک پہنچ گیا ۔ اس طرح انھوں نے
قاری کو وقتی طور پر چونکا کر
تفریحِ طبع کا کچھ سامان مہیا
تو کر دیا لیکن شاعری کا حق
ادا نہیں کر سکے "[1]

مغنی تبسم کے خیال میں لفظ کو متن سے الگ نہیں کرنا چاہیے اور نہ ہی انفرادی الفاظ کو بحث کا موضوع بنایا جا سکتا اور یہ اس وقت ہی ممکن ہے جب کہ شاعر کے ہاں الفاظ تو نئے ہوں لیکن مضمون روایتی ہو اس کے برخلاف دوسرا شاعر محض قدیم الفاظ کو برتے کا رلاتے ہوئے کسی تجربے کا اظہار کر سکتا ہے ۔

مغنی تبسم کہتے ہیں دیکھنا یہ چاہیے کہ کوئی لفظ خواہ وہ نیا ہو یا پرانا دوسرے اجزا کے ساتھ مل کر نئے تجربے کو پیش کر رہا ہے یا نہیں ۔ انھوں نے غزل کے علائم و رموز کو گروہوں میں اس طرح تقسیم کیا ہے ۔

۱۔ جن کا تعلق فطرت اور اس کے مظاہر سے ہے ۔
مثلاً آسمان ، بادل ، چاند ، ستارے ، سورج ، آگ ، ہوا ، پانی ، سمندر ، صحرا ، درخت ، پھول ، پرند وغیرہ ۔

۲۔ جن کا تعلق انسان کے طبعی اور روحانی وجود ، اس کے افکار ، اخلاقی ، مذہبی تصورات ، سماجی روابط اور تاریخ سے ہے ۔

---

[1] ۔ پروفیسر مغنی تبسم ۔ "آواز اور آدمی" ، جدید اردو غزل کی لفظیات ص ۱۱۹

"حسرت کی غزل کے چند پہلو" یوں تو حسرت کی شاعری کا جائزہ اور نقادوں نے بھی لیا ہے لیکن مغنی تبسم نے حسرت کی شاعری کا موضوعاتی تجزیہ کیا ہے وہ اپنی انفرادیت رکھتا ہے۔ اس ضمن میں مغنی تبسم کہتے ہیں:

"حسرت نے طویل مصرعوں کی کرت، بعض الفاظ میں ساکن معمتوں میں قبل آنے والے مصرعے کو طول دے کر اور معمتوں کی صوتی رمزیت سے استفادہ کرتے ہوئے لہجہ اور غنائیت کو اس میں اس طرح مدغم کر دیا ہے کہ ان کو مناسب وقفے قائم کرتے ہوئے تحت اللفظ پڑھا جائے تو ہکان کا لہجہ ابھرتا ہے اور اگر قرأت میں مروجی آہنگ کا لحاظ رکھا جائے تو غنائی کیفیت نمایاں ہو جاتی ہے۔

طویل اور رواں ردیفوں سے پیدا ہونے والی تکرار اس کیفیت کو دوبالا کر دیتا ہے۔

حسرت کی شاعری کے صوتی آہنگ کا ایک منفرد پہلو یہ ہے کہ وہ شعر میں کسی طویل مصوتے والے لفظ کا اندراج اس طرح کرتے ہیں

کہ اس کی ادائگی میں جھٹکے کے ساتھ
اونچی پینگ لینے کی کیفیت پیدا
ہوجاتی ہے اور طویل مصوتہ ساکن
مصوتے سے قبل مندرج ہو تو یہ
پینگ بلندی پر تھم جاتی ہے"[1]

معاملہ بندی کے علاوہ حسرت نے جہاں
کیفیات نگاری سے کام لیا ہے اور داخلی محاکات کا کمال
دکھایا ہے اس خصوص میں حسرت کی شاعری کا بوا نفرادی
رنگ اجاگر ہوا ہے مغنی تبسم نے اس کی مثال حسرت کے
چند اشعار سے دی ہیں ان اشعار سے مغنی تبسم نے حسرت
کے فن کا جائزہ لیتے ہوئے لکھے ہیں کہ،

"حسرت کا فن یکسر حسن ہے،
افادیت کے تصور سے عاری۔
حسرت کی شاعری تمام تر انداز
اظہار اور شوخی گفتار ہے
جس کو پڑھنے یا سننے کے لیے
میرکا یہ مصرع زبان پر آجاتا ہے
دیکھو باتیں تو کیا بناتا ہے"[2]

پروفیسر سلیمان اطہر جاوید مغنی تبسم کے مرتبہ تنقیدی تجزیے
کے متعلق اس طرح رقمطراز ہیں!

"مغنی تبسم ہوئی آنکھ پر اس قدر

---

[1] - پروفیسر مغنی تبسم "آواز اور آدمی" حسرت کا غزل گو فنی پہلو جس ۱۷۴، ۱۷۵
[2] - ایضاً ایضاً ص ۱۸۰

زور دیتے اور موثر تحلیل و تجزیے
سے اس قدر کام لیتے ہیں کہ خیال
اور معنی کا رشتہ ان کے ہاتھ سے
کبھی کبھی چھوٹتا محسوس ہوتا ہے۔
اسلوبیاتی تنقید کے تعلق سے
مغنی تبسم کی اور تحریریں بھی
مل جائیں گی لیکن اس جائزے سے
ان کے تنقیدی سفر کو سمجھنے میں
مدد ملتی ہے۔ اس میں کوئی شبہ
نہیں کہ مغنی تبسم کا حرف جدید
ادب کا مطالعہ ہی وسیع و
وقیع نہیں، مکمل اور ترقی
پسند ادب پر بھی ان کی گہری نگاہ
ہے۔ ان کا ذوق رچا ہوا ہے،
اُردو کے صرفی اور حرفی نظام کا
ان کا علم ٹھوس ہے وہ زبان
اس کی ساخت اور اسلوب کو
ملحوظ رکھتے ہیں اور دیدہ ریزی
اور دقتِ نظر کو کام میں لاتے
ہوئے فالص حروفی مباحث
اور تجزیاتی زاویوں کو اپناتے ہیں
کہ شعری رنگ و آہنگ خوبی سے اجاگر ہوتا ہے" [1]

---

[1] - پروفیسر سلیمان اطہر جاوید - مغنی تبسم کا تنقیدی سفر - شمولہ نذر مغنی تبسم
ص ۳۸۶ ۳۸۷

"کلامِ غالب میں آویزش" اس مضمون کو انھوں نے
اپنے مطالعے کا موضوع بنایا ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے
یہ دکھایا کہ غالب کے یہاں دو اسالیب پائے جاتے ہیں
ایک خالص اردو اسلوب اور دوسرا فارسی آمیز
اسلوب اور یہ اسالیب ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے
رہے اور ایک عرصہ تک ان میں باہمی کشمکش جاری رہی
لیکن آخر میں فارسی اسلوب کے عناصر ختم ہوگئے۔ آگے کہتے ہیں
کہ دقیق اور سلیس اسلوب غالب کی مختلف غزلوں ہی
میں نہیں بلکہ ایک ہی غزل میں مل جاتے ہیں۔ مثلاً

نسرینِ آئینہ سے بخشیں شکنِ خندۂ گل
دلِ آزردہ پسندِ آئینہ رخساروں کا

پھر وہ سوئے چمن آتا ہے خدا خیر کرے
رنگ اڑتا ہے گلستاں کے ہواداروں کا

مغنی تبسم لکھتے ہیں:

"غالب کے کلام میں فارسی آمیز
اسلوب اور معیاری اردو کا اسلوب
ایک دوسرے پر اثر انداز
ہوتے ہوئے ساتھ ساتھ رواں
چلتے رہے۔ ان کی باہمی آویزش
اور آمیزش سے بالآخر فارسی
آمیز اسلوب میں سے وہ
عناصر خارج ہوگئے جو ان کی
تکرار کم ہوگئی جو اردو کے مزاج سے

ہم آہنگ نہیں تھے ۔ مثلاً ہائے ہوز
اور الف کے اضافے سے اسموں
کی فارسی جمع صرف تراکیب میں
باقی رہ گئی ۔ اس طرح الف اور
نون کے اضافے سے جمع بنانے
کا طریقہ ہی ترک کر دیا گیا اور
اس کے ساتھ خطاب کی وہ
دل کشی بھی رخصت ہو گئی "[1]

مغنی تبسم کے غالب پر تین مضامین "غالب کا آہنگ، شعرا، اور بحروں کا استعمال"، "غالب کی شاعری بازیچۂ اصوات"، اور "کلام غالب میں اسالیب کی آویزش" ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں ۔ اور ان کڑیوں کے متعلق رام پرکاش رانا کہتے ہیں:

"ڈاکٹر مغنی تبسم نے اپنے متنوع تنقیدی کارنامے سے جہاں غالب کے شعری رنگ و آہنگ کو Tennyson کے Lyricism کے پیمانے میں ناظرین خاطر خواہ طور پر اجاگر کیا ہے وہاں غالب کی مشکل بندش کو بیدل کی فنی تکنیک کی روشنی میں معنویت کی گہرائی اور تخیل کے جامع اظہار

---

[1] ۔ پروفیسر مغنی تبسم ۔ "آواز اور آدمی"، کلام غالب میں اسالیب کی آویزش ۔ ص ۱۸۷

کے لیے ناگزیر قرار دیا ہے۔ گویا
یہ مضامین غالب کو تغزل اور
تخیل کا لاثانی فن کار ثابت
کرنے کی بڑی ہاے مثال دستاویز
ہیں "[1]

" آئینہ اردو غزل کا ایک مقبول استعارہ " آئینہ اردو
غزل کا ہمیشہ سے ایک محبوب استعارہ رہا ہے۔ ولی
دکنی، سراج اورنگ آبادی، آتش، حسرت موہانی، بہادر
شاہ ظفر، شاہ حاتم، شاہ نصیر، آنند نرائن ملا،
سراج اورنگ آبادی، میر، غالب، مومن، آتش، بیخود
دہلوی، جلیل، سودا، نانی، عزیز لکھنوی، لیگانہ،
سودا، شاہد حسن، صادق نسیم، ظفر اقبال، احمد فراز،
حفیظ ہوشیارپوری، پروین شاکر، کشور ناہید، احمد ہمدانی،
شاہد کبیر، شفقت تنویر مرزا، خلیل الرحمن اعظمی،
شاذ تمکنت، شمیم حنفی، سرمد صہبائی، منیر نیازی،
شکیب جلالی، فضیل جعفری، احمد شتاق، جاوید شاہین، توصیف
تبسم، ناصر کاظمی، پریم کمار نظر، علیم افسر، ظفر اقبال،
باقی صدیقی، علی احمد جلیلی، حمایت علی شاعر، احمد ندیم قاسمی،
خالد شیرازی، زیب غوری، غلام جیلانی اصغر، نزوت
حسین، غلام مرتضیٰ راہی، ممتاز راشد، سلطان اختر،
لقمان علی خاں ثاقب، عبید اللہ علیم، محب عارفی، چندر
پرکاش شاد، راغب شکیب، محمود ایاز اور شہریار کے

---

[1] ۔ رام پرکاش راہی۔ تبصرہ " آواز اور آدمی "، شعلہ نندر مفتی تبسم
ص۔ ۴۱۴

اشعار میں "آئینہ" کا استعارہ کبھی محبوب کے لیے تو کبھی آئینے سے آنکھ کی مماثلت ظاہر کی گئی۔ اور کبھی شعرا نے آئینے کو حیرت کے تلازمے کے ساتھ بالخصوص حسن کی حیرت آفرینیوں کے اظہار کے لیے اس استعارہ کو کثرت سے استعمال کیا ہے۔ کہیں یہی استعارہ دیدۂ منتظر بھی ہے۔ غالب کے یہاں آئینے کے جتنے بھی تلازمے استعمال کیے ہیں وہ ساری اردو شاعری میں کہیں نہ کہیں ملتے۔ غالب کے کلام سے آئینے کے چند تلازموں کی مثال معنی تبسم نے غالب کے اشعار سے دی ہیں۔ میر کے یہاں آئینہ کا استعارہ "دنیا" کے لیے آیا ہے تو فانی کے ہاں یہی استعارہ ایک محرومِ دیدار عاشق کی صدائے احتجاج بن گیا ہے۔ اس کے برخلاف جدید شعرا نے اس استعارہ کی مدد سے بے رحم حقیقت بیانی کے پیشِ نظر تنقید کا ہدف بنایا۔ آئینہ کا ایک اور پہلو بھی ہے جو اس کو اپنی عمر کے زوال کا احساس دلاتا ہے۔ اور آئینہ کے ٹوٹنے میں اس خطرہ کو بھی محسوس کیا گیا کہ کہیں وجود کی سالمیت کا خاتمہ ہو گیا ہو۔ آئینے کا ایک اور نقیض "گرد" بھی قرار دیا گیا ہے جو آئینہ کو دھندلا دیتی ہے۔ معنی تبسم کہتے ہیں:

"غزل میں دنیا کے لیے آئینہ خانے
کا استعارہ تخلیق کائنات کی
متصوفانہ (وجودی/شہودی)
تعبیروں سے منسلک ہے۔ جدید
غزل میں یہی آئینہ وجودیت
پسندانہ ادراک سے مربوط ہو کر
اس صورتِ حال کا عکاس بن

گیا ہے ـــــ آئینہ دراصل
انسان کی ذات اور انا کا استعارہ
ہے جس کی قید سے رہائی کی کوئی
صورت نہیں ـــــ یہاں انسان
کی ذات آپ ہی تماشا ہے اور
آپ ہی تماشائی "[1]

جدید غزل میں تمثیل جو ایک آدرش بن کر
ابھر آئی ہے اس کی مثال صفی تبسم نے عطار کے عرفانِ نفس کی
منزل کو منطق الطیر میں آئینے کی تمثیل کے ذریعے پیش کی تھی۔
جس میں ایک بار سارے پرند، ہدہد کی رہنمائی میں اپنے بادشاہ
سیمرغ کی تلاش میں چل کھڑے ہوئے۔ ان میں سے بہت
سوں نے تھک ہار کر یا کسی اور وجہ سے مختلف مرحلوں پر اپنا سفر
منقطع کر دیا۔ آخر میں صرف تیس پرند باقی رہ گئے، جو
مستقل مزاجی کے ساتھ سفر کی صعوبتیں جھیلتے ہوئے منزل پر
پہنچ پائے۔ ہدہد جب انھیں بادشاہ کے دیدار کے لیے اپنے ساتھ
لے گیا اور کہا کہ دیکھو وہ ہمارا بادشاہ ہے تو وہ کیا دیکھتے ہیں
کہ سامنے آئینہ ہے اور اس میں انھیں کا عکس نمودار ہے۔
مرزا صفی تبسم نے آئینہ کے لیے رموز و علائم اور ان کے تلازمات
کا بڑی ژرف بینی کے ساتھ مطالعہ کیا ہے۔

"تیر کا لہجہ" یہ موضوع آواز اور آدمی" کا
آخری تنقیدی مضمون ہے جس میں صفی تبسم نے تیر کی شاعری
کے چند نمایاں لہجوں کا ذکر کیا ہے۔ جس میں خطابیہ

---

[1] ۔ پروفیسر صفی تبسم ۔ آواز اور آدمی" آئینہ اردو غزل کا ایک مقبول استعارہ
ص ۲۰۱

تخاطب اور خود کلامی وغیرہ کا اسلوبیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔
اس کے علاوہ میر کے کلام کا لسانیاتی تجزیہ بھی کیا گیا ہے۔
مغنی تبسم کہتے ہیں:

"لہجے کا شعر کی قرأت سے گہرا تعلق
ہوتا ہے۔ نظم یا شعر کا
موتی آہنگ مصوتوں اور مصمتوں
کی تنظیم اور ان کے طرز ادائیگی
سے تشکیل پاتا ہے لہجہ کا تعلق
زیادہ تر طرز ادائیگی سے ہے
جن کو نظم یا شعر کے بنیادی
احساس اور تجربے سے ہم آہنگ
ہونا چاہیے" [1]

مغنی تبسم نے عروضی اعتبار سے بھی میر کی شاعری کے چند نمایاں اور نمائندہ لہجوں کا مطالعہ کیا ہے۔
پروفیسر گیان چند جین کہتے ہیں:

"مغنی صاحب جدید نقاد ہیں لیکن
ان کے اسلوب میں ابہام،
الجھاؤ اور تکلف بھی جس کا وجہ
سے ان کی تنقیدوں کو پڑھنا
بار بھی ہوتا۔ وہ کلام کے
فنی مطالعے کے ماہر ہیں۔
اسے بالغ نظر نقاد اور اس

---

[1] - پروفیسر مغنی تبسم "آواز اور آدمی" میر کا لہجہ ص ۲۰۳

پائے کے فکر انگیز شاعر کا وجود کتنا غنیمت ہے[1]

"آواز آدمی" کے تنقیدی مضامین کے متعلق ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ اس طرح رقمطراز ہیں:

"اس کتاب کے تمام مضامین ادب و شعر کا اسلوبیاتی مطالعہ و تجزیہ پیش کرتے ہیں۔ اسلوبیات، مطالعۂ اسلوب یا ادبی زبان کے تجزیہ و تحلیل کا ہی دوسرا نام ہے۔ چونکہ زبان کے مطالعے کا براہِ راست تعلق لسانیات سے ہے اور زبان ادب کا بھی ذریعہ اظہار ہے۔ اس لیے ادب اور لسانیات کے درمیان جو گہرا اور ٹھوس رشتہ پایا جاتا ہے اس سے صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا۔ ڈاکٹر مغنی تبسم کو زبان و ادب کے باہمی رشتوں کا بہ خوبی علم ہے۔ اور ادب کے مطالعے میں لسانیات و سوسنیات کے اطلاق کی اہمیت سے وہ اچھی

---

[1] ۔ پروفیسر گیان چند جین۔ "آواز اور آدمی"، شمولہ نذر مغنی تبسم ص۔ ۔ ۲۰۸

طرح واقف ہیں "[1]

اس کتاب کے متعلق رام پرکاش راہی کہتے ہیں،

" آواز اور آدمی" کی ترکیب

نئے لفظیات کی رو سے فن اور

شخصیت کے مترادف ہے۔ لہٰذا

مضامین کا یہ منظر نامہ مصنف

کی طرف سے نقد و نظر کے نئے

زاویوں کا فوری احساس دلاتا ہے۔

ورق گردانی سے پتہ چلتا ہے کہ

یہ بات بڑی حد تک صحیح ہے کیوں

کہ مضامین نہ محض اپنے

عنوانات کی رو سے بلکہ موضوعات

کی مجموعی Treatment کے

اعتبار سے بھی ایک سلجھی ہوئی

ادبی پرکھ کے آئینہ دار ہیں "[2]

نصیر احمد خاں "معاصر اردو تنقید مسائل و میلانات میں لکھتے ہیں۔

" ہمارے اسلوب کے مطالعے کی روایت

میں ایک اہم نام محی الدین قادری زور

کا ہے ——— اردو میں اسلوب

کے سائنسی مطالعے کے اس ابتدائی

---

[1] ۔ ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ۔ "آواز اور آدمی"، مشمولہ نذر مغنی تبسم ص ۔۲۱۲

[2] ۔ رام پرکاش راہی۔ "آواز اور آدمی"، مشمولہ نذر مغنی تبسم۔ ص ۲۱۴

نقش کے تقریباً تیس سال بعد دوسرا
نام مسعود حسین خاں صاحب کا
آتا ہے۔ انھوں نے اپنے مضامین
میں شعری اسلوب کے صوتی
پہلوؤں سے بحث کی ہے ——
تیسرا نام مغنی تبسم کا ہے انھوں نے
مسعود حسین خاں کے زیرِ نگرانی اپنا
تحقیقی مقالہ "فانی بدایونی، حیات،
شخصیت اور شاعری" لکھا۔ مقالے
کے آخری باب میں انھوں نے فانی
شعر کا اسلوب اور صوتی حسن کو
شناخت کرکے ان کی قومیات
کا معروضی تجزیہ کیا ہے۔ ان کے
مضامین میں غالب کی شاعری
باز-یچۂ اصوات جو فکر و نظر،
علی گڑھ میں چھپا اور اصوات
اور شاعری گورکھپور سے غالب،
مکر و فن، میں شائع ہوا ہے،
ان کی نوعیت کے الگ مضامین ہیں
اور قابلِ ذکر ہیں۔ غالب
کے مکالم کی تاثیر اور اس کے لہجے
و لحنے کی تعمیر میں مخصوص آوازوں
کی تنظیم و ترتیب اور تکرار نے
جو کردار ادا کیے ہیں ان کا دلچسپ

بیان ہے۔ مغنی تبسم کی تحریروں
سے انداز ہوتا ہے کہ کبھی کبھی
شاگرد بھی اپنے استاد سے آگے
نکل جاتے ہیں"۔[۲]

۱۔ نصیر احمد خاں " اسلوبیات اور اُردو میں اس کی روایت"
معاصر اُردو تنقید مسائل و میلانات ۔ مرتبہ شاذ ردولوی، دہلی
۱۹۹۴ء ص ۱۰۹ - ۱۱۱

"لفظوں سے آگے" مغنی تبسم کا ایک اور تنقیدی مجموعہ ہے۔ (۲۰۴) صفحات پر مشتمل یہ مجموعہ ڈسمبر ۱۹۹۳ء میں شائع ہوا۔ اس تصنیف میں بیس تنقیدی مقالات شامل ہے جن میں سے بیشتر مختلف ادبی سمیناروں میں پیش ہو چکے ہیں اور جو قریب رسائل و جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔

اس کتاب کا پہلا مضمون "لفظوں سے آگے" ہے جو اس کتاب کا سب سے اہم اور فکر انگیز مضمون ہے جس میں ترقی پسند تحریک اور جدیدیت کا محاکمہ کیا گیا ہے مغنی تبسم کہتے ہیں:

"آج کے اردو ادب کا مطالعہ کسی
ذہنی تحفظ اور پیش بندی کے بغیر کریں
تو اس میں ایک مخصوص رجحان نہیں
بلکہ مختلف اور متنوع رجحانات
کی شاعری سے جڑتا دکھائی دے گا۔
اس میں مختلف ادبی اور فنونِ لطیفہ
کی تحریکوں کے اثرات کارفرما ملے گا۔
مجموعی طور پر یہ محسوس ہوگا کہ نیا اردو ادب،
ماضیِ قریب کے ادب سے بڑی حد تک
مختلف ہے۔ یہ اختلاف سیاسی
نظریے یا عقیدے کا نہیں بلکہ بنیادی
طور پر تخلیقی رویوں کا اختلاف ہے۔
ماضی میں جس نظریے کو تنقیدِ فن
میں دخیل کیا گیا وہ اشتراکی حقیقت
نگاری کا نظریہ تھا"[1]

---

[1] ۔ پروفیسر مغنی تبسم۔ "لفظوں سے آگے"۔ ڈسمبر ۱۹۹۳ء ص۔ ۷

ترقی پسند تحریک کے زیر اثر جو نیا ادب وجود میں آیا وہ ترقی پسند تحریک سے متاثر لکھے گئے ادب سے ہر لحاظ سے مختلف تھا۔ اور اشتراکی حقیقت نگاری کی آواز اتنی بڑھ گئی تھی کہ من اور پروپگنڈے کا خاتمہ ہوگیا اور جدیدیت، ترقی پسند ادیبوں کی نظریاتی ادعائیت کے خلاف ردّ عمل کے طور پر سامنے آئی۔ بیشتر نئے اور اچھے شاعروں اور ادیبوں کی تخلیقات میں جو رویّے منظر عام پر آئے ہیں انھیں مغنی تبسم نے ایک طرح کی آوان گارڈیت سے موسوم کیا ہے۔ جس کا اظہار آرٹ اور کلچر میں فطری انداز سے شروع ہو چکا تھا۔ مغنی تبسم کہتے ہیں:

"یہ کلچر ہندوستان کی موجودہ فضا
اور حالات میں اپنا ایک مخصوص
رنگ رکھتا ہے لیکن اس کا رشتہ
دوسرے ملکوں کے آوان گارد کلچروں
سے ملتا ہے۔ تاریخی اور سماجی نظام
کے خلاف نہلیسٹی بغاوت جو اس
نئی کے کلچر کی خصوصیت ہے ہندوستان کی
تمام زبانوں کی نئی شاعری میں اظہار
پا رہی ہے۔ نئے ادب کا ایک وصف
پبلک، سماج اور روایت سے مقاومت
ہے"[1]

یہی عدم مطابقت فن کار میں ماحول سے اجنبیت کا شدید احساس پیدا کرتا ہے یہی احساس اس کو کبھی محزون بناتا ہے

---

[1] - پروفیسر مغنی تبسم۔ "لفظوں سے آگے" ص۔ ۸

تو کبھی وہ خود کو سورما سمجھنے لگتا ہے۔ اسی جذبۂ مقاومت کے اظہار کی ایک صورت تمسخر ہے۔ جو نئے ادب کی روایت سے منحرف کر دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ نسل کو اس بات کا بھی احساس ہے کہ وہ مختلف اور جدید ہے۔

مغنی تبسم نے نئے اور پرانے ادب کا واضح اختلاف زبانوں کے استعمال میں دیکھا ہے۔ اور نئے ادیب کی روایت دشمنی رومانی رویّے سے مماثلت رکھتی ہے انھوں نے اس کو رومان پسندی کا نام دینا موزوں سمجھا۔

"مستقبلیت، روایت کی دشمن اور
تجربے کی محرک ہوتی ہے۔ جدیدیت
کی جمالیات میں ندرت کو پہلا
مقام حاصل ہے۔ کلاسیکیت کا نظریۂ
کمال اس کے تابع ہوتا ہے۔ جدید تخلیق
اس اعتبار سے غیر روایتی روایت
ہوتی ہے۔ ایسے ادب کا دعوائے کمال
جھوٹا اور لغو ہے جو روایت کی نقل
کرتا اور خود کو دہراتا ہے"[1]

"نسائی تنقید" (ایک تعارف) اس مضمون میں مغنی تبسم نے مغربی ادب میں نسائی تنقید کے آغاز و اسباب کا تعارف نہایت خوبی سے کیا ہے اور اس ضمن میں انھوں نے نسائی تنقید کے اہم نقادوں کے خیالات کو بھی پیش نظر رکھا ہے جس سے ان

---

[1] پروفیسر مغنی تبسم۔ "لفظوں سے آگے" ڈسمبر ۱۹۹۳ء۔ ص۔۹

نقادوں کے طرزِ فکر اور طرزِ عمل کو سمجھنے میں کافی مدد مل سکتی ہے۔
نسائی تنقید کی ابتدا ۲ میں انھوں نے ورجینا وولف کی تحریر پیش کی ہے جو ایک بڑی ناول نگار تھیں، جس سے نسائی تنقید کے متعلق وولف کا خیال ظاہر کیا گیا۔ دوسری تحریر کیرولن ہائیل برن کی پیش کی ہے اس کے خیال میں نسائی تنقید ایک بے قید اور ناقابلِ تشریح فطرت کا نظریہ ہے اس لیے کیرولن ہائیل اس کو غیر نسائی قرار دیتی ہے جب کہ کرسٹیوا اسے مستند طور پر نسائی قرار دیتی ہیں۔ کیوں کہ اس کے خیال میں نسائی تنقید جنسی شناخت کی رد تشکیل کا مطالبہ کرتی ہے، بعد کے نسائی نقادوں میں شوالٹر نے اسے پُر فیمینسٹ قرار دیا ہے۔ مغنی تبسم نے وولف کا مطالعہ کرتے ہوئے اس کی جمالیات کی سیاسی نوعیت کو سمجھنے کی کوشش کی۔ اس کے بعد نسائی تنقید کو انھوں نے دو گروہوں میں تقسیم کیا ایک اینگلو امریکی تنقید اور دوسری فرانسیسی تنقید۔ شوالٹر کے پیش کردہ جدید نسائی تنقید کی چار اہم جہتوں کی بھی نشان دہی کی گئی ہے۔ جس میں ایک حیاتیاتی دوسرا لسانیاتی تیسرا تحلیلِ نفسی سے متعلق اور چوتھا کلچرل تنقید ہے۔
اس سلسلے میں ایک اور قابلِ ذکر نقاد مائرا جبلین کا نام بھی پیش کیا گیا ہے۔ اس کا اہم مقالہ آرشمیدس اور نسائی تنقید کا استعارہ ہے۔ مائرا کے خیال میں نسائی مطالعے کا دائرہ وسیع ہو اور ہر چیز کو نسائی نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے۔
جبلین تنقیدی تحسین اور سیاسی قرأت میں جو فرق کرتی ہیں اس کے نظریے کا سب سے بڑا تناقض قرار دیا گیا۔ اینگلو امریکی تنقید کے متعلق مغنی تبسم کہتے ہیں کہ:

"اینگلو امریکی تنقید میں یہ خامی

کھنکتی ہے کہ اس نے ادب کے مطالعے
کے لیے نیے طریق دریافت نہیں کیے۔
اس نے مروّجہ تنقیدی طریقوں
ہی کو سیاسیا دیا ہے۔
(politicised) اور اس
بنا پر وہ دوسری ریڈیکل تنقیدوں
سے مماثلت رکھتی ہے"۔[1]

فرانسیسی نسائی تنقید نگاروں میں ایک اہم نام
سیمون دہ بووار (Simone Debeauvoir) کا لیا گیا۔
جن کا فیمنزم، اشتراکیت کے علاوہ وجودیت سے بھی اثر
پذیر ہے۔ مارکسی نقادوں میں ایک اور قابلِ ذکر نام
(Piere Macherey) کا بھی ہے جس کے نزدیک مارکسی
نسائی تنقید جنسی گروہوں کی تاریخی تعمیر کے مطالعے اور ادب میں
ان کی نمائندگی اور تبدیلیوں کے تجزیے سے غیر معمولی دلچسپی
رکھتی ہے۔ جدید دور میں فرانسیسی نسائی تنقید میں دریدا
اور ژاک لکاں، کرستیوا، ہیلن سیکسو کے کارنامے غیر معمولی
اہمیت کے حامل ہیں۔ آخر میں Irigaray Luce کا نام
ملتا ہے جو ایک فرانسیسی نقاد ہے جس نے مغربی فلسفہ کا ردِ
تشکیلی تجزیہ کرتے ہوئے بتایا کہ یہ فلسفی انسانی وجود کو کسی
عام حالت پر اپنے ذاتی خیالات کو منعکس اور پیش کرتے ہیں۔
اس موضوع کو مغنی تبسم نے شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ یونیورسٹی
کے زیرِ اہتمام ۸/مارچ ۱۹۸۹ء کو اردو ادب میں نسائی

---

[1] ۔ پروفیسر مغنی تبسم۔ "لفظوں سے آگے" مضمون "نسائی تنقید" ص۔۱۲

حیثیت کے زیرِعنوان منعقدہ سیمنار میں پڑھا تھا۔
اقبال کا نظریۂ فن (چند معروضات) اس
مضمون کے متعلق پروفیسر النور الدین کہتے ہیں:
"اقبال کے نظریۂ فن پر بے شمار
مقالات لکھے گئے ہیں لیکن ان
میں عام طور پر اقبال کے مرکزی
تصور یعنی خودی سے روگردانی کی
گئی ہے اس کا سبب یہ ہے کہ لکھنے
والوں نے فن کے متعلق اقبال
کے خیالات کے انتخاب میں ان
کے نظریۂ خودی کی تشکیل سے ماقبل
اور بعد عہد سے تعلق رکھنے والے
اشعار میں فرق نہیں کیا ہے۔
جب کہ فن کی ماہیت اور مقصد
بالخصوص فلسفۂ جمال سے متعلق
تصورات کی تشخیص کے لیے ان کے
اس کلام سے صرفِ نظر لازمی ہے۔
جو فلسفہ خودی کی تشکیل سے پہلے
تخلیق پایا۔ کیونکہ اس میں فن اور
جمال کے جو تصورات پیش کیے گئے ہیں
وہ اقبال کے تصورِ خودی سے نہ صرف
میل نہیں کھاتے بلکہ متصادم و متضاد
بھی ہیں۔ اقبال کے نظریۂ فن کی
وضاحت میں یہ ایک ایسا اہم

نکتہ ہے جو عام ماہرینِ اقبالیات
کے نظروں سے پنہاں رہا ہے"[1]

ذیل میں جاوید نامہ کے اشعار ملاحظہ فرمائیے:

فطرتِ شاعر سراپا جستجو است
خالق و پروردگار آرزو است
شاعر اندر سینۂ ملت چو دل
ملتے بے شاعرے انبارِ گل
سوز و مستی نقشِ بندِ عالمی است
شاعری بے سوز و مستی ماتمی است
شعر را مقصود اگر آدم گری است
شاعری ہم وارثِ پیغمبری است

مغنی تبسم نے جاوید نامہ کے ان اشعار سے اقبال کے من تخلیقی نظریے کو پیش کیا ہے جو افلاطون کے نظریۂ نقل کی بھی ضد ہے۔ اقبال کے نظریۂ فن پر یوں تو بہت سے مضامین اور مقالے لکھے گئے ہیں اور ان کی علمی قدر و قیمت سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن ماہرینِ اقبال کے اس رویّے سے مغنی تبسم نے یہ شکایت کی کہ اقبال فکر کے ایک پہلو کو ہی تحقیق و تنقید کا موضوع بناتے ہیں تو ان کا اشہبِ قلم اس میدان میں اتنی دور نکل جاتا ہے کہ اقبال کی فکر کے اس مخصوص پہلو کا نظریۂ خودی سے ربط فرضی ہو جاتا ہے ایک اور خاص رجحان جو نظریۂ خودی کی مرکزی حیثیت کو نظر انداز کرنے کی وجہ سے خطرناک اور گمراہ کن بن گیا ہے، مغنی تبسم نے اقبال کے تقابلی مطالعے میں دیکھا۔

---

[1] ۔ پروفیسر انور الدین۔ "نظموں سے آگے ایک مطالعہ" مشمولہ نذرِ مغنی تبسم ص۔ ۴۲۳

جہاں مغرب و مشرق کے مفکرین کے خیالات اور اقبال کے تصورات کی بنیاد پر اقبال کے افکار کی نئی تعبیر پیش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

اقبال فن کے تخلیقی نظریے کے حامی تھے جو افلاطون کے نظریۂ نقل کا جواب ہے۔ اس سلسلے میں مغنی تبسم نے "اسرارِ خودی" کے وہ اشعار پیش کیے ہیں جن میں اقبال نے افلاطون کے نظریۂ اعیان پر تنقید کی ہے اور عالمِ اعیان کے بالمقابل عالمِ امکان کو زندگی کی دلیل ظاہر کیا ہے۔ اس طرح ادبی تنقید میں نقل کا تصور کسی نہ کسی طرح طویل مدت تک باقی رہا۔ فلپ سڈنی مغرب کا وہ پہلا نقاد تھا جس نے افلاطون کے نظریۂ نقل کی تردید کی اور اس کے مقابلے میں "تخلیق" کا تصور پیش کیا۔ وہ شاعر کی تخلیق کو فطرت کی تخلیق پر ترجیح دیتا ہے۔ سڈنی کے ان خیالات کی بازگشت مغنی تبسم نے اقبال کی مشہور نظم "تو شب آفریدی چراغ آفریدم" سے دی ہیں۔ جن سے فلپ سڈنی اور اقبال کی فکری مماثلت کا اندازہ ہوتا ہے۔ فلپ سڈنی شاعر کو وہی مرتبہ دیتا ہے جو پیغمبر کا ہوتا ہے۔ اقبال نے بھی اس مفہوم میں شاعر کو وارثِ پیغمبر کہا ہے۔ اس حد تک تو اقبال اور سڈنی ساتھ ساتھ چلتے نظر آتے ہیں لیکن ایک منزل پر سڈنی ٹھہر جاتا ہے اور اقبال آگے نکل جاتے ہیں۔ مغنی تبسم لکھتے ہیں:

> "چاہیے کا لفظ اقبال نے جس مفہوم میں استعمال کیا ہے وہ ارسطو اور سڈنی کے چاہیے

سے بالکل مختلف ہے۔ ارسطو
کا "چاہیے" صرف ایک امکان کو
پیش کرتا ہے اور سڈنی کا "چاہیے"
اخلاقی مفہوم رکھتا ہے۔ جب کہ
اقبال کے "چاہیے" کا اشارہ
اس متواتر تخلیق کی طرف ہے
جس سے خدا اور انسان دونوں
کا تسلسلِ حیات وابستہ ہے"[1]

آخر میں مغنی تبسم نے اقبال کا نظریۂ فن میں آزادی کے تصور کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے لون جائینس کے تصورِ آزادی سے مربوط کیا ہے۔ مغربی مفکرین کے فن سے متعلق نظریات کے پس منظر میں اقبال کے تصورِ فن کا یہ پہلا مطالعہ ہے جو اپنی انفرادیت کی وجہ سے اقبال شناسی میں ایک اہم کردار ادا کرتا ہے۔ "اقبال کا نظریۂ فن" کے بارے میں مضمون کے آخری پیرے اگراف میں مغنی تبسم لکھتے ہیں:

"شاعری کو وارثِ پیغمبری بنانے
والی ایک اور اہم چیز جس پر
اقبال نے بار بار زور دیا ہے
"سوز و مستی" ہے۔ اس وصف
کی تعبیر و توضیح بھی اقبال کے
تصورِ خودی اور تصورِ عشق
کے حوالے سے کی جانی چاہیے"۔ یہ

---

[1] پروفیسر مغنی تبسم۔ "لفظوں سے آگے" مضمون "اقبال کا نظریۂ فن" ص۔ ۲۳

سوز و مستی ہی ہے جو صاحبِ خودی
شاعر کو تخلیقِ آرزو پر مائل کرتی ہے
اور جو قاری میں حصولِ مقاصد
کی لگن پیدا کرتی ہے۔ یہ سوز
و مستی ہے جو شاعری اور فلسفے میں
خطِ امتیاز کھینچتی ہے"[1]

"اردو تنقید کو پروفیسر مسعود حسین خاں کی دین"
اس مضمون میں مفتی تبسم نے پروفیسر مسعود حسین خاں کے علمی، ادبی اور تحقیقی کاموں کا جائزہ لیتے ہوئے ان کے تنقیدی کارناموں پر بھی سیر حاصل تفصیلی نظر ڈالی ہے۔ یوں تو پروفیسر مسعود حسین صاحب کی شہرت ماہرِ لسانیات اور اردو زبان کے محقق کی حیثیت سے حاصل ہے اور اس سلسلے میں ان کا مقدمہ "تاریخِ زبان اردو" وہ تحقیقی شاہ کار ہے جو ان کے نام کو ہمیشہ زندہ رکھے گا۔ ادبی تحقیق کے میدان میں بھی ان کے کارنامے قابلِ ذکر ہیں۔ خاص طور پر اردو کی ادبی تحقیق کو لسانیاتی شعور بخشنے میں مسعود حسین خاں صاحب نے نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ تحقیق اور شاعری کے علاوہ پروفیسر مسعود حسین صاحب نے تنقیدی مضامین بھی لکھے ہیں جو بہت کم ہونے کے باوجود معیاری اور نتیجہ خیز ہے۔ مفتی تبسم نے مارکسی تنقید، تحلیل نفسی کی ٹکنیک اور آدی ٹائپی تنقید کے پس منظر میں مسعود حسین خاں صاحب کی ہیئتی اور اسلوبیاتی تنقید کے آغاز کی نشان دہی کی ہے۔ جس میں انھوں نے

---

[1] ۔ پروفیسر مفتی تبسم۔ "لفظوں سے آگے" "مضمون اقبال کا نظریۂ من" ص ۲۴۔

معود حسین خاں صاحب کے تنقیدی مضامین کا جائزہ لیا ہے اور چند اقتباسات کی روشنی میں معود حسین خاں کی فردیت اور آزادیِ اظہار، ادب میں جمالیاتی اور عمرانی اقدار کی ہم آہنگی، لسانیاتی تنقید کے طریقۂ کار اور اس طرزِ تنقید کی اہمیت کے بارے میں متن کار کے خیالات سے بھرپور عکاسی کی ہے۔ اس کے علاوہ مغنی تبسم نے اس مضمون میں اردو تنقید میں اسلوب شناسی، لسانیاتی مطالعہ شعر اور ادبی اسلوبیات کو معروف کروانے میں معود حسین صاحب کی خدمات کا متوازن جائزہ لیا ہے۔ مغنی تبسم کہتے ہیں:

"پروفیسر معود حسین خاں کے
تنقیدی اور تحقیقی مضامین کے
مجموعے "شعر و زبان" کی
اشاعت ۱۹۶۶ء کے بعد
معود صاحب کی علمی اور
ادبی سرگرمیوں کا محور بدل گیا۔
اور وہ تنقید سے بڑی حد تک
کنارہ کش رہے۔ ادبی اسلوبیات
سے معود صاحب کا شغف برقرار
رہتا تو یقین تھا کہ صوتیاتی سطح
کے علاوہ مطالعۂ متن کے دیگر
پہلو بھی ان کا موضوعِ فکر بنتے
اور اس کی وجہ سے اردو تنقید
میں ادبی اسلوبیات کی
بنیادیں زیادہ مستحکم ہوتیں

اور اس کے وقار و اعتبار میں
یک گونہ اضافہ ہوتا" [1]

مفتی قسیم کے ہر مضمون میں بھی متن کے اتحاد کی یہی صورت نظر آتی ہے۔

"گوپی چند نارنگ کی اسلوبیاتی تنقید" اس مضمون میں مفتی قسیم نے سب سے پہلے اسلوبیات کی بھرپور تعریف کی ہے۔ جو لسانیاتی تجزیے کے ذریعہ کسی تحریر کے صوتیاتی، صرفی اور معنیاتی سطحوں کا جائزہ لیتی ہے۔ اس سلسلے میں مفتی قسیم لکھتے ہیں:

"تجزیے کا عمل پیتھالوجسٹ کے
کام سے مماثلت رکھتا ہے۔ اس
کے برخلاف اسلوبیاتی نقاد
کسی فن پارے کی صوتی، صرفی
اور معنیاتی سطحوں سے گزر کر
مابعد الطبعیاتی سطح تک
رسائی حاصل کرتا ہے اور ماورائے
سخن کو اپنی گرفت میں لے آتا ہے۔
زبان کی ماہیت اور اس کے آغاز
وارتقا کے تمام مدارج سے باخبر
ہوتا ہے۔ سماجی ترسیل سے
لے کر تخلیقی استعمال کی سطح تک اظہار
کے مختلف پیرائے اس کی نگاہ

---

[1] پروفیسر مفتی قسیم۔ "لفظوں سے آگے" مضامین اردو تنقید کو پروفیسر مسعود صاحب کی دین۔
ص۔ ۳۱

میں ہوئے ہیں۔ ایسا نقادِ ادب
تحسین اور محاکمے کے منصب سے
پوری طرح عہدہ برآ ہو سکتا ہے"[1]

گوپی چند نارنگ کے اسلوبیاتی تنقید میں مغنی تبسم نے نارنگ صاحب کے فکر و فن کا جائزہ لیا ہے جس نے اپنی لگارشات کے ذریعہ اسلوبیاتی تنقید کو خاصا وقار و اعتبار بخشا ہے۔ نارنگ صاحب ماہرِ لسانیات ہونے کے علاوہ ایک معتبر نقاد بھی ہیں اس کے ساتھ ساتھ قدیم و جدید ادب کے سارے معنوی پہلو اور اسلوبیاتی چٹون ان کی نگاہ میں ہیں۔ گوپی چند نارنگ صاحب کے تنقیدی مضامین میں سے چند ایک خالص لسانیاتی تجزیوں پر مشتمل ہیں ان میں "ذاکر صاحب کی نثر۔ اردو کے بنیادی اسلوب کی ایک مثال" اور "خواجہ حسن نظامی کی نثری ارضیت" اس کے علاوہ انھوں نے قدیم و جدید شعرا کے فکر و احساس کی نوعیت اور اسالیب اور اظہار کی انفرادی خصوصیات کا جائزہ "اسلوبیاتِ میر" "اقبال کی شاعری کا صوتیاتی نظام" "اسلوبیاتِ اقبال" "نئی غزل کی معتبر آواز بانی" "ساقی فاروقی زمیں تیری مٹی کا جادو کہاں" "شہر شہال کا دردمند شاعر۔ افتخار عارف" "نئی شاعری اور اسم اعظم" میں مغنی تبسم نے گوپی چند نارنگ صاحب کے اسلوبیاتی تنقید کے چند نمائندہ اور کامیاب نمونوں کا نہایت باریک بینی اور ژرف نگاہی سے جائزہ لیا ہے۔ گوپی چند نارنگ صاحب

---

[1] پروفیسر مغنی تبسم۔ "لفظوں سے آگے" مضمون گوپی چند نارنگ کی اسلوبیاتی تنقید ص۔ ۳۳

کی اسلوبیاتی تنقید کے متعلق مغنی تبسم اس طرح رقمطراز ہیں:

"پروفیسر نارنگ کا کمال یہ ہے کہ وہ
نہایت شگفتہ پیرائے میں
ادق سے ادق بات کو بھی سہل
بنا کر پیش کر دیتے ہیں۔ خشک
علمی تعریفات سے ممکنہ حد تک
گریز کرتے ہوئے برجستہ مثالوں
سے تفہیم کا کام لیتے ہیں۔ یہ
مثالیں بجائے خود محکم دلیلیں
بن کر ذہن نشین ہی نہیں بلکہ
دلوں میں جاگزیں ہو جاتی ہیں۔
نارنگ صاحب کا کارنامہ
یہ ہے کہ انھوں نے اسلوبیاتی
تنقید کو لسانیات کے عالموں
اور طالب علموں کے محدود
حلقے سے باہر نکال کر ادب
کے عام قارئین تک پہنچا دیا ہے"[1]

"اردو مرثیہ کا مطالعہ صوتیاتی نقطۂ نظر سے" اس معرکتہ الآرا مضمون سے اندازہ ہوتا ہے کہ مغنی تبسم کی ذہنی جودت، علمی وسعت اور فکر کی گہرائی کا انداز ہوتا ہے۔ اس مضمون میں مغنی تبسم قدیم عروض کے متعلق چند اعتراضات پیش کرتے ہیں لکھتے ہیں:

---

[1] - پروفیسر مغنی تبسم۔ "لفظوں سے آگے" گوپی چند نارنگ کی اسلوبیاتی تنقید ص - ۳۹

"اردو (عربی، فارسی) علم عروض
کی بنیاد حرف کے تصوّر پر قائم ہے
ماہرین عروض کے پاس مصوتے
یا vowel کا تصور موجود
نہیں تھا، یا غیر واضح تھا۔ حروف
صحیح اور حروفِ علت میں وہ
فرق ضرور کرتے تھے لیکن حروفِ
صحیح کی طرح حروفِ علت کو بھی
وہ صامت سمجھتے تھے، حرکات کے
بغیر بے صدا تھے۔ ان کے نظریے کی
رو سے لفظ "جا" اس وقت تک
پڑھا، یا ادا نہیں کیا جا سکتا تھا
جب تک کہ "ج" پر زبر (َ)
نہ لگائی جائے = جَا"[1]

اس کے علاوہ مغنی تبسم ایک اور اعتراض
بھی کرتے ہیں کہ عروضیوں کے نزدیک نونِ غنّہ مستقل حرف ہے
جب کہ صوتیاتی نقطۂ نظر سے یہ الگ حرف نہیں ہے۔ مصوتے
کی ادائگی کے متعلق بھی وہ کہتے ہیں کہ سانس نتھنوں کی
راہ سے نکلتی ہے تو انفیت پیدا ہوتی ہے چنانچہ ا (ā) کی
طرح اں (āṃ) بھی ایک مصوتہ ہے دو حروف نہیں ہیں۔
انھوں نے سالم ارکان سے زحاف کے استخراج کے تصور کو
بھی غیر علمی اور غیر ضروری قرار دیتے ہیں اور زحافات کو علم عروض

---

[1] ۔ پروفیسر مغنی تبسم۔ "لفظوں سے آگے"۔ مضمون اردو عروض کا مطالعہ
ص ۔ ۴۰

کی پیچیدگیوں کا سب سے بڑا سبب مانتے ہیں اور اس زحاف سے متعلق اس کے اجزائے ارکان کا تفصیلی جائزہ لیتے ہوئے ان ارکان کے مختلف اجزا، سبب، وتد اور فاصلہ میں کمی بیشی کرکے زحافات بنا کر مختلف ارکان میں اس کی ایک ہی شکل پیش کرتے ہیں۔ عروضی تجزیہ کے بعد انھوں نے ان عروض کا صوتیاتی تجزیہ بھی کیا ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے بحور اور اوزان چھوٹے اور لمبے مصرعوں کی ترتیب اور تکرار سے تشکیل پانے والے اُردو زبان کے دس مصرعے بھی پیش کیے ہیں۔ اوزانِ رباعی سے انھوں نے عروضی نظام کی لچک داری کا بھرپور جائزہ لیتے ہوئے جدول کے ذریعہ اوزان رباعی کے صوتی تنوع کا اندازہ لگایا گیا ہے۔

مغنی تبسم کے الفاظ میں:

"علمائے قدیم، کلام کی موزونیت
اور آہنگ کی گہری بصیرت
رکھتے تھے۔ ان کے راستے پُرپیچ اور
طویل تھے لیکن وہ منزل سے
بھٹکے نہیں۔ نابغاؤں نے اس
علم میں قابلِ قدر اضافے کیے۔
افسوس یہ ہے کہ مقلدین کے
جنگل میں پھنس کر اس کی
لَو دھیمی پڑ گئی۔ یہ سمجھنا
کہ تلاش و تحقیق، تجدد
اور ایجاد و اختراع کا حق
صرف قدما کو حاصل تھا

درست ہیں ہے"[1]

موجودہ دور میں عروض کی ترقی کے متعلق اس طرح رقمطراز ہیں:

"متقدمین نے اپنے عہد کے علم زبان سے استفادہ کرتے ہوئے عروض کا علم ایجاد کیا اور اسے ترقی دی۔ لسانیات کا علم ان منزلوں سے بہت آگے بڑھ چکا ہے۔ ضرورت ہے کہ اس کی روشنی میں علم عروض کا از سر نو جائزہ لیا جائے۔ ہمارا علم عروض ہم سے ڈیڑھ صدی پیچھے ہے۔ اس کا دائرہ کار روایتی اصناف سخن تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ جدید علم صوتیات سے مدد لے کر علم عروض کو عصری شعری تقاضوں سے ہم آہنگ بنایا جا سکتا ہے"[2]

مغنی تبسم کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ وہ اس انداز سے اپنے مضمون کو سمیٹتے ہیں کہ جو شخص عروض کو نہ بھی سمجھ سکتا ہو وہ اس نقطۂ نظر کو بآسانی سمجھ جاتا ہے۔ یہی ان کی انفرادیت جو قاری کو پڑھنے پر مجبور کر دیتی ہے۔

---

[1] پروفیسر مغنی تبسم۔ "لفظوں سے آگے"۔ اردو عروض کا مطالعہ ص ۲۵

[2] پروفیسر مغنی تبسم۔ "لفظوں سے آگے"۔ اردو عروض کا مطالعہ ص ۵۴

"لالۂ صحرا" (اقبال کا ایک علامتی پیکر) اس مضمون میں انھوں نے اقبال کے اسلوب اور ان کے تخلیقی سفر کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔ مغنی تبسم نے اقبال کی شاعری کا پیکر لالہ کے استعارے کو فارسی اور اُردو شاعری کے اساتذۂ سخن کے استعاروں کے پس منظر میں زیرِ بحث لایا ہے اور اس ضمن میں انھوں نے اقبال کے ان استعارے کو پیش کیا ہے جن میں لالہ کا علامتی کردار واضح ہوتا ہے اور اس سلسلے میں انھوں نے اقبال کے فارسی شاعری میں بھی اس استعارے کے استعمال کو اجاگر کیا ہے۔ جو اقبال کی شخصیت کی نشوونما میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ مغنی تبسم کے الفاظ میں:

> "اقبال کی علامتی ایک طویل اسلوبیاتی کشمکش اور لسانی جدلیت کی آئینہ دار ہے"[1]

جاں نثار اختر کا مجموعہ کلام "پچھلے پہر" اس موضوع کے تحت مغنی تبسم نے ایک تبصرہ پیش کیا ہے۔ جاں نثار اختر

---

[1] ۔ پروفیسر مغنی تبسم۔ لفظوں سے آگے "لالۂ صحرا"۔ اقبال کا ایک علامتی پیکر۔ ص ۵۵، ۵۶

کی شاعری میں جو نیا طرزِ احساس ہے وہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ
فن کار کی حیثیت سے جاں نثار اختر نے دوسرا جنم لیا ہے۔
جاں نثار اختر ایک منفرد غزل گو شاعر ہے۔ انھوں نے
دبستانِ غزل کے جدید شعرا کے اثر کو بھی قبول کیا تھا۔
اس مضمون میں مغنی تبسم نے نہ صرف جاں نثار اختر کی نظم
"پچھلے پہر" کا جائزہ لیا ہے بلکہ جاں نثار اختر کی غزل گوئی کی
بھی نشان دہی کی ہے۔ اور اس فن میں جاں نثار اختر کی
لفظیات، تشبیہات اور استعارات کے علاوہ امیجری
سے بھرپور اشعار کا انتخاب بھی خوب کیا ہے جو ان
کی گہری نظر کی غماز ہیں۔ اس مضمون کے متعلق مغنی تبسم
کہتے ہیں:

"تنہائی شاعر کو اپنے وجود کا احساس
دلاتی ہے اور وہ اپنی ذات کی
تلاش میں لگ پڑتا ہے۔
عرفانِ ذات کی منزل پر پہنچ کر
جب وہ مراقبے سے بیدار ہوتا ہے
تو دوبارہ کثافتوں اور روایتوں
سے آئی ہوئی دنیا کی طرف لوٹتا ہے۔
"پچھلے پہر" کی شاعری اسی سفرِ ذات
اور بازگشت کی روداد پیش
کرتی ہے" [1]

اس تبصرہ کے متعلق ڈاکٹر ناصرہ بیگم لکھتی ہیں:

---

[1] - پروفیسر مغنی تبسم - "لفظوں سے آگے" جاں نثار اختر کا مجموعہ کلام "پچھلے پہر"
ص - ۶۳

"بہ حیثیت مجموعی جاں نثار اختر کا ایک
شعر جو مصنف نے درج کیا ہے
اس سلسلے میں حسب ذیل ہے ؎
تو کہ بہتی ہوئی ندیا کے سمان
تجھ کو دیکھوں تو مجھے پیاس لگے
اس کتاب میں ایک فرق یہ بھی
ہے کہ شاعر کی جس نظم اور
افسانہ لگا رکے جس افسانہ پر
تنقید ہے اس کو اس کتاب میں
شامل کر دیا گیا ہے۔ اس کا فائدہ
قاری، مصنف اور ناقد تینوں
کو حاصل ہوتا ہے۔ قاری کو فن
پارہ کی تلاش سے نجات
ملتی ہے۔ مصنف کے فن پارہ
کی تشہیر ہوتی ہے اور ناقد کی
تنقید کا تاثر ترسیل کے المیہ
کا شکار ہونے سے محفوظ رہتا ہے"[1]

"شائستہ یوسف ایک نسائی آواز" یہ موضوع دراصل شائستہ یوسف کی نثری نظموں کا مجموعہ "گل خود رو" کا پہلا لفظ ہے۔ اس مضمون میں مفتی تبسم نے شائستہ یوسف کے کلام میں ایک مخصوص نسائی مزاج، حسیت اور لہجے کو محسوس کیا ہے۔ اور ان کے کلام کو جدید پاکستانی شاعرات جیسے کشور ناہید،

---

[1] ڈاکٹر ناصرہ بیگم۔ "لفظوں سے آگے" مشمولہ نذر مفتی تبسم
ص-۱۳۱، ۱۳۲ء

ہمیدہ ریاض، پروین شاکر اور سارہ شگفتہ سے قریب کرتے ہیں
ان کے مکالم کے متعلق مغنی تبسم اس طرح رقمطراز ہیں :

" شائستہ یوسف کی شاعری رومان
سے حقیقت کی طرف ایک سفر ہے
رومانی تصوریت کی شکست
اور زندگی کی برہنہ حقیقتوں
کے تجربے سے پیدا ہونے والا
کرب ان کے لیے بنیادی تخلیقی
ہیج بن گیا ہے ۔ عورت اور مرد
کے ازلی اور ابدی رشتے میں
پنہاں جذب و گریز پہلوؤں
اور بصری سماجی زندگی میں
ان کے پیچیدہ اظہارات کو
انہوں نے اپنا موضوعِ خاص
بنایا ہے "[1]

شائستہ یوسف نے اپنے کلام میں عورت کے اس
کردار کو بڑی خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے ۔ جو زندگی کی مادی
حقیقتوں کی بھرپور بصیرت رکھتی ہے ۔ مغنی تبسم شائستہ
یوسف کے مکالم سے بہت زیادہ متاثر ہوئے ہیں لکھتے ہیں :

" اس منفرد اندازِ اظہار کے ساتھ
وہ نظم کی تعمیر کا ہنر بھی جانتی ہیں ۔
ان کی کہانیاں آغاز و انجام کی حدوں

---

[1] ۔ پروفیسر مغنی تبسم ۔ "لفظوں سے آگے" سفون شائستہ یوسف ۔ ایک لسانی اُدا
ص ۔ ۶۹

کے اندر ایک تخیلی زندگی کو پیش
کرتی اور اپنی بنائی ہوئی تصویر
کو اس طرح چوکھٹوں میں محدود
و محصور کرتی ہیں کہ لگتا ہیں
مرکز پر جمی رہتی ہیں بھٹکتی نہیں
پاتیں۔ شائستہ یوسف کی
شعر گوئی کا محرک و مقصد محض
جذبات کا اظہار و تسہیل
اور ان کی ترسیل و برانگیختگی
نہیں ہے بلکہ وہ اپنی ہر تخلیق
کو ایک جمالیاتی معروض کی
شکل دیتی ہیں جو خاص وجدانی
کیفیت پیدا کرتا ہے"[1]

"راشد آذر کی دنیا" (نقش آذر، مجموعہ وفا تک)۔ اس مضمون میں راشد آذر کی شاعری کے سوکا فکر و فن کے پس منظر میں جائزہ لیا ہے۔ راشد آذر کی شاعری کا بنیادی عنصر عشق ہے اور ان کے کلام میں اس کی تمام صورتیں مل جاتی ہیں۔ راشد کا عشق تمام تر جنسی، ارضی اور مجازی ہے۔ آذر نے اسے ترفع دینے یا مثالی بنانے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ اس کی وجہ عشق کے ان تجربات اور مسائل ہے جن کے پس پردہ وہ تمام سماجی،

---

[1] ۔ پروفیسر مغنی تبسم۔ "لفظوں سے آگے" شائستہ یوسف ۔ ایک نسائی آواز ۔ ص ۔ ۱۷

معاشی اور نفسیاتی عوامل کارفرما رہے ہیں۔ مغنی تبسم کہتے ہیں:

"راشد آزر کی شاعری کا واحد
متکلم ایک باشعور انسان ہے۔
اسے زندگی عزیز ہے۔ اور انسانیت
سے پیار ہے۔ وہ زندگی کو
بھرپور طریقے سے جینا چاہتا ہے
اور یہی خواہش تمام انسانوں
کے لیے بھی اپنے دل میں رکھتا ہے
اس کے عشق میں سادگی، سچائی
اور خلوص ہے لیکن آغازِ عشق
ہی میں اسے ناکامی اور محرومی
سے دوچار ہونا پڑا ہے"[1]

ان تینوں تنقیدی مضامین "لالۂ صحرا۔ اقبال کا ایک علامتی پیکر"، "جاں نثار اختر کا مجموعہ کلام "پچھلے پہر" اور شائستہ یوسف — ایک نسائی آواز" کے متعلق پروفیسر انور الدین کہتے ہیں:

"لفظوں سے آگے کے دامن میں
تین مضامین، دورِ حاضر کے تین
شاعروں کے مجموعے کے تنقیدی
مطالعے پر مشتمل ہیں جن میں
مغنی تبسم نے ان فن کاروں کے
فکری و احساس کے مطالعے کے

---

[1] پروفیسر مغنی تبسم۔ "لفظوں سے آگے"، راشد آزر کی دنیا۔ ص ۷

ساتھ زبان کے تخلیقی استعمال کے
ضمن میں ان کے مخصوص رویوں
کی تشخیص کی ہے اور ان کے
اسالیب کا تعین کیا ہے"۔[1]

ن ۔ م راشد کی نظم "مرگِ اسرافیل"
کے علاوہ نظم "مجھے وداع کر" اور خلیل مامون کی تین نظمیں
ان تینوں مضامین پر عملی تنقید کی گئی ہے۔

خدا کے اس مقرب فرشتے کے بارے میں مختلف
روایات کو انھوں نے یکجا کر کے اس کی دلکش اور دل
چسپ تصویر کھینچی ہے۔ اسرافیل صور سے دہشت ناک آواز
پیدا کرنے کے علاوہ عظیم موسیقار بھی ہے جس کی آواز قیامت
کے بعد اپنے وجد آور نغموں سے اہلِ جنت کو مسحور بھی کرے گی۔
جب شاعر اچانک اسرافیل کی موت کا اعلان کرتا ہے تو
یوں محسوس ہوتا ہے کہ نظامِ قدرت متبدیل ہو گیا ہے اور
اس کی موت سے آواز کا بھی سفر ختم ہو گیا ہے جو خدا کی
اولین تخلیق اور ہر تخلیق کا سرچشمہ تھی گویا اسرافیل کی
موت ترسیل اور اظہار کی موت ہے اور اب خدا اور
انسانوں کے درمیان رابطہ بھی قائم نہیں رہا۔ اور ادھر دنیا
والے کچھ کہہ سکتے ہیں نا کچھ سن سکتے ہیں اور نطق و انسان
کا جو ہر تھا وہ اس سے چھن گیا۔ علم و فن کے چراغ بجھ
گئے ہیں اور سے کدے ویران پڑے ہیں۔ خانقاہیں
اجڑ گئی ہیں مغنی تبسم کہتے ہیں۔

---

[1] ۔ پروفیسر انوار الدین۔ "لفظوں سے آگے" ایک مطالعہ۔ مشمولہ نذر مغنی تبسم
ص ۔ ۴۲۵

اس نظم میں راشد نے انسانی زندگی
کی موجودہ صورتِ حال سے پیدا
ہونے والے لایعنیت کے احساس
کو بڑی فنکاری کے ساتھ تمثیلی
پیکر میں ڈھال دیا ہے"۔[1]

مغنی تبسم نے اس نظم کی متنی مواضع کے ساتھ ساتھ
اس کے بحر و آہنگ کا بھی تجزیہ کیا ہے۔ اور اس کے صوتی نظام
کے محاسن کو بھی روشن کیا ہے۔

ن۔م راشد کی دوسری نظم "مجھے وداع کر"
اس نظام کے عملی تنقید میں مغنی تبسم نے نہ صرف اسلوبیاتی
طریقہ کار پر زور دیا ہے بلکہ اسلوبیاتی اصولوں کو بھی جاری
رکھا۔ راشد آزر کی یہ نظم جس کی بنیاد شعری ابلاغ میں
لب و لہجہ اور صوتی دروبست پر قائم ہے اس کی صوتی
کیفیات پر توجہ نہ دی جائے تو اس نظم سے لطف اندوزی
اور اس کی تحسین ممکن نہیں۔ کہتے ہیں:

"صوتی آہنگ اور صوتی محاکات
کے ساتھ نظم کی تشبیہ لگاری بھی
قابل توجہ ہے۔ اس نظم میں بصری،
سمعی، لمسی، حرکی ہر طرح کی
تشبیہیں لائی گئی ہیں۔ اور ان کے
امتزاج سے مرکب تشبیہیں بھی بنائی
گئی ہیں۔ ان تشبیہوں کے ذریعہ

---

[1] پروفیسر مغنی تبسم۔ "لفظوں سے آگے" مضمون۔ ن۔م راشد کی نظم مرگِ اسرافیل
ص۔۹۸

قوتِ ارادی، داخلی کشمکش
اور تصادم کو پیش کرتے ہوئے
ایک ڈرامائی کیفیت پیدا کی گئی ہے۔
شبیہ نگاری میں سادہ تشبیہوں،
استعاروں اور قول متناقص
کے علاوہ تشبیہی اور وصفی
مرکبات سے بہت زیادہ کام
لیا گیا ہے" [1]

مغنی تبسم نے اس نظم کی قدر شناسی اور
اس کی عملی تنقید اس نوع سے کی ہے کہ یہ مضمون غیر معمولی
اہمیت کا حامل ہو گیا ہے۔

"خلیل مامون کی تین نظمیں" اس مضمون میں
مغنی تبسم نے خلیل مامون کی تین نظمیں "غزالِ شب کے ساتھ"،
"شاعری مت کرو" اور "مہاتما گاندھی روڈ پر"، کا تنقیدی
مطالعہ کیا ہے۔ پہلی نظم "غزالِ شب کے ساتھ" اپنے عنوان
سے ہی ذہن میں تجسس پیدا کر دیتی ہے۔ غزالِ شب کون ہے؟
غزالِ شب سے کیا مراد ہے اور یہ تشبیہی مرکب ہے یا مرکب نسبتی؟
یا استعارہ ہے۔ ان تمام کا مغنی تبسم نے نہایت خوبی سے
جائزہ لیا ہے۔ دوسری نظم "شاعری مت کرو" جو کہ ایک
طنزیہ نظم ہے۔ اس کے متعلق مغنی تبسم کہتے ہیں:

"شاعری مت کرو" پیغام نہیں
بلکہ معاشرے کی صورتِ حال

---

[1] ۔ پروفیسر مغنی تبسم۔ "لفظوں سے آگے"۔ ن۔م راشد کی نظم "مجھے وداع کر"
ص۔ ۱۱۳

پر شدید ردِ عمل کا اظہار ہے۔
احتجاج ہے اور نظم کا اختتامی
حصّہ زندگی کی تلخ حقیقتوں سے
فرار اور ماوا ہونے کی آرزو
یا خواہش کو پیش نہیں کرتا بلکہ
وہ بھی اس احتجاج کا حصّہ
بن جاتا ہے"[1]

تیسری نظم " مہاتما گاندھی روڈ پر" یہ نظم
اپنے پیکروں کی وساطت سے چند مشاہدات کو پیش کرتی ہے۔
اس نظم میں ایسی توضیحات پیش کی گئی ہیں جن کا مقصد ہر ایک
وقت زمانے کی نیرنگی اس کے حسن اور اس کی اچھائیوں
اور برائیوں کا اظہار کرنا ہے۔ مغنی تبسم کا یہ مضمون
خلیل مامون کی تین نظمیں شاعر کے نام کے اظہار کے بغیر
سونات میں تجزیے کے لیے دی گئی تھیں یہ تجزیے نظموں کے
ساتھ سونات نمبر ایک میں شائع کیے گئے ہیں اور ہر تجزیے کے آخر میں
تجزیے سے متعلق شاعر کی رائے بھی دی گئی ہے۔

" لفظوں سے آگے " میں مندرجہ بالا تنقیدی مضامین
کے بعد والد تنقیدی مضمون " مجتبیٰ حسین کی مزاح نگاری"
پر ہے۔ اس مضمون میں مغنی تبسم نے اردو کے نام ور
مزاح نگار مجتبیٰ حسین کے فن کا تنقیدی جائزہ نہایت
مبسوط اور سیر حاصل لیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ مجتبیٰ حسین کی
مزاح نگاری کی اہم خصوصیات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

---

[1] ۔ پروفیسر مغنی تبسم ۔ لفظوں سے آگے ۔ مضمون "خلیل مامون کی تین نظمیں"
ص ۱۲۵ ۔

اس مضمون میں مجتبیٰ حسین کے مزاحیہ مضامین "کالونی میں رہنا"۔ "حسن الدین احمد۔ لفظوں کا آدمی"، "بانی۔ نو آدمیوں کا آدمی"، "نیا سال پرانا سال"، "دوڑیئے گھوڑے ہم نے"، "جاپان چلو"، "ایک شاعر کی رنگ کا فردی"، "مخمور سعیدی۔ بحیثیت مجموعی آدمی"، "یہ رکشا والے"، "ٹرین میں پڑھنا"، "سورج گہن کی یاد میں"، "عید کی تیاری"، "بلراج۔ ورما نے 'تناظر' نکالا"، "ظ انصاری سے ظ انصاری تک" "اعجاز صدیقی اردو کا آدمی" کا بھرپور جائزہ لیا گیا ہے۔

مجتبیٰ حسین کی تحریروں کے متعلق کہتے ہیں:

"جو ادب سنانے کے لیے تخلیق
کیا جائے وہ تفریح اور بیان
کا شکار ہو جاتا ہے۔ مجتبیٰ حسین
اپنے محدود قارئین کے علاوہ
کثیر سامعین کی کشش بھی رکھتے ہیں۔
اس کے اثرات ان کے فن پر
مرتب ہونے لگے ہیں۔ وہ
ایما اور اشارے میں کوئی
بات کہہ کر مطمئن نہیں ہوتے۔
غیر ضروری طور پر اس کی تفریح
بھی کرتے ہیں تاکہ وہ معمولی سمجھ
بوجھ کے قارئین اور عام سامعین
کی سمجھ میں آجائے۔ کبھی مبالغے کو
غلو کی سرحدوں تک ملا دیتے ہیں

یوں لگتا ہے کہ وہ قارئین سے
کچھ مایوس ہو چلے ہیں لیکن قارئین
کا حلقہ کتنا ہی محدود کیوں نہ ہو،
اعلیٰ درجے کے ادب کی تخلیق
کے لیے انھیں کے ذوقِ صحیح کو
مطمئن کرنا ہوگا" ۱؎

مغنی تبسم کے تنقیدی مضامین کے متعلق
ڈاکٹر ناصرہ بیگم لکھتی ہیں :

"کتاب کے پہلے صفحے پر کتاب
کے نام کے نیچے درج ہے تنقیدی
مضامین لیکن ہر نقید کے مطالعے
کے اختتام پر احساس ہوتا ہے کہ
یہ تو توصیف ہو گئی۔ مجتبیٰ حسین کی
مزاح نگاری والے مضمون میں
ایک لفیس ناریل مقولہ
"برہنہ حرف نہ گفتن کمال گویائی
است" جو غالباً مغنی تبسم کا رہنما یانہ
اصول ہے، اس لیے جہاں تنقید کا
لہجہ بنتا ہے اس کو بھی وہ نودرا
توصیف کے لباسِ فاخرہ سے آراستہ
کر دیتے ہیں" ۲؎

۱؎ ۔ پروفیسر مغنی تبسم "لفظوں سے آگے" مضمون مجتبیٰ حسین کی مزاح نگاری۔ ص ۱۲۵
۲؎ ۔ ڈاکٹر ناصرہ بیگم ۔ "لفظوں سے آگے" مشمولہ۔ نذرِ مغنی تبسم ص ۔ ۴۳۳

"اردو افسانہ کے پچیس سال" یہ اور اس کے بعد کے آخری پانچ مضامین بھی فکشن کی تنقید سے متعلق ہیں۔ مغنی تبسم نے یہ مضمون مکیدی خطبے کے طور پر آندھرا پردیش اردو اکیڈیمی کی جانب سے منعقدہ ۱۹۷۹ء میں سمینار میں یہ عنوان "اردو افسانہ کے پچیس سال" کے موقع پر پیش کیا تھا۔ مغنی تبسم نے نہایت گہرائی اور عمیق نظروں کے ساتھ اردو افسانہ کی ربع صدی کا مطالعہ کیا ہے اور اس مدت میں منظرِ عام پر آنے والے تمام تخلیق کاروں کے فن کی اہم خصوصیات پر روشنی ڈالی ہے۔ اور اس ضمن میں اردو کی تمام تحریکوں، رجحانات اور افسانہ نگاری کی تکنیک کے ساتھ ساتھ اہم افسانوں کا بھی حصار کیا گیا۔

افسانوں میں مغنی تبسم زبان کے تخلیقی استعمال پر زور دیتے ہیں۔ علامتی کہانیوں کی اصطلاح پر ہی ان کو اعتراض ہے اور علامتی کہانیوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

"ادھر جو علامتی کہانی کی اصطلاح
چل پڑی ہے اس پر مجھے اعتراض
اس لیے ہے کہ ہر فن پارہ بجائے
خود ایک علامت ہوتا ہے۔ کہانی
اگر فنی تخلیق ہے تو وہ لازمی
طور پر علامت تو ہی ہے گی
جب اسے فن کار کسی پیچیدہ
تجربے کے اظہار کا ذریعہ
بنائے گا۔ ایسا تجربہ جسے
سادہ لفظوں میں بیان نہ

کیا جا سکے۔[1]

مغنی تبسم سائمری میں ہی زبان کے تخلیقی استعمال پر زور دیتے بلکہ نثر میں بھی وہ زبان کے تخلیقی استعمال کی شرط اوّل رکھتے ہیں۔ منٹو کی کہانی پھندے کے متعلق لکھتے ہیں:

"پھندے" اردو کی پہلی بھرپور کہانی ہے جس میں زبان کا تخلیقی استعمال اپنے کمال پر نظر آتا ہے اور یہی وہ وصف ہے جو کسی تحریر کو ادب کہلانے کا مستحق بناتا ہے۔"[2]

مغنی تبسم لکھتے ہیں:

"گزشتہ پچیس برس میں اردو کہانی نے ایک طویل سفر کیا ہے۔ ہماری داخلی واردات اور خارجی زندگی کے مسائل سے اس کا رشتہ اٹوٹ رہا ہے۔ وہ ہماری خلوت و جلوت کا راز دار اور شریک

---

[1] ۔ پروفیسر مغنی تبسم "لفظوں سے آگے" مضمون اردو افسانے کے پچیس سال۔ ص ۱۵۲

[2] ۔ ایضاً ایضاً ص ۔ ۱۵۶

رہا ہے۔ اس نے ہمارے ادبی
سرمایے میں گراں قدر اضافہ
کیا ہے۔ اور اس واسطے سے
کلچر کی نشوونما میں بھی اپنا حصّہ
ادا کیا ہے۔ ان برسوں میں
اظہار کے نت نئے تجربے ہوئے۔
ہر اسلوب اور ہر طرز میں بہت
سی اچھی اور چند بڑی کہانیاں
لکھی گئیں۔"[1]

"انل ٹھکر کے افسانے" اس مضمون میں مغنی تبسم نے انل ٹھکر کے زبان و بیان اور خیالات کے بہاؤ کو ندی کے مانند قرار دیتے ہیں۔ اس مضمون میں انل ٹھکر کے افسانے "مٹھی بھر خاک"، "بلند ٹنڈ چال"، "جہنم کا خریدار"، "گرم برف"، "گمان سے پرے" کا جائزہ لیا ہے۔ گرم برف جو انل ٹھکر کے افسانوں کا مجموعہ ہے ان افسانوں کے متعلق مغنی تبسم اس طرح رقمطراز ہیں:

"انل ٹھکر کسی موضوع یا خیال کو پیش
کرنے کے لیے کہانی کو وسیلہ نہیں
بناتے۔ وہ تو زندگی کے تماشا
میں ہیں اور زندگی کا تماشا
دکھاتے ہیں ان کی نگاہیں خارجی
نقاب کو اُدھیڑ کر زندگی کو اس

---

[1] ۔ پروفیسر مغنی تبسم۔ "لفظوں سے آگے" مضمون۔ اردو افسانے کے پچیس سال۔
صفحہ ۔ ۱۶۰

اصلی روپ میں دیکھتی ہیں اور
اس عمل میں وہ قاری کو اپنا
شریک بنا لیتے ہیں۔ ان کی دلچسپی
زندگی کو اس کی تمام پیچیدگیوں،
اور تضادات کے ساتھ بے نقاب
کرنے میں ہے۔ وہ متعین موضوع
پر کہانی نہیں لکھتے بلکہ موضوع
کہانی سے ابھرتا ہے یا پھر قاری اسے
تلاش کر لیتا ہے" [1]

"بیگ احساس کا افسانوی سفر۔ تمثیل سے علامت
تک" اس مضمون میں مغنی تبسم نے بیگ احساس کے فنی
و تخلیقی ارتقا کو تمثیل سے علامت تک کے سفر سے توضیح کی ہے۔
بیگ احساس کے افسانے " سوائیز ے ہرسورج"، "بنا" گاہ
کی تلاش"، "گرمنو"، "ملبہ"، "خس آتش سوار" اور
"برزخ" کا مغنی تبسم نے جائزہ لیا ہے۔ ان افسانوں
کے متعلق مغنی تبسم لکھتے ہیں:

" اپنے انداز فکر اور طرز احساس
کے اعتبار سے بیگ احساس بانیوں
بازو کے جدید اردو افسانہ نگار
نظر آتے ہیں۔ انھوں نے بعض
کہانیوں میں سماجی استحصال،
کرپشن، سیاسی جبر اور فرقہ

---

[1] ۔ پروفیسر مغنی تبسم۔ "لفظوں سے آگے"، مضمون از ڈاکٹر گوپی چند نارنگ۔
ص۔ ۱۶۴

وارانِ فسادات کے خلاف
صدائے احتجاج بلند کی اور استحصال
کرنے والے طبقے کی بداعمالیوں کا
پردہ چاک کیا"[1]

بیگ احساس کے تمثیلی پیرایوں کے تنوع کی
وضاحت کرتے ہوئے مغنی تبسم توقع رکھتے ہیں کہ اردو کہانی جو
ایک موڑ پر آکر رک سی گئی ہے اسے نئی سمت اور رفتار
دینے میں بیگ احساس اہم فریضہ ادا کریں گے۔

"جیلانی بانو کی کہانی ۔۔۔ ادّو ایک مطالعہ" یہ ایک
مشہور افسانہ لگتا ہے۔ مغنی تبسم نے اس افسانے کے متعلق
دو خوبیاں بیان کی ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس کے مطالعہ کے بعد
تکمیل کا ایک اطمینان بخش احساس اور دوسرا یہ ایک خود
مکتفی من پارہ ہے یعنی آپ اپنا مفہوم ہے۔ اس میں
کسی مثال، نظریہ، تصور یا عقیدے کی ترسیل نظر نہیں
آتی جسے ٹھیک ٹھیک مفاہیم پہنائے جا سکتے ہیں۔

"یہ کہانی جو بظاہر اخلاقی تصورات
اور مذہبی ایقانات کو رد کرتی
دکھائی دیتی ہے، حقیقت میں
گہری مذہبی اور اخلاقی حسیت
کی حامل ہے۔ جس کا ثبوت
وہ کیفیتِ حزن ہے جس سے ہم
کہانی کے انجام پر دوچار ہوتے ہیں۔

---

[1] ۔ پیروڈیِ مغنی تبسم۔ "لفظوں سے آگے" بیگ احساس کا افسانوی سفر۔
ص ۔ ۱۶۶

جہاں پہنچ کر اُدّو ایک سوالیہ
نشان بن کر فوہم کو بھی سراپا
استفسار بنا دیتا ہے"[1]

عوض سعید کی کہانی "فیرنی" یہ بھی ایک مشہور افسانہ لگا رہے۔ مغنی تبسم نے اس مضمون میں خالص اسلوبی علامتوں کی تشریح و تفہیم کی ہے۔ اور انھیں مختلف مفاہیم دیے ہیں۔ اس کہانی کے متعلق لکھتے ہیں۔

"علامتیں ناقابل تشریح ہوتی ہیں
انھیں مختلف مفاہیم دیے جاسکتے ہیں۔
اور ایسا کرنے پر وہ شاعرانہ
منطق پر پوری اتر جاتی ہیں۔
بصورتِ دیگر قاری بوقدیم
طرز کی کہانیوں کے عادی ہیں
جدید کہانیوں کو پڑھ کر جھنجلاہٹ
محسوس کرتے ہیں کہ آخر یہ سمجھ کیا ہے؟
اب کہانی پیچھے جانے سے تو رہی۔
قاری کو اپنا عادت بدلنی ہوگی۔
اور ادب کی تحسین کا صحیح طریقہ
سیکھنا ہوگا۔ کہانی میں مطلب
تلاش کرنے کی بجائے اس کے
مجموعی تاثر سے سروکار رکھنا چاہیے"[2]

---

[1] ۔ پروفیسر مغنی تبسم "لفظوں سے آگے" مضمون۔ جیلانی بانو کی کہانی اور ایک مطالعہ ص ۱۷۷

[2] ۔ پروفیسر مغنی تبسم "لفظوں سے آگے" "عوض سعید کی کہانی فیرنی" ص ۔ ۱۸۴

"مشتاق مومن کی کہانی مردم گزیدہ" یہ مضمون لفظوں سے آگے" کا آخری مضمون ہے جس میں مشتاق مومن مشہور افسانہ نگار کا افسانہ "مردم گزیدہ" کا تجزیہ کیا ہے۔ مفتی تبسم کا خیال ہے کہ مشتاق مومن کی کہانی میں تجریدی اسلوب کے ساتھ ساتھ وجودی صورتِ حال کا بھی مقابلہ کرتی ہے۔ مشتاق مومن نے اپنی کہانی میں قصہ، پلاٹ اور کردار کی پاس داری کے ذریعہ قدیم اسلوب کی بھی بازیافت کی ہے۔ لکھتے ہیں:

"مشتاق مومن کی یہ کہانی فنی
تکمیل کا اچھا نمونہ ہے۔ اس کی
ٹکنیک اور صناعت قابلِ داد ہے۔
متوازی واقعات اور مناظر
کے ذریعے خاص آہنگ ابھرتا ہے"[1]

مفتی تبسم کی یہ کتاب ان کے فنکارانہ عظمت کو روشناس کرانے اور ان کا یہی انداز اردو تنقید میں ان کو امتیاز اور انفرادیت عطا کرتا ہے۔

ڈاکٹر ناصرہ بیگم اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کرتی ہیں:

"اور بالکل کو پیش نظر رکھتے ہوئے
اس کتاب کا ایک غیر تجریدی
تمثیلی علامات والا نام" لفظوں
سے آگے" صرف اقبال کے

---

[1] - ہرومیر مفتی تبسم۔ "لفظوں سے آگے" مشتاق احمد کی کہانی "مردم گزیدہ"
ص - ۱۹۶

لالہ صحرا سے عوض سعید کی فہرنی
اردو کے آخری قاری کی فہم
سے زیادہ قریب ہو سکے گا۔
اُردو کے علمی اور ادبی کتابوں
میں اشاریہ کو اب شامل ہونا
چاہیے۔ اس قاری کو جو کتاب
سے بار بار استفادہ کرنا چاہتا ہے
سہولت ہوتی ہے۔ اکاڈیمیوں
اور دیگر مالی امداد فراہم
کرنے والے اداروں کو چاہیے کہ وہ
مصنفوں کو اس کا پابند بنائیں۔
اس مجموعہ میں جن ادیبوں کی
تخلیقات شامل ہیں ان ادیبوں
کو سمجھنے کے لیے بالخصوص اور
تجریدی نظم و نثر کی بنیاد تک
پہنچنے کے لیے بالعموم مغنی تبسم کی
کتاب "لفظوں سے آگے" پڑھنا
انتہائی مفید ثابت ہوگا"[1]

---

[1] - ڈاکٹر نامرہ بیگم - "لفظوں سے آگے" مشمولہ - نذر مغنی تبسم" ص - ۱۳۳

تنقیدی مضامین جو مختلف ادبی جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان کی فہرست حسب ذیل ہیں۔

	مضمون	جریدہ	سن اشاعت
1.	اُردو زبان کا رسم خط	"صبا"	۱۹۵۶ء مئی
2.	ڈاکٹر احمد حسین مائل	کاروانِ سخن	۱۹۵۶ء
3.	مائل کی شاعری	کاروانِ سخن	۱۹۵۶ء
4.	منٹو اور ترقی پسند ادب	صبا	۱۹۵۷ء
5.	کینڈا زبان کے ایک عظیم شاعر ۔ مادنا	"آج کل" دہلی	۱۹۵۷ء
6.	شاذ تمکنت	The Nawras. Hyderabad.	۱۹۵۸ء
7.	اُردو شاعری پر مغربی ادب کا اثر	شب تاب	۱۹۵۹ء
8.	"ابوالقاسمی لاہوٹی"	"شاہراہ" دہلی	۱۹۵۹ء
9.	"اکرم جاوید بحیثیت افسانہ نگار"	The Shaer monthly Bombay	۱۹۶۰ء
10.	ڈاکٹر جان گلکرسٹ اور اس کے کارنامے	شب تاب، حیدرآباد	۱۹۶۰ء
11.	کلاسکیت	سب رس، حیدرآباد	ستمبر ۱۹۶۰ء
12.	اردو کالج	مرقع اُردو	۱۹۶۱ء
13.	ماضی کا مستقبل	قلم کار	مارچ ۱۹۶۳
14.	"اردو شاعری اور قومی یکجہتی"	صبا	جولائی، اگست ۱۹۶۳

15۔	رابرٹ فراسٹ	صبا	مئی ۱۹۶۷ء
16۔	"فانی کی شاعری میں استعجادیت"	مزاج	جون ۱۹۶۷ء
17۔	آمنہ ابوالحسن کا نیا ناول مقالہ	شاعر	مئی، جون ۱۹۶۹ء
18۔	غالب کا شعورِ زیست	"صبا" کا غالب نمبر	اگست ۱۹۶۹ء
19۔	فانی حقیقت اور آئینہ	کتاب	جون ۱۹۷۱ء
20۔	"جدید اردو شاعری کا اسلوب"	ماہر	اکتوبر ۱۹۷۱ء
21۔	اردو تنقید گذشتہ ربع صدی میں"	"تحریک" نئی دہلی	جولائی، اگست، ستمبر، اکتوبر ۱۹۷۸ء
22۔	نیا دور، ن، م، راشد نمبر	مبصر	۱۹۸۰ء
23۔	تنقید و تحریک	مبصر	۱۹۸۰ء
24۔	فکر غالب کے چند گوشے	شاہین	۱۹۸۰-۱۹۸۱ء
25۔	"غزلیہ شاعری میں سراج کی صناعی"	امکان	۱۹۸۶ء
26۔	"وجہی کا شعورِ زینت"	سب رس، حیدرآباد	مارچ ۱۹۸۷ء
27۔	"مخدوم کی انفرادیت"	طرحی مشاعرہ	۲۱/فبروری ۱۹۸۸ء
28۔	"مظفر مجاز اور اُن کی شاعری"		۱۳/اگست ۱۹۹۳ء
29۔	"ابوالکلام آزاد کی خدمات زبان و ادب"	تناظر (سہ ماہی)	جولائی ۱۹۹۸ء
30۔	Spot Review Channel Six		ستمبر ۲۰۰۰ء
31۔	اُردو کا ابتدائی زمانہ ادبی تہذیبی اور تاریخ کے پہلو	سب رس	ڈسمبر ۲۰۰۰ء

32۔ "ڈاکٹر عالم خوندمیری اور ان کی علمی و ادبی خدمات"	مضامینِ عالم خوندمیری	اردو اکیڈیمی آندھراپردیش حیدرآباد
33۔ "بانی۔ جدید اردو غزل کی ایک منفرد آواز"	معمار اردو غزل مرتبہ: پروفیسر قمر رئیس	اردو اکیڈمی، دہلی
34۔ جدید اردو غزل اور عوامی	(ڈاکٹر مغنی تبسم)	
35۔ پتھروں کا مغنی۔ ایک مطالعہ	"پونم"	حیدرآباد
36۔ جدید اردو غزل	معیار	
37۔ دکن کا ایک روشن دماغ حکمراں	غیر مطبوعہ مضمون	
38۔ "اردو شاعری میں پیروڈی"		
39۔ تراشیدہ۔ ایک مطالعہ	"پونم"	حیدرآباد
40۔ "Modernity in Urdu Poetry"		
41۔ "امیر خسرو کی غزلیہ شاعری کی غنائی ساخت"		
42۔ "Alam-my Teacher A Tribute"		
43۔ شمس الرحمٰن فاروقی کے مقالے "ابہام، روایت اور مناسبت" کے بارے میں چند کلمات۔	سوغات	

44۔ فراق گورکھپوری

45۔ حلقہ ارباب ذوق اور

اردو افسانہ

46۔ Lyrical Structure of Amir Khuzro's Ghazals By Mughni Tabassum.

47۔ فراق کا عشق

48۔ اردو شاعری اور اقبال

49۔ "جارج برنارڈ شاہ کے افکارِ جمالیہ"

50۔ "تھامس ہارڈی" ایک عظیم اور صاحب طرز ناول نگار

51۔ "مثنوی من لگن"

52۔ "The Deccani Ghazal"

53۔ ٹی۔ایس۔ایلیٹ T.S. Eliot

54۔ ن۔م۔راشد کے افکار و خیالات (ایک جائزہ)

55۔ سعید بن محمد

56- فیض احمد فیض

57- ترقی پسند شاعری اور عورت

58- اسد اللہ وجہتی

59- زور ایک شاعر

60- "دکنی زبان و ادب پر
تلگو کا اثر"

61- حیرت بدایوں

62- ہندوستانی کلاسیکی روایات
کی بازیافت

63- اردو غزل تحسین و تدریس

64- سودا کی غزل

ادبی صحافت

صحافت کا ایک رُخ ادبی صحافت بھی ہے جس کے تحت
وہ تمام ادبی رسالے آتے ہیں جو قاری کے ادبی ذوق کی تسکین کا باعث
بنتے ہیں ۔ عام طور پر ہر رسالے کا ایک منشور ہوتا ہے اس کو واضح طور پر
کہا جائے یا نہ کہا جائے بعض ادارے یا جماعتیں ایسے ہوتے ہیں جو اپنے
مقاصد کی تکمیل اور تبلیغ کے لیے رسالوں یا اخباروں کو استعمال کرتے ہیں.
اُن کی اپنی ایک پالیسی ہوتی ہے کچھ ایسی ہی صورتِ حال ادبی جرائد
کی بھی ہے لیکن بنیادی مقصد ادب کا فروغ ہوتا ہے ۔ ہر اخبار یا
رسالے میں اداریہ بھی ہوتا ہے جو اس رسالے یا اخبار کی بنیادی
پالیسی سے مطابقت رکھتا ہے ۔ اداریہ نہ صرف رائے عامہ کو متاثر
کرتا ہے بلکہ وہ عوامی مزاج بنانے میں بھی ساز گار ہوتا ہے .
ہر اخبار یا رسالے میں سید اقبال قادری کہتے ہیں کہ کسی بھی ادارے میں
مندرجہ ذیل عناصر ضروری سمجھے جاتے ہیں۔
اسلوب بیان کی پاکیزگی
نصب العین

استدلال

رائے عامہ پر اثر انداز ہونے کی قوت، اور
قارئین کو صحیح راہ دکھانے کی اہمیت

مغنی تبسم کے تحریر کردہ اداریوں پر نظر ڈالی جائے تو واضح طور پر محسوس ہوتا ہے کہ ان کے موضوعات خالصتاً ادب، ادبی تنقید اور ادبی تحریکات و رجحانات سے متعلق ہیں۔ ان کے اداریے نہ صرف اپنے قاری کو نئی ادبی صورتِ حال سے واقف کرواتے ہیں۔ بلکہ ساتھ ساتھ نئی راہوں سے روشناس بھی کراتے ہیں۔ ان کے تحریر کردہ اداریوں کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں جذباتیت نہیں ہوتی بلکہ ان کی سطح دانشورانہ ہوتی ہے اور اسی لیے ان کے اداریے بے حد متاثر کن ہوتے ہیں۔

شبستانِ ادب

مغنی تبسم جس وقت دارالعلوم ہائی اسکول میں زیرِ تعلیم تھے وہ اور ان کے ساتھی طالب علم ابوالمعظم زین العابدین، قطب الدین یوسف اور احمد سلطان شاداب نے مل کر ایک ادبی انجمن شبستانِ ادب کے نام سے قائم کی۔ اس انجمن کے ہفتہ وار جلسے بھی ہوا کرتے تھے اور اس کے تحت ایک رسالہ بھی شائع کیا گیا تھا اور اس کا نام بھی "شبستانِ ادب" ہی رکھا گیا تھا۔ جس میں حیدرآباد کے ادیبوں کے علاوہ ابھرتے ہوئے نوجوان قلم کاروں کی ہمت افزائی بھی کی جاتی رہی۔ یہ پہلا ادبی رسالہ ہے جس کی ادارت کے فرائض مغنی تبسم نے انجام دیے اگرچہ یہ رسالہ کچھ عرصہ کے بعد بند ہوگیا لیکن مغنی تبسم کی مدیرانہ صلاحیتوں کی تربیت میں اس رسالے کا بہت بڑا حصہ رہا ہے۔

یہ بات سب جانتے ہیں کہ رسالہ نکالنا کوئی معمولی

کام ہیں ہے۔ اس کے پس منظر میں کئی اور باتیں ہوتی ہیں جیسے مضامین اور دیگر مشمولات کا حصول، ایسے مشمولات کا انتخاب جو رسالے کی بنیادی پالیسی سے مطابقت رکھتے ہوں، مالیے کی فراہمی، جس میں خریداروں کو ہموار کرنا اور اشتہارات کے لیے دوڑ دھوپ کرنا بھی شامل ہے۔ پھر کتابت، تصحیح، طباعت اور اس کے بعد خریداروں کو تک پہنچانے کا انتظام کرنا۔ ان سارے مراحل سے مدیر کو گزرنا پڑتا ہے۔ مغنی تبسم ایک بہت ہی منظم اور سلجھے ہوئے مزاج کے انسان ہیں۔ شبستانِ ادب کے زمانے ہی سے ان میں وجود مدیرانہ صلاحیت ابھر کر سامنے آنے لگی ہیں۔ اور جیسے جیسے وقت آگے بڑھتا گیا مغنی تبسم کی صلاحیتیں روز افزوں ہونے لگیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ انھوں نے شعر و حکمت جیسے شہرہ آفاق مجلے کے ذریعے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوالیا۔

شعور

یہ ایک دوماہی رسالہ تھا جو ۱۹۵۴ء میں نکلا۔ سال میں اس رسالے کے صرف تین شمارے نکلے۔ اس رسالے کے ایڈیٹر یں۔ ای حسینی۔ بی۔ اے۔ ایل ایل۔ بی کا نام دیا گیا ہیں۔ مغنی تبسم ملازمت سے وابستہ تھے اس لیے انھوں نے اپنا نام "والا شان مکرم" رکھ کر اس نام سے انھوں نے کام کیا۔ ترتیب دینے والوں میں اخر جہاں شاہین جو مغنی تبسم کی اہلیہ ہیں اور والا شانِ مکرم جو خود مغنی تبسم ہیں کے نام شامل ہیں۔ سرور ڈنڈا مینجنگ ایڈیٹر تھے۔ پہلے شمارے کے لیے سب کو کام تفویض کیا گیا اور یہ طے کیا گیا کہ مضامین مغنی تبسم دیکھیں گے، افسانے عاتق شاہ اور شاعری تمر ساوی دیکھیں گے۔ اس شمارے کا دوتک یہ کام ٹھیک ہوا۔ لیکن

لیکن دوسرے شمارے میں دوسرے ساتھیوں نے نہ تو ساتھ دیا اور ہی مواد کے حصول میں کوئی تعاون کیا۔ مفتی تیتم نے خود اپنے طور پر مضمولات حاصل کیے اور خود کتابت کروائی اور طبع کروا کر شائع بھی کیا۔ چنانچہ تیسرے شمارے میں سرورڈنڈا کو بہ حیثیت آرٹسٹ مقرر کیا گیا اور اداں اللہ شریف کو مینجنگ ایڈیٹر کے لیے نام زد کیا گیا۔ عاتق شاہ اور تمر ساحری کے نام نکال دیئے گئے جب اخبار میں اطلاع دی گئی کہ تیرا پرچہ نکل چکا ہے تب ان لوگوں نے رسالہ "شعور" لے کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ ان کے نام نکال دیے گئے ہیں تو وہ حیرت زدہ رہ گئے۔ اس بات سے اندازہ ہوتا ہے کہ مفتی تیتم مصلحتوں کے قائل نہ تھے ان کے سامنے رسالے کا وقار رہتا۔ یہاں دوستی اور تعلقات کی کوئی اہمیت نہ تھی اداریہ خود تھا کہ مفتی تیتم رسالے کی بقا کے لیے سخت گیر اقدامات کریں۔ مفتی تیتم کے اس طریقہ کار سے وقتی طور پر ان احباب کو ناراضگی تو یقیناً ہوئی ہوگی لیکن اب انھیں اس بات کا احساس بھی ہوگیا کہ رسالے کی اشاعت کے لیے مکمل تعاون ضروری ہوتا ہے۔

دوسرے شمارے میں "نشستند و گفتند و برخاستند" کے عنوان سے اداریہ ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس کے بارے میں ہے اس انجمن کی کارکردگی پر اس اداریہ نے ایک سوالیہ نشان لگا دیا۔ اصل میں آزادی ہند کے بعد ترقی پسند مصنفین کی بھی انجمن کچھ سرد سی پڑھ گئی تھی۔ دوسرا شمارہ اپریل ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا ہے یعنی آزادی کے تقریباً ساڑھے چھ سات سال بعد سن ۱۹۵۲ء میں

بھیمڑی ترقی پسند مصنفین کی بو کانفرنس ہوئی وہ اس اعتبار سے
بہت زیادہ اہم ہے کہ ادیبوں کو یہ احساس ہونے لگا تھا کہ انجمن
کی کارکردگی نہ ہونے کے برابر ہوتی جا رہی ہے اور نظریاتی
اختلافات پیدا ہونے لگے ہیں۔ بھی میں بھیمڑی کانفرنس کے بعد
یہ توقع بندھ گئی تھی کہ انجمن کے حالات میں بہتری پیدا ہو گی اور

و تمام امن آزادی ساوات
اور جمہوریت کے خواہش مند
ادیب متحدہ و مشترکہ طور پر
اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو ایک
نئے اور بہتر سماج کے لیے وقف
کر دیں" [1]

لیکن سال بھر گذرنے کے بعد بھی توقعات پوری نہ ہوئی۔
۱۹۵۳ء میں جو اعلان نامہ جاری کیا گیا تھا وہ بھی توقعات
کو پورا کرنے میں ناکام ثابت ہوا تھا۔ علاوہ ازیں اس
اعلان نامہ میں بھی کئی خامیاں موجود تھیں۔ ان ہی ساری
چیزوں کی طرف مغنی تبسم نے اپنے اداریے میں توجہ دلائی۔
انجمن کی بے عملی یا کم عملی پر جس طرح سے اس مضمون میں
گرفت کی گئی ہے وہ آج بھی اتنی ہی اہم ہے۔ اردو
کا مسئلہ واقعی اس اداریے کے عنوان کے مصداق ہے
اعلان نامہ پر جو مغنی صاحب نے لکھا ہے اس کا یہ
اقتباس بہت اہم ہے

و بھیمڑی کانفرنس کے اعلان نامہ کے

---

[1] ۔ پروفیسر مغنی تبسم۔ "اداریہ" رسالہ شعور ص۔ ۴

برخلاف یہ توقع ہے کہ اس اعلان
نامہ کی بنیاد پر بہت سے ادیبوں کی
ذہنی ہمدردیاں حاصل کی جا سکتی ہیں
لیکن یہ اعلان نامہ ان کے مضبوط
اشتراکِ عمل کی ضمانت نہیں
دے سکتا۔ ہمارے تہذیبی
ورثہ میں کوئی چیز "خوبصورت"
اور "شاندار" ہے اور کون سی چیز
"فرسودہ" "بے جان" اور
"زوال پذیر" ہے اس کی وضاحت
ہونی چاہئے تھی۔ "انسان دوستی"
"زندگی بر یقین" "روشن مستقبل"
"پربہار زندگی" "وطن دوستی"
اور "عوام کے جائز اور صحیح تقاضے"
مبہم اصطلاحیں ہیں۔ ہندوستان
کے عوام کن سیاسی، سماجی اور
معاشی حالات میں زندگی بسر
کر رہے ہیں اور بین الاقوامی
کھنچاؤ سے پیدا شدہ حالات کا ان
کی زندگی پر کیا اثر پڑ رہا ہے۔ اس
کی وضاحت اعلان نامہ میں ضروری تھی۔
کانفرنس میں تنظیمی امور کے تعلق
سے کوئی ایسے ٹھوس اور بنیادی
فیصلے نہیں کئے گئے۔ جن پر فوری عمل

کر کے پچھلے تعطل کو دور کیا جا سکتا۔
اگر کسی وجہ سے اس وقت یہ ممکن
نہ تھا تو انتظامیہ کونسل کا فرض تھا
کہ وہ کانفرنس کے فوری بعد انجمن
کی زنگ آلودہ مشنری کو صاف کر کے
حرکت میں لانے کی کوشش کرتی۔ نئے
اعلان نامے میں اس کی تمام کوتاہیوں
سے قطع نظر) ادیبوں کے ایک متحدہ
محاذ کے امکانات ضرور موجود تھے لیکن
افسوس اس بات کا ہے کہ اس سے ذرہ
برابر بھی فائدہ نہیں اٹھایا گیا۔ تنظیمی
جمود کے باعث ادیبوں کو ساتھ لینا
تو درکنار پرانے ساتھی بھی رفتہ رفتہ
جدا ہوتے جا رہے ہیں" [1]

شعور کا تیسرا شمارہ ۱۹۵۴ء میں شائع ہوا تھا جس میں آج کی بات کے عنوان سے اداریے لکھتے ہوئے مغنی تبسم نے امریکی اجارہ داری اور میکارتھی ازم کے بارے میں اپنا ردِ عمل پیش کیا۔ میکارتھی ازم نے آزادیٔ فکر کے خلاف ایک ایسا حربہ تھا جس کو استعمال کر کے علم و ادب کے اہم اور بہترین خزانوں کو برباد کر دینے کی مہم چلائی گئی۔ یہ اداریہ اسی بات کی شہادت فراہم کرتا ہے۔ مغنی تبسم کی نظر عالمی سیاست کے ساتھ ساتھ ادب کی دنیا میں رونما ہونے والی تبدیلیوں پر بھی گہری تھی

---

[1] ۔ پروفیسر مغنی تبسم۔ "اداریہ" رسالہ شعور جلد ۱، شمارہ (۲) اپریل ۱۹۵۴ء۔ ص ۵، ۶

وہ عالمی تناظر میں ہونے والے احتجاج اور استحصال دونوں پر نظر رکھتے ہیں۔ ایک طرف سیکا رہتی ازم ہے تو دوسری طرف جولیس ایتھل روزن برگس ہاورڈ فاسٹ پال رابسن وغیرہ جو آزادیٔ فکر کے علم بردار فن کار ہیں۔ مغنی تبسم اس ٹکراؤ کو نہ صرف محسوس کرتے ہیں بلکہ وہ اردو دنیا سے بھی یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ ادیبوں اور شاعروں کو ان مسائل پر کھل کر خیالات کا اظہار کرنا چاہیے۔ یہاں ایک بات کی وضاحت ضروری ہے کہ "شعور" کا مزاج اور اس کا بنیادی کردار مارکسزم سے قریب اور استحصال کے خلاف آواز اٹھانا ہے۔ اگر مارکسزم سے صرفِ نظر کیا جائے تب بھی ایک بات طے ہے کہ جو مسائل اس ادارے میں اٹھائے گئے ہیں وہ ایسے ہیں جن سے عالمی انسانیت کو خطرہ لاحق ہے یہ درست ہے کہ اس زمانے میں مغنی تبسم مارکسزم سے بہت متاثر تھے۔ لیکن انھوں نے عالمی ادب میں رونما ہونے والی تبدیلیوں سے صرفِ نظر نہیں کیا۔ ادب و تنقید کے میدان میں رونما ہونے والے رجحانات پر بھی ان کی نظر تھی اور شاید یہی وجہ ہے کہ آہستہ آہستہ وہ جدیدیت کی طرف مائل ہوئے اور اردو والوں کو سب سے پہلی بار جدیدیت سے روشناس کرایا۔

صبا:

سلیمان اریب جیل سے رہا ہو کر آئے تو وہ اس وقت بے روزگار تھے۔ ڈاکٹر زور نے سب رس کی ادارت کا کام ان کے تفویض کیا لیکن چونکہ وہ تنخواہ یاب تھے

اسلئے ان کا نام سب رس پر بہ حیثیت مدیر شائع نہیں ہوتا تھا۔ وہ سب رس
میں ایک عرصہ تک کام کرتے رہے۔ پھر سلیمان اریب نے یہ تجویز
رکھی کہ عوامی مصنفین کا کوئی ترجمان رسالہ ہونا چاہیئے اور یہ کہ
خریداروں اور اشتہاروں کے ذریعہ رسالے کے اخراجات کی
بھائی کی جا سکتی ہے۔ اس طرح رسالہ 'صبا' کی داغ بیل
ڈالی گئی۔ اس کے لیے ایک مجلس مشاورت تشکیل دی گئی
جس میں حبیب الرحمٰن، ڈاکٹر طاہر علی خاں مسلم، رائے
چانکی پرشاد، ڈاکٹر حفیظ قتیل، عالم خوندمیری، دلاور
علی خاں اور رضیہ بیگم شامل تھے۔ صبا مختلف وجوہات
سے پابندی سے شائع نہیں ہو رہا تھا۔ مجلس مشاورت میں
ان سے جواب طلب کیا گیا تو انھوں نے کہا کہ ان پر کام کا
بہت بوجھ ہے خریدار بنانا، اشتہارات فراہم کرنا، خطوط کے
جواب دینا اور پھر ہر چہ مرتب کرنا، پرچے کی ترتیب کے لیے اگر معاونین
دیئے جائیں تو پرچہ پابندی کے ساتھ شائع ہو سکے گا چنانچہ
ایک مجلس ادارت تشکیل دی گئی جس میں سلیمان اریب،
حسینی شاہد اور مغنی تبسم شامل تھے۔ کچھ عرصہ تک مجلس ادارت
کام کرتی رہی لیکن سلیمان اریب کے لاابالی مزاج کی وجہ سے
حسینی شاہد اور مغنی تبسم زیادہ ساتھ نہ دے سکے اور علیحدگی
اختیار کرلی۔ لیکن سب رس سے مغنی تبسم کا تعاون برقرار رہا۔
چنانچہ بعض خاص شمارے جیسے قومی یکجہتی نمبر ۱۹۶۸ء کی
منتخب شاعری نمبر کو مغنی تبسم ہی نے ترتیب دیا۔ سلیمان اریب کی
وفات کے بعد ان کی بیگم رفیعہ اریب اور مغنی تبسم چاہتے تھے کہ
صبا کی اشاعت کا سلسلہ جاری رہے۔ اس کے لیے مالیہ فراہم
کرنے کی غرض سے نمبر میں عزیز متی اور دوسرے ادیبوں اور

شاعروں کی کوشش سے ایک مشاعرے کا انعقاد عمل میں آیا۔ اس مشاعرے کی آمدنی صبا کو دی گئی۔ بعد ازاں 'صبا' کا سلیمان ادیب نمبر شائع کیا گیا۔ اریب نمبر کے بعد ایک اور شمارہ نکل سکا۔ پھر صبا کی اشاعت کا سلسلہ بند ہو گیا۔

سب رس:

ڈاکٹر زور نے حیدرآباد میں ۱۹۲۹ء میں ادارۂ ادبیات اردو کی بنیاد ڈالی۔ انھوں نے اہلِ قلم احباب کی ایک نئی نسل کو تیار کر کے ایک عہد ساز کارنامہ انجام دیا اور اس ادارہ کے ذریعہ سینکڑوں قلم کاروں کی تربیت کی۔ مغنی تبسم نے بھی زور صاحب کے اس مشن کو نہ صرف آگے بڑھایا بلکہ ادارۂ کو تحریک کا درجہ دے دیا۔ ادارۂ ادبیات اردو کی جانب سے ۱۹۳۸ء میں ایک رسالہ "سب رس" جاری کیا گیا تھا۔ سب رس کے مدیر کی حیثیت سے مغنی تبسم ۱۹۷۸ء سے اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

ابتداء میں اس کے ایڈیٹر صاحب زادہ میر محمد علی خاں میکش تھے لیکن دوسرے سال مجلس ادارت بنائی گئی جس میں صاحب زادہ میکش کے علاوہ خواجہ حمید الدین شاہد، سکینہ بیگم اور معین الدین احمد انصاری شامل تھے۔ معین الدین احمد انصاری صاحب بچوں کے مضامین کی نگرانی کرتے تھے اور ادبی و تنقیدی مضامین سکینہ بیگم کے ذمے تھے۔ خواجہ حمید الدین شاہد کی نگرانی میں یہ رسالہ مطبع ابراہیمیہ مشین پریس حیدرآباد سے طبع ہوتا تھا۔

"سب رس" حیدرآباد کا ایک بہت ہی اہم اور علمی رسالہ ہے

جو ابھی تک پابندی سے شائع ہو رہا ہے۔ اس رسالے میں اردو
زبان و ادب کے مختلف شعبوں اور پہلوؤں پر مضامین
شامل کیے جاتے ہیں۔ اور عموماً دکنی زبان و ادب پر عالمانہ
اور تحقیقی مضامین شائع ہوتے ہیں۔ اس رسالے کی ایک
خاص خوبی یہ بھی ہے کہ اس رسالے کے بیشتر لکھنے والے
حیدرآباد ہی کے ہوتے ہیں۔ کیونکہ اس رسالے کا بنیادی
مقصد دکن کے لکھنے والوں کو آگے بڑھانا ہے۔ مفتی تسبم نے
آج بھی اس روایت کو باقی رکھا اور ایسے ہی مضامین کو
زیادہ اہمیت دی گئی جو دکن سے متعلق ہیں۔ اس رسالے
کے اغراض و مقاصد اور پالیسی کی وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر
محی الدین قادری زور نے لکھا تھا۔

"سب رس کا سب سے بڑا مقصد یہی ہوگا
کہ وہ سب کے لئے ہو ـــــ سب رس
بچوں اور بوڑھوں اور عورتوں اور
مردوں سب کے لئے دلچسپی کا
باعث بن سکے۔ اسی لئے بچوں
اور طلبا کا حصہ بھی رکھا گیا ہے
جس میں نظمیں کہانیاں اور دلچسپ
مضمون ہوں گے جو یا تو بچوں
اور بچیوں اور مدرسوں کے طلبا و
طالبات ہی کے لکھے ہوئے ہوں گے یا
ان کے لئے خاص اہتمام سے لکھوائے
جائیں گے۔ اسی طرح حصہ نسواں
علحدہ تو ہو ہی لیا گیا مگر نسوانی

دلچسپیوں کا نام طور پر خیال رکھا
جائے گا اور ہر رسالہ کی ترتیب
میں صنف نازک کا کافی حصہ ہوگا
مضامین کے انتخاب میں بھی بڑی
وسیع النظری (کذا) ملحوظ
رہیگی ۔ افسانوں نظموں علمی
ادبی اور تنقیدی مضمون اور
اردو کی مطبوعات پر غیر جانبدارانہ
تنقیدوں کے سوا آرٹ اور
تصویر (سینما) پر بھی دلچسپ
معلومہ مضمون چھپتے رہیں گے نہ صرف
دکن بلکہ تمام اردو دنیا کے
اچھے اچھے شاعروں اور انشاپردازوں
کی نظمیں اور مضمون حاصل کرنے
اور چھاپنے کا التزام کیا گیا ہے [1]

اس رسالے کو ابتدا ہی سے دکن کے علاوہ پورے ہندوستان بلکہ بیرون ملک کے مشہور اہل قلم کاروں کا بھی تعاون حاصل رہا ۔ رسالہ سب رس ایک معیاری جریدہ ہے جس کے ذریعے دکنی زبان، دکنی ادب اور دکنی نظم و نثر کے بے شمار شاہ پارے منظر عام پر آئے ہیں ۔ اعلیٰ معیار کی وجہ سے سب رس کے اکثر و بیشتر مضامین نہ صرف ہندوستان کے معیاری جرائد بلکہ بیرون ہند بھی ڈائجسٹ کیے گئے ہیں ۔

---

[1] ۔ ڈاکٹر محی الدین زور ۔ رسالہ "سب رس" ماہ نامہ حیدرآباد ۔ جلد اول بابتہ جنوری ۱۹۳۸

سب رس کے مضامین میں تنقید و تبصرہ، سیر و سوانح، ترجمے، گوشے، ادب و سیاست، تاریخ و ثقافت کے اہم جواہر پارے شامل ہیں۔ دکنی زبان و لسان اور اس کی ساخت و پرداخت پر قیمتی مضامین سب رس کی زینت بن چکے ہیں۔ سب رس میں کسی کا مضمون شائع ہو جانا نہ صرف مضمون نگار کے لیے بلکہ مضمون کے معاونین اور ملک کی بڑی بڑی ہستیاں شامل ہیں۔ ان میں زیادہ تر مضامین باباے اردو مولوی عبدالحق، ڈاکٹر سید محی الدین زور، مولوی نصیر الدین ہاشمی، محمد اکبر الدین صدیقی، افسر صدیقی امروہوی، ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر مسعود حسین خاں، پروفیسر سید محمد صاحب، پروفیسر عبدالقادر سروری، خواجہ حمید الدین شاہد، سید محمد اعظم، میر سخاوت مرزا، ڈاکٹر حفیظ قتیل، میر سعادت علی خاں رضوی، ڈاکٹر سیدہ جعفر، ڈاکٹر حنیف شاہد، پروفیسر عبدالمجید صدیقی، ڈاکٹر نذیر احمد، ڈاکٹر محمد حفیظ سید، سید مبارز الدین رفعت، ڈاکٹر غلام عمر خاں، ڈاکٹر حمیرہ جلیلی، ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ، گوپی چند نارنگ، خلیق انجم، حکیم سید شمس اللہ قادری، ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی، ڈاکٹر غلام یزدانی، ڈاکٹر محمد چراغ علی، ڈاکٹر محمد علی اثر، ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال، ڈاکٹر تمیم تولک، ڈاکٹر رشید یوسوی، ڈاکٹر ضمیدہ بیگم، ڈاکٹر محمد افضل الدین اقبال، ڈاکٹر محمد ہاشم علی، وقار خلیل، عبدالجبار خاں صوفی ملکاپوری، محمد سردار علی، محمد مرتضیٰ، پروفیسر ہارون خاں شیروانی، علی اصغر بلگرامی، سید علی بلگرامی، زینت ساجدہ، سید ہمایوں مرزا، ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ

نیوم صادق وغیرہ کے ہیں۔

اردو ادب میں اردو رسائل کی تاریخ اس اعتبار سے بھی المناک رہی ہے کہ بہت اچھے رسائل نے بھی ابتدا میں ہی دم توڑ دیا۔ لیکن سب رس گذشتہ (۴۵) برسوں سے برابر شائع ہو رہا ہے۔ اس رسالے نے کئی اہم خاص نمبر بھی شائع کئے جن کے نام حسب ذیل ہیں۔

محرم نمبر مارچ ۱۹۳۸ء، اقبال نمبر جون ۱۹۳۸ء، ایجوکیشنل کانفرنس نمبر اگست ۱۹۳۸ء، دکن نمبر جنوری ۱۹۳۹ء، اردو نمبر جنوری ۱۹۴۰ء، ریڈیو نمبر جنوری ۱۹۴۱ء، جنگ نمبر فروری ۱۹۴۲ء، سالار نمبر مئی ۱۹۴۲ء، اردو کانفرنس نمبر فروری، اپریل ۱۹۴۴ء، ترقی پسند ادب نمبر جولائی ۱۹۴۴ء سے سارے نمبر وہ ہیں جن کی ترتیب و تدوین میں خواجہ حمیدالدین شاہد اور ڈاکٹر زور کا دخل تھا۔ مفتی جسم نے ادارت کی ذمہ داری سنبھالنے کے بعد درجہ ذیل اہم نمبر شائع ہوئے۔ سلیمان اریب نمبر ستمبر ۱۹۸۰ء" گولڈن جوبلی تقاریب ادارہ ادبیات اردو مارچ ۱۹۸۲ء تا جنوری ۱۹۸۳ء" عابد علی خاں نمبر جنوری فروری مارچ ۱۹۹۳ء خصوصی اشاعت نام وران جامعہ عثمانیہ رفقا ڈاکٹر زور نمبر اکتوبر ۱۹۹۳ء" دکنی کلچر نمبر اپریل ۱۹۹۶ء" ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور نمبر نومبر، دسمبر ۱۹۹۶ء" محبوب حسین جگر نمبر مارچ ۱۹۹۸ء" تہنیت اشاد بیگم زور نمبر نومبر ۱۹۹۸ء" یوم سلطان محمد علی قطب شاہ نمبر اپریل ۲۰۰۱ء" خواجہ حمیدالدین شاہد نمبر دسمبر ۲۰۰۱ء

سن ۱۹۸۰ء کے اداریہ میں مغنی تبسم نے ترقی اُردو بورڈ کی کارکردگی کا جائزہ لے کر اس بات کی طرف توجہ دلائی کہ وہ اُردو کے فروغ کے معاملات میں حکومتِ ہند کو مشورہ دیں اور گجرال کمیٹی کے سفارشات کو روبہ عمل لانے کے لیے حکومت کو متوجہ کریں۔ مئی سن ۱۹۸۰ء کے اداریہ میں مغنی تبسم عجلت میں منعقد کیے جانے والے سمیناروں اور کانفرنس پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے سمینار کی تیاری کے اصولوں کی نشاندہی کی۔

جنوری ۱۹۸۸ء کے اداریے میں انھوں نے نئے سال کی مبارک باد کے ساتھ اس بات کی طرف توجہ دلائی کہ زندگی سے حساب طلب کرنے سے کہیں زیادہ افضل یہ ہے کہ ہم اپنی زندگی کے ساتھ اپنا حساب پیش کریں وہ لکھتے ہیں ہر آنے والا سال ہم کو مکافاتِ عمل کی دعوت دیتا ہے ہر فرد کی ذمہ داری کا نقطہ آغاز اس کی اپنی ذات ہوتی ہے پھر یہ نقطہ دائروں کی شکل میں پھیلتا اور وسیع ہوتا ہوا خاندان، قوم، اور عالم کائنات کی پنہائیوں کو اپنی آغوش میں سمیٹ لیتا ہے۔ ذات کے اظہار اور ذات کی سمتِ حرکت کا وسیلہ زبان ہے اس وسیلے سے فرد کی شناخت بنتی ہے اور کلچر سے اُس کا رشتہ استوار ہوتا ہے اگر یہ وسیلہ ختم ہو جائے تو ہماری شخصیت اور کلچر کا کیا انجام ہوگا ہم اردو والوں کے لیے یہ لمحۂ فکر بھی مہیا کرتا ہے۔

جنوری ۹۱ء کے اداریے میں بھی مغنی تبسم نے بڑے درد سے لکھا کہ ہم دکھے دل کے ساتھ سال ۱۹۹۱ء میں قدم رکھ رہے ہیں۔ نئے سال کے مبارک باد دیتے ہوئے جھجکتے ہیں۔

۱۹۹۰ء میں تہذیب اور انسانیت کو جو زخم لگائے ہیں وہ ابھی تک رِس رہے ہیں۔ ملک بھر میں مذہب کی آڑ لے کر سیاسی اور معاشی مفادات کے لیے بھیانک فسادات کرائے گئے شہر حیدرآباد بھی جو فرقہ وارانہ ہم آہنگی

کے لیے شہرت رکھتا تھا اس آگ کی لپیٹ میں آ گیا۔ مغنی تبسم کے اس اداریے سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اُن کے دل پر حیدرآباد اور ہندوستان بھر میں پھیلی ہوئی فرقہ وارانہ کشیدگی کا کتنا گہرا اثر ہے جامعہ عثمانیہ کی پلاٹینم جوبلی کے موقع پر اگست ۱۹۹۳ میں شائع شدہ اداریے میں مغنی تبسم نے جامعہ عثمانیہ کی خدمات پر رائے دیتے ہوئے لکھا کہ جامعہ عثمانیہ کے اربابِ مجاز پلاٹینم جوبلی تقاریب میں اردو کو بھی ملحوظِ خاطر رکھیں انھوں نے ایک تجویز یہ پیش کی کہ نادرانہ جامعہ عثمانیہ کے عنوان سے ایک کتاب مرتب ہونی چاہیے۔ اگرچہ اس تجویز نے اربابِ جامعہ عثمانیہ پر کوئی اثر نہیں ڈالا لیکن خود مغنی تبسم نے سب رس کے ذریعہ فرزندانِ جامعہ عثمانیہ پر مضامین لکھوانے جو اگلے شماروں میں شائع ہوئے۔ جون ۱۹۹۴ء میں کے اداریہ میں مغنی تبسم نے اردو تعلیم کے مناسب بندوبست اور ابتدائی اردو تعلیم کے ضمن میں عابد علی خاں ایجوکیشنل ٹرسٹ کی خدمات کا ذکر کیا۔

جولائی اگست ۱۹۵۶ء کے سال شمارے میں انھوں نے ترقی پسند تحریک کی موجودہ صورت حال پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھا کہ ترقی پسند تحریک نے نہ صرف ادیبوں شاعروں بلکہ تمام قارئین کی ذہنی تربیت کی تحریک کے بعد جدیدیت نے بھی دانشوری کی روایت قائم کی تھی لیکن بعد میں وہ بھی چند کاشبوں کی اسیر ہو کر رہ گئی۔

بڑے ہی کرب سے انھوں نے لکھا کہ آج ساری دنیا میں جمہوری قبا پہن کر دیو استبداد رقص کر رہا ہے ہر طرف دہشت اور درندگی کا راج ہے انھوں نے ادیبوں کو اس بات کی طرف توجہ دلائی کہ ادیب کو یہ آزادی ہے کہ وہ جو محسوس کرتا ہے وہ ضبطِ تحریر میں لائے اور

اپنے ضمیر کی آواز پر توجہ دے اٹھوں نے انجمن ترقی پسند مصنفین کو مشورہ دیا کہ ماضی کی طرح انفرادی طور پر ادیبوں اور شاعروں کے محاسبہ سے گریز کر کے ایک ذہنی فضا پیدا کرے۔

اپریل، مئی، جون ۱۹۹۵ کے اداریے میں انھوں نے فنونِ لطیفہ اور کھیل پر بات کرتے ہوئے اس بات کی طرف توجہ دلائی کہ شاعری میں محض لفظوں کی بازی گری اور شاعری میں مشکل زمینوں میں طبع آزمائی دور از کار تشبیہوں کا استعمال محاورہ بندی اور صناعی کو مخصوص بالذات بنانے کے رجحان کی روک تھام کرنا ضروری ہے۔

جولائی ۱۹۹۶ء کے اداریے میں منی تبسم نے اردو تنقید کے بارے میں قارئین کو متوجہ کیا کہ لفظ زبان کی اکائی نہیں ہوتا اور کلام میں اشاروں علامتوں و تمثیل کی شان دہی سے کچھ حاصل نہ ہو لیکن انھیں نظر انداز کر کے صرف متن کو مقصود تنقید بنانا گمراہ کن رویہ ہے انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ شعر کی تحسین کے لیے عروض، بلاغت، علم البدیع علم ناگزیر ہے۔

اگست ۱۹۹۶ کا اداریہ بھی اردو تنقید سے متعلق اظہار خیال ملتا ہے انھوں نے ادب برائے ادب کو ایک بے ایمانی طرفہ اور ادب برائے زندگی کے نعرے کو گمراہ کن قرار دیا، وہ کہتے ہیں کہ ادب خود زندگی ہوتا ہے جسے ادیب تخلیق کرتا ہے انھوں نے بتایا کہ قاری یا نقاد ادب پارے کو جو معنی دیتا ہے اور جو تشریح کرتا ہے وہ ادیب کو تحسین کے قید میں لے آتے ہیں اور اس کا حسن محدود ہو جاتا ہے۔

اپریل 1999ء کے اداریے میں منی تبسم نے اردو رسم الخط پر اظہار خیال کرتے ہوئے رومن یا ناگری رسم الخط کا مسئلہ اٹھایا۔

انھوں نے موجودہ کمپیوٹر کے دور میں رومن اردو کی اہمیت اور افادیت بتاتے ہوئے کہ mail وغیرہ کے لیے رومن اردو کا استعمال مفید ہے مئی سن ۱۹۹۹ء میں انھوں نے متن کے مطالعے اور ادب فہمی کے ضمن میں ثقافتی مطالعے پر زور دیا۔ جنوری ۲۰۰۰ء کا اداریہ نئے سال کی رسمی مبارک باد کے ساتھ اردو والوں کو اپنے گریبان میں جھانکنے کے لیے مجبور کرتا ہے اردو تعلیم کے تعلق سے انھوں نے بالکل صحیح لکھا کہ اردو والے اپنے بچوں کو اردو سکھانا نہیں چاہتے اپنی مرضی سے اردو پڑھنے والے بہت کم ہے اور صرف نااہل ہی اردو کی طرف آتے ہیں ۔ ان کا یہ کہنا بھی حرف بہ حرف صحیح ہے کہ ابتدائی جماعت سے لے کر پی ۔ ایچ ڈی کی سطح تک اردو طلبا یہ چاہتے ہیں کہ محنت کے بغیر امتحان کامیاب کرے۔ اور آسانی سے انھیں سند مل جائے امتحان میں نقل کریں گے اپنے اساتذہ کو شریک جرم بنا کر کسی آسان موضوع پر مقالہ لکھ کر یا لکھوا کر ایم ۔ فل اور ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں بٹوریں گے یہی نام نہاد اسکالرس لکچرر ریڈیر اور پروفیسر بن کر اردو کا بیڑہ غرق کر رہے ہیں ۔

ادب کا معاملہ یہ ہے کہ علمی مضامین اور علمی (غیر مذہبی کتابوں) کا فقدان ہے شاعری کا حال ناقابل بیان ہے اردو کے بعض ادارے صرف کاغذ پر وجود رکھتے ہیں لیکن عالمی اور کل ہند کانفرنس اور سمینار منعقد کرتے ہیں حکومت سے امداد لیتے ہیں اس سے گھر بناتے ہیں کار خریدتے ہیں گھر کا خرچ چلاتے ہیں اور ٹیلی فون کی بل ادا کرتے ہیں ۔ انھوں نے نئے سال کا خیر مقدم شکستہ آرزؤں اور امید موہوم کے ساتھ کرتے ہوئے اردو والوں سے درخواست کی کہ وہ اپنے گریباں میں منہ ڈالے اگر وہ گریباں رکھتے ہیں ۔

اوپر کی سطروں میں صرف چند اداریوں کا ذکر کیا گیا
ہیں سے محسوس ہوتا ہے کہ مغنی تبسم کے دل پر اردو والوں کی
سرد مہری بے التفاتی اور اردو کے ساتھ عدم توجہی نے مسائل کو کہاں
سے کہاں پہنچا دیا ہے۔ کاش اردو والے مغنی تبسم کے ان اداریوں
کو غور سے پڑھیں اور ان میں پوشیدہ پیام کو اپنی زندگی کا
مقصد بنالیں۔

سب رس کے اداریوں میں اس بات کا بھی خیال رکھا گیا کہ
اہم وفیات کا تذکرہ کرتے ہوئے متوفی کی خدمات کا بھی اجمالی
ذکر کر دیا جائے اور اس طرح سب رس کے اداریے مختصر سوانحی
مواد کے علاوہ مرحوم کی خدمات کا بھی مختصر ترین لفظوں میں
جائزہ ہے۔

رسالوں کے اداریوں میں یہ بھی خیال رکھا جاتا ہے کہ
زیر نظر شمارے کے مشمولات کے بارے میں بتا دیا جائے مغنی تبسم
نے سب رس میں شائع ہونے والے مقالات موضوعات اور
مسائل کی طرف بھی اجمالاً متوجہ کیا۔ علاوہ ازیں چونکہ سب رس
ادارہ ادبیات اردو ہی کا ایک حصہ ہے اس لیے اس میں
ادارے کے سرگرمیوں وغیرہ پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

مغنی تبسم ادارۂ شعر و حکمت کی بنیاد ڈالی۔ جس کے ایڈیٹر اختر جہاں متاہین، نائب صدر شہریار ہیں۔ ۱۹۷۰ء میں رسالہ شعر و حکمت کا اجرا عمل میں آیا۔ اس رسالے کے تین ادوار میں پہلا دور ۱۹۷۰ء سے ۱۹۷۵ء تک ہے اس دوران شعر و حکمت کے جملے (۷) رسالے شائع ہوئے ابتداء میں یہ رسالہ شاعری کی تنقید کے لیے مخصوص تھا لیکن بعد میں افسانے بھی شائع ہونے لگے۔ جدیدیت کے فروغ کے لیے اس رسالے نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس رسالے کو ہندوستان کے علاوہ بیرونِ ملک کے تمام نئے دیکھنے والوں کا تعاون حاصل تھا۔ ہندوستان و پاکستان کے بہت سے ایسے ادیب اور شعرا جنھوں نے بعد میں اردو ادب میں شہرت حاصل کی ان کو متعارف کروانے میں شعر و حکمت کا بڑا دخل رہا ہے۔ مغنی تبسم خود جدیدیت کے علم دار ہیں اور چاہتے ہیں کہ ادب میں بھی نئے نئے نظریات کو پیش کیا جائے۔ تاکہ وہ دوسری زبانوں کا مقابلہ کر سکے۔ اور جدیدیت کے بارے میں سب سے پہلے بولنے والے یا اس کو روشناس کرنے والے بھی مغنی تبسم ہی ہیں۔ یہ ایک بہت بڑا کام ہے۔ مغنی تبسم نے جب اس کا بیڑہ اٹھایا تو ایک ایک کر کے سب ان کے پیچھے آنے لگے۔ انھوں نے جدیدیت کے آغاز سے پہلے ہی اس کی پیش گوئی کی تھی۔ مغنی تبسم دورِ اول کے پہلے شمارے کے ابتدائیہ میں لکھتے ہیں۔

"شعر و حکمت جدید شاعروں نقادوں اور دانشوروں کے اظہار اور نئی شاعری یا تنقید یا فکر سے دلچسپی رکھنے والے قارئین کے مطالعہ کے لئے شائع کیا

جا رہا ہے"[1]

شعر و حکمت کے دورِ اوّل کے پہلے شمارے کا اداریہ مغنی تبسم نے لکھا ہے جس کا عنوان "لفظوں سے آگے" ہے۔ یہ ایک تنقیدی مضمون ہے اس اداریہ کا آغاز انھوں نے ایلوئیر کے اس قول سے کیا ہے۔

"تم اپنے باپ کی لاش کو ہر جگہ گھسیٹتے نہیں پھر سکتے"[2]

اسٹالن لینن کے مضمون "پارٹی کی تنظیم اور پارٹی کے ادب" کے متعلق مغنی تبسم لکھتے ہیں۔

"اسٹالن لینن کے مضمون "پارٹی کی تنظیم اور پارٹی کے ادب کی گمراہ کن تاویل کے ذریعے اپنی پالیسی کا جواز مہیا کرنے کی کوشش کی جب کہ لینن کا خود منشا یہ نہیں تھا کہ اس مضمون کا اطلاق فنونِ لطیفہ پر کیا جائے۔ پھر کچھ ایسی رو چلی کہ اشتراکی حقیقت نگاری کے علمبرداروں نے فن اور پروپگنڈے کے فن کو بالائے طاق رکھ دیا۔ انھوں نے جو فارمولا وضع کیا تھا وہ جان برگر کے الفاظ میں کچھ اس طرح کا تھا کہ پہلے خالص نظریاتی ادعا Dogma کے مطابق ایک مصنوعی یا فرضی واقعے کی تخلیق کرو پھر اس میں

---

[1] ۔ شعر و حکمت۔ دورِ اول۔ شمارہ (۱) ص ۱۲

[2] ۔ شعر و حکمت۔ دورِ اول۔ شمارہ (۱) ص ۱۲

زیادہ سے زیادہ فطرت یعنی لزم کا
رنگ بھرو تاکہ یوں محسوس ہو کہ اسے
زندگی سے اخذ کیا گیا ہے اس طرح
فطرت ضمیر فطری اور جھوٹ کے لیے
"موقعۂ وار ذات پر عدم موجودگی کا علیہ"
بن جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اشتراکی حقیقت
نگاری کے نظریے کے تحت جس طرح کے
ادب کی تخلیق ہوئی اس کا زندگی کے
حقیقی تجربوں سے کوئی گہرا رشتہ نہیں تھا"[1]
آگے نئی شاعری کے متعلق مغنی تبسم لکھتے ہیں۔
"نئی ادب کا ایک وصف پبلک سماج اور
روایت سے مقاومت ہے۔ وہ اس
مذاق عام کی تسکین اور تشفی کی ذمہ داری
قبول نہیں کرتا جس کو بورژوا کلچر اور
اشتراکی سیاست نے بگاڑ دیا۔ ماحول
سے یہی عدم مطابقت فن کار میں اجنبیت
کا شدید احساس پیدا کرتی ہے۔ یہ احساس
کبھی اس کو محزون بناتا ہے اور کبھی وہ
خود کو ایسا سورما سمجھنے لگتا ہے جو پابہ
زنجیر ہے تمسخر بھی اس کے جذبۂ
مقاومت کے اظہار کی ایک صورت ہے۔

---

[1] ۔ پروفیسر مغنی تبسم۔ شعر و حکمت۔ اداریہ "لفظوں سے آگے"۔ شمارہ (۱) ص ۱۳

نئے ادیب کی روایت سے برگشتگی،
صاحب نظری کی دلیل ہے جو اس
کو دین بزرگان سے منحرف کرتی ہے۔
نسلوں کا اختلاف ہر دور میں رہا
ہے لیکن دو کلچروں کے درمیان اتنی
وسیع خلیج کبھی حائل نہیں ہوئی تھی۔
اس لیے موجودہ نہیں کو اپنے مختلف
اور جدید ہونے کا احساس بھی زیادہ
ہے"[1]

نئے ادب اور پرانے ادب کا واضح اختلاف انھوں نے زبان کے استعمال میں دکھایا ہے۔ اور یہ اختلاف اس لیے ہے کہ دونوں کے تجربوں کی دنیا میں مختلف ہیں۔ کہتے ہیں نئی نسل پرانی نسل کے خلاف خود کو نمایاں اور ممتاز کرنے کے لیے ایک خفیہ زبان وضع کر لیتی ہے۔ اور یہی خفیہ زبان جو نئی شاعری اور نئے ادب کا محاورہ ہے ایک حد تک عوام اور تخلیق کار کے درمیان مقاومت پیدا کرنے کی ذمہ دار ہے۔ دوسرے شمارے میں اداریے کے بجائے پہلے شمارے کے بارے میں مشاہیر ادب کے خطوط کے اقتباس شامل کیے گئے ہیں۔ شمارہ تین ن۔م۔ راشد نمبر ہے اس کا اداریہ ممتاز حسین نے لکھا ہے۔ ممتاز حسین نے ن۔م۔ راشد اور میراجی دونوں ہی جدید شاعری کے علمبردار ہیں لیکن دونوں نے جدید شاعری کو اپنے انداز سے متاثر کیا ہے۔ لیکن جہاں تک فلسفہ فن کا تعلق ہے دونوں ہم

---

[1] شعر و حکمت۔ اداریہ" لفظوں سے آگے" شمارہ (۱) صفحہ ۱۲۔

خیال معلوم ہوتے ہیں۔ مفتی تبسم کا یہی احساس اس مجموعے کی ترتیب کا محرک بنا۔ اور ان کی یہ تالیف یقیناً راشد شناسی میں معاون ہو سکتی ہے۔ اس مجموعے کے لیے انھوں نے جدید نقادوں سے مضامین لکھوائے ہیں۔ ان کے علاوہ چند منتخب مطبوعہ مضامین اور تبصرے بھی شامل کیے گئے ہیں۔ جو راشد آزر کی شاعری کے بعض اہم گوشوں پر روشنی ڈالتے ہیں۔ راشد کی چند نظموں کے تجربے جو میراجی نے لکھے تھے یہ نظمیں "ماورا" میں شامل ہیں ان کے علاوہ تین نئی نظموں پر بھی تجزیاتی مضامین لکھوائے گئے ہیں۔ چند تاثرات اور غیر مطبوعہ نظمیں بھی اس میں شامل کی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ "افادات راشد" کے تحت ن۔م راشد کی تحریر اور تقریر کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ جس سے زبان و ادب کے بعض اہم مسائل پر راشد کے خیالات اور ان کے نظریۂ فن سے آگاہی ہوتی ہے۔

مفتی تبسم لکھتے ہیں۔

"ترجموں کی راہ سے بھی راشد نے ادب اور زبان کی خدمت کی ہے ادھر انھوں نے فارسی کے جدید شاعروں کی متعدد نظموں کے ترجمے کیے ہیں۔ ان میں چند ترجمے جدید فارسی شاعری پر راشد کے تعاون مضمون کے ساتھ دیئے جا رہے ہیں۔ تاکہ راشد کی ادبی سرگرمیوں کا یہ پہلو بھی نظروں کے سامنے رہے"[1]

---

[1] پروفیسر مفتی تبسم۔ شعر و حکمت۔ ن۔م۔ راشد نمبر۔ حروفِ آغاز۔ ۸

شمارہ (۴) میں بھی اداریہ نہیں ہے۔ شمارہ (۵) میں شہریار نے "کہیں ہم عادتاً تو شعر نہیں کہتے" کے عنوان سے اداریہ لکھا ہے۔ شمارہ (۶،۷) میں بھی شہریار نے "ادیب کا سماجی رول" کے عنوان کے تحت اداریہ لکھا ہے۔ اس کے بعد شعر و حکمت نکلنا بند ہوگیا۔ مالی وسائل کی کمی کے باعث یہ رسالہ کچھ عرصہ تک بند رہا۔ شعر و حکمت کے بند ہونے سے جدیدیت میں ٹھہراؤ سا آگیا تھا۔ اور ادبی حلقے میں بھی لوگ اس کی شدت سے کمی محسوس کرنے لگے تھے۔ گوپی چند نارنگ چاہتے تھے کہ یہ رسالہ کسی طرح دوبارہ جاری ہوجائے۔ اور وہ اس کے تعاون کے لیے بھی تیار تھے اور وعدہ کیا تھا وہ ان کتابوں کی کتابت کروا کر ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس سے چھپوا کر ڈسٹریبیوٹ کروائینگے۔ مگر ہوا یہ کہ ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاوس کے Sole agent نے انھیں دھوکہ دیا۔ اس کتابوں کو چھاپنے کے بعد پیسے خود ہی رکھ لیے۔ انھیں نہیں دیئے۔ جس کی وجہ سے ادارہ کو کافی نقصان اٹھانا پڑا۔ اس بار اس کا دور ۱۹۸۹ء سے ۱۹۹۰ء تک رہا۔ اس دفعہ شفیق فاطمہ شعریٰ اور علی ظہیر کو بہ حیثیت معاون شریک کیا گیا تھا۔ اس طرح Sole agent کے ذریعہ دورِ دوم میں صرف دو رسالے ہی شائع ہو سکے۔

دورِ دوم کتاب ایک کا اداریہ مغنی تبسم نے حرف آغاز کے عنوان سے لکھا ہے۔ کہتے ہیں کہ کسی رسالہ کا اجرا یا تو کاروباری مقصد کے لیے عمل میں آتا ہے یا پھر عملی یا ادبی نقطۂ نظر سے دوسرے نظریے سے رسالے کو شائع کرنا گھاٹے کا سودا ہے۔ اس کے لیے ایک جنون اور عشق کی ضرورت ہوتی ہے۔ دورِ اوّل کی کتابوں کے پس منظر میں لکھتے ہیں:

"گذشتہ دس برسوں میں ادب دوست قاری شعر و حکمت کو بھولے نہیں تھے اس کی کمی شدت سے محسوس کر رہے تھے"[1]

دراصل مغنی تبسم کا مقصد قارئین کو نہ صرف اندرون بلکہ بیرون ملک کی زبانوں اور تحریکات سے روشناس کرانا ہوتا ہے۔ انھوں نے اس رسالے میں پیش رس کے عنوان سے بھی میراجی پر ایک تعارفی نوٹ تحریر کیا ہے۔ انھوں نے اس گوشہ کے لیے میراجی کی وہ تحریریں حاصل کیں جو ان کے بھائیوں کامی اور اختر الایمان کے پاس تھیں۔ ان تحریروں میں میراجی کے خطوط، منظومات اور آپ بیتی شامل ہیں اور کچھ نایاب تصویریں بھی پیش کی گئی ہیں ہر چند کہ یہ گوشہ مختصر ہے لیکن بہت قابل قدر ہے۔

اس کے بعد انھوں نے مزید شعر و حکمت شائع کرنا بند کر دیا۔ مغنی تبسم دھن کے پکے آدمی ہیں۔ اگر ان کے ذہن میں کوئی بات آتی ہے تو اسے پایۂ تکمیل تک پہنچا کر ہی دم لیتے ہیں۔ دوسری مرتبہ شعر و حکمت کے بند ہونے کے بعد انھوں نے محمود ایاز کو سوغات کے لیے آمادہ کیا۔ یہ رسالہ بھی جدیدیت کے فروغ کا حامل تھا۔ رسالہ سوغات جو بنگلور سے شائع ہوتا تھا دوبارہ جاری ہوا۔ لیکن اس کا سارا کام مغنی تبسم ہی کرتے تھے۔ محمود ایاز کے انتقال کے بعد پھر یہ رسالہ بند ہو گیا۔ اس کے بعد مغنی تبسم اس پرچے کو جاری رکھنا چاہتے تھے۔ انھوں نے کئی مرتبہ خلیل مامون کو یاد دلایا

---

[1] پروفیسر مغنی تبسم۔ شعر و حکمت۔ دور دوم کتاب ایک ص ۱۷

اور جو لوگ بنگلور جا رہے تھے ان سے بھی کہلوا بھیجا۔ لیکن انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا تو مغنی تبسم نے تیسری مرتبہ شعر و حکمت کا احیا عمل میں لایا۔ اس طرح شعر و حکمت کا دور سوم ۲۰۰۰ء سے شروع ہوا اور جاری ہے۔ تیسرے دور کا پہلا رسالہ ۲۰۰۰ء میں شائع ہوا جس کی رسم اجرا عجبیٰ حسین نے کی۔ اس طرح دورِ سوم میں تین رسالے شائع ہو چکے ہیں اور چوتھا رسالہ زیرِ ترتیب ہے پہلا رسالہ جو جولائی ۲۰۰۰ء میں شائع ہوا اس کا اداریہ مغنی تبسم نے لکھا ہے

گذشتہ برسوں میں جس طرح شعر و حکمت نے اردو ادب میں نئے رجحانات کو فروغ دینے کے ساتھ ساتھ ادبی معیار کو ملحوظ رکھا ہے۔ وہ قابل قدر ہے۔ اس دوران بہت سی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ ادب اور آرٹ کی نئی تحریکیں، لسانیات اور فلسفے کی فکری تبدیلیاں، ٹکنالوجی اور سائنس کی حیرت انگیز ترقی نے نہ صرف کائنات کو متاثر کیا ہے بلکہ دنیا کا منظر ہی بدل ڈالا ہے۔ اور عجب نہیں کہ باشعور ادیب اور شاعر ان تبدیلیوں سے دوچار ہوتے ہوں۔ مغنی تبسم لکھتے ہیں:

"ادب میں جب بھی کوئی نئی تحریک ابھرتی ہے تو بہت سے شہرت کے بھوکے، خام کار نام نہاد ادیب اور شاعر اس تحریک کا علم اٹھا لیتے ہیں اور تحریک کے نقارچی اور ادبی صحافی ان کی قیادت سنبھال لیتے ہیں۔ ترقی پسند تحریک اور جدیدیت کے ساتھ یہی کچھ ہوا اور اب بہت سے نئے پرانے لکھنے والوں کو مابعد جدید کہلانے کی فکر

لاحق ہوگئی ہے۔ نقادوں نے ان کی
سہولت کے لیے چند فارمولے وضع کر دیے
ہیں اور اکثر نئے لکھنے والے جن کو تھوڑی
بہت تخلیقی صلاحیت ودیعت ہوئی ہے
اسے ان فارمولوں کو آزمانے میں ضائع
کر رہے ہیں۔ اس گروہ میں شاعروں
کی کثیر تعداد شامل ہے۔ فکشن کا حال
قدرے بہتر ہے لیکن سبھی اصناف نظم
ونثر میں برہنہ گفتاری کی گرم بازاری
ہے ہم نہیں چاہتے کہ اس رویے کی
ہمت افزائی کریں[1]۔ اے
کتاب دو دورِ سوم کے اداریے میں معنی تبسم نے واضح کیا ہے کہ
ساتویں دھائی کے ختم ہوتے ہوتے اردو کی جدیدیت ختم ہوگئی
آزاد خیال انسان دوستی کی جگہ تھیوری نے لے لی جس کی بنیادیں
جدید لسانی اور فلسفیانہ تصورات پر قائم ہے ساختیات پس ساختیات
ردِ تشکیل اور مابعد جدیدیت کے واسطے سے یہ معلوم ہوا کہ معنی کی
تلاش متن کے الفاظ کے بجائے ان کے رشتوں وقفوں اور
سیاق وسباق میں کی جانی چاہیئے۔ انھوں نے تنقید کے نئے اور
ابھرتے ہوئے دبستان جیسے قاری اساسی تنقید تانیثی تنقید
نئی تاریخیت نوآبادیاتی تنقید نو مارکسیت، ریڈیکلزم
لزبین اور گے Gay تنقید نئی تحلیل نفسی وغیرہ

---

[1] ۔ پروفیسر معنی تبسم۔ اطراف شعر وحکمت کتاب (۱) دورِ سوم صفحہ ۱۱

وغیرہ کی طرف بھی متوجہ کیا ۔ انھیں اس بات کا اندازہ ہے کہ ہر نئی چیز مسائل پیدا کرتی ہے وہ لکھتے ہیں:

"بعض گوشوں سے تھیوری اور جدید
تنقیدی تصورات کی مخالفت بھی
ہو رہی ہے ہر نیا نظریہ خوف ناک
ہوتا ہے دستارِ فضیلت کے چھن جانے
کا خوف، عاملوں کی صف سے نکال
کر جہلا کی صف میں ڈھکیل دیے جانے
کا خوف! یہ خوف ماضی کے سائبان
میں پناہ لینے کے لیے دوڑاتا ہے لیکن
ماضی کو صرف مڑ کر دیکھا جا سکتا ہے
ماضی میں لوٹا نہیں جا سکتا"[1]

دورِ سوم کی کتاب ۳ اور ۴ میں مغنی تبسم نے یہ واضح کیا ہے کہ مابعد جدیدیت وہ صورتِ حال ہے جو گذشتہ دو دہوں میں ماس میڈیا انفارمیشن ٹکنالوجی اور کنزیومر سوسائٹی کے شعبوں میں ہونے والی تبدیلیوں کا نتیجہ ہے وہ محسوس کرتے ہیں کہ امریکہ واحد بڑی سامراجی طاقت بن کر ابھرا ہے اور سوویٹ بلاک کے خاتمہ سے امریکی سامراج کو اور بھی چھوٹ مل گئی ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ گلوبلائزیشن کے خلاف اجتماعی جدوجہد کی ضرورت ہے کیوں کہ یہ تصور پچھڑے ہوئے طبقات کے لیے حد درجہ نقصان دہ ہے۔ اور اسی لیے وہ دنیا کو متوجہ کرتے ہیں کہ جدیدٹکنالوجی پر سے سامراج کی اجارہ داری کو ختم ہونا چاہیے۔

۱۔ پروفیسر مغنی تبسم اداریے، دورِ سوم کتاب ۲ صفحہ ۱۵

یہ واقعی ایک بہت بھیانک صورتِ حال ہے اور اگر مفتی تبسم کے ان پیش کیے گیے مسائل پر سنجیدگی سے غور کیا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ دنیا آہستہ آہستہ تباہی کی طرف بڑھ رہی ہے آج بلوبلائزیشن نے ایک طرف فاصلوں کو مٹا دیا ہے تو ساتھ ہی ساتھ ثقافتی اور تہذیبی تصورات کو بھی مسخ کر دیا ہے۔ آج تہذیب اور ثقافت کے پرزے بکھر رہے ہیں۔ انسان مادیت میں اس قدر گم ہے کہ اُسے زندگی کے دوسرے رُخ کی طرف توجہ دینے کی فرصت ہی نہیں ہے۔

مفتی تبسم کی دور بین نگاہوں نے اس خطرے کو دیکھا ہے اور وہ اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ وہ اپنے قاری کو ادیب دانشور شاعر و نقاد کے سامنے بدلتے ہوئے منظر نامے کی سچی تصویر سامنے رکھیں انھوں نے مستقبل کو اپنی تحریر کے آئینے میں پیش کر کے صرف اُردو والوں کو ہی نہیں بلکہ ساری عالم انسانیت پر بڑا ہی خوبصورت احسان کرنے کی سعی مشکور کی ہیں۔ غور کیا جائے تو مفتی تبسم کے یہ اداریے صرف اردو میں ہی نہیں بلکہ عالمی ادبی تنقید کے تناظر میں بھی اہم مقام کے حامل ہیں۔ انھوں نے اپنے کسی اداریے میں لکھا تھا کہ جو ادیب اور دانشور ادبی صحافت سے وابستہ ہیں انھیں اپنے قلم کے ذریعہ قوم کو جگانے کا کام کرنا چاہیئے مفتی تبسم نے یہی کیا ہے اپنی تحریروں کے ذریعے انھوں نے بعض ایسے نازک مسائل چھیڑ دیے ہیں جن کے بارے میں شاید ہی اردو کے کسی رسالے نے اتنی بے باکی سے لکھا ہو۔

سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ اُردو والے نہ صرف بے حس ہیں بلکہ انھوں نے آنے والے وقت کی چاپ نہ سننے کے لیے اپنے کان بند کر لیے ہیں۔ آنے والے زمانے کی پرچھائیوں کو نہ دیکھنے کے لیئے اپنی آنکھیں بند کر لیں ہیں۔ لیکن مفتی تبسم جیسے دیدہ ور اور بالغ نظر قلم کار اس کوشش میں لگے ہیں کہ

کانوں میں ٹھونسی ہوئی بے حسی کی روئی کو ہٹا دیا جائے۔ آنکھوں پر لگے جاہلیت کے Blinkers کو ہٹا کر انھیں صحیح راہ کے تعین میں مدد دی جائے۔ اور یہ یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ آنے والے کل میں مغنی تبسم کی آواز نخار خانہ میں طبوطی کی آواز ثابت نہیں ہو گی اس کی گونج ایک ذہن سے دوسرے ذہن ایک دل سے دوسرے دل تک سفر کرتی ہوئی آسمانوں کو اپنے احاطہ میں سمیٹ لے گی۔ کیوں کہ انسانیت کبھی مر نہیں سکتی۔ انسانیت کو ختم کرنے کی کتنی ہی کوشش کی جائے اُس کو کتنا ہی یم جان کرنے کی کوشش کی جائے اس کے اندر دھڑکتی ہوئی روح اس کرۂ ارض پر روشنی کی کرنیں بکھیرتی ہی رہے گی کیوں کہ یہی قانونِ فطرت ہے۔

متفرقات

"بازیافت" مغنی تبسم کی یہ کتاب تبصروں پر مشتمل ہے جو مارچ ۱۹۶۸ء کو شائع ہوئی۔ اس کتاب کو انھوں نے خلیل الرحمٰن اعظمی کے نام معنون کیا ہے۔ جس کا پیش نامہ پروفیسر عالم خوندمیری نے لکھا ہے۔ انھوں نے مغنی تبسم کی جدید ادب کے متعلق ناقدانہ اور عالمانہ افہام و تفہیم کی کوششوں کو خوب نوازا ہے۔ اس کتاب میں (۱۶) کتابوں پر تبصرے شامل ہیں جن میں دس تبصرے شاعری سے متعلق کتابوں پر کیے گئے ہیں۔ دو تبصرے تنقید پر شامل ہیں اور دو افسانوی مجموعوں پر پیش کیے گئے ہیں۔ ایک دکنی ادب کی تحقیق پر اور ایک یوگوسلاویہ کے ادیب ناولٹ پر تبصرہ پیش کیا گیا ہے۔

مغنی تبسم نے اس کتاب میں جو تبصرے کیے ہیں وہ متنوع انداز کی حامل ہیں۔ حمایت علی شاعر کا مجموعہ "آگ میں پھول" اور قمر ساحری کا "ضرب آتشیں" پر تبصرہ کرتے ہوئے انھوں نے دونوں شاعروں کے کلام کی فنی خوبیوں کا جائزہ لیا ہے۔ ڈاکٹر محمد علی اثر لکھتے ہیں:

> "مغنی تبسم نے ان تبصروں میں ترقی پسندی کی بے جا حد بندیوں، سطحی پن اور زوال کے اسباب پر روشنی ڈالی ہے۔ ان موضوعات پر بعد ازاں بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن اس وقت جب یہ کتاب شائع ہوئی جدیدیت نے کوئی مستحکم صورت اختیار نہیں کی تھی ترقی پسندی کے سائے ابھی بھی منڈلا رہے تھے۔

پیرو منیر مغنی تبسم جدیدیت کے
فروغ کے سلسلے میں رہنما کی حیثیت
رکھتے ہیں۔ ان کا ذہن اس دور کے
الجھے ہوئے موضوعات پر بالکل
صاف رہا ہے۔ انھوں نے ہر بات
واضح دو ٹوک مدلل اور تابل
قبول انداز سے پیش کی ہے۔ اس
سلسلے میں ایک اہم بات یہ ہے کہ
انھوں نے ترقی پسند شاعری کی جانب
سے معاندانہ یا جارحانہ رویہ بھی
اختیار نہیں کیا بلکہ اپنی ہر بات
عالمانہ اور معروضی انداز میں
بیان کی ہے" [1]

عنایت علی شاعر کا یہ پہلا مجموعہ کلام ہے جو نو دس
سال کی فکر و سخن کا نچوڑ ہے اس مجموعے کلام پر مغنی تبسم تبصرہ
کرتے ہوئے لکھتے ہیں،

" زندگی کے بارے میں کسی فلسفے کو
اپنانا بری بات نہیں ہے۔ لیکن جب
کوئی فلسفۂ حیات اپنی روشنی سے
حیات و کائنات کے مختلف مظاہر
کو ان کی اصلی صورت میں بے نقاب
کرنے کی بجائے فن کار کی آنکھ پر

---

[1] ۔ ڈاکٹر محمد علی اثر۔ بازیافت۔ ایک مطالعہ مرتبہ نذر مغنی تبسم۔ ص ۱۲۵

رنگین عینک چڑھا دیتا ہے تو فن
کا انجام ظاہر ہے"[1]

"ضربِ آتشیں" یہ مجموعہ کلام (۲۹) نظموں (۲۵) غزلوں اور
بتن رباعیوں پر مشتمل مجموعہ کلام کے جس میں ۸۸۶ مصرعے
شامل ہیں قمر ساحری کا اثاثہ ہے۔ جن کے ذوقِ شعر گوئی کی ابتدا
ترقی پسند ادب کی تحریک کے آغوش میں ہوئی تھی۔ ان نظموں پر
تبصرہ کرتے ہوئے مغنی تبسم لکھتے ہیں:

"شاعر تخلیق فن کے آداب سے
روگردانی نہ کرے تو سائلی اور
سیاسی شاعری کی اپیل دیرپا ہو سکتی ہے۔
یہ بھی ضروری ہے کہ شاعر کی فکر سیاسی
جماعتوں کے پروگرام اور پالیسی سے
آزاد ہے۔ اردو میں ترقی پسند
ادب کی تحریک کو جماعتی وابستگی
کی وجہ سے برے دن دیکھنے پڑے"[2]

مغنی تبسم کی اس کتاب پر ڈاکٹر عالم خوندمیری اس طرح
رقمطراز ہیں:

"ان کے ہاں علمیت کے ساتھ انکسار بھی ہے
اور اس لیے 'وہ ضربِ آتشیں' اور
'آگ میں پھول' کے تبصروں میں
کبھی ان شاعروں کے ساتھ انصاف

---

[1] ۔ پروفیسر مغنی تبسم ۔ بازیافت ۔ مضمون "آگ میں پھول" ص ۱۲
[2] ۔ پروفیسر مغنی تبسم ۔ بازیافت ۔ مضمون "ضربِ آتشیں" ص ۱۸

کر سکے۔ ان میں ترقی پسندوں کی
پیغمبرانہ شان تو ہے ہی نہیں، جدیدیت
کے علمبرداروں کی رعونت بھی انھیں
چھو نہیں سکی ـــــ مغنی تبسم کی
ادبی بصیرت کی کامیابی یہ ہے کہ
وہ ادب کے تسلسل اور تجدد
دونوں پر نظر رکھتے ہیں" [1]

جعفر طاہر کی طویل نظموں پر مشتمل نظموں کا مجموعہ
"لغت کشور" پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اردو میں یہ طویل
نظموں کی کمی کو بڑی حد تک پورا کرتا ہے۔ مغنی تبسم نے نہ صرف
ان طویل نظموں کی ڈرامائی اور رزمیہ خصوصیات کی تعریف کی ہیں
بلکہ ان غیر مانوس لفظیات، بے معنی تراکیب، قواعد زبان سے
روگردانی اور تک بندی اور عروض کی خامیوں کو بھی اجاگر کیا ہے۔
ڈاکٹر عالم خوندمیری لکھتے ہیں:

"ڈاکٹر مغنی تبسم کی تنقیدوں اور
ان کے تبصروں کی سب سے بڑی خوبی
یہ ہے کہ وہ نئے نقاد کی دوہری
ذمہ داری کی تکمیل کرنے میں کامیاب
ہوئے ہیں۔ وہ اپنے تبصروں میں
نئی نفسیاتی بصیرت سے بھی کام
لیتے ہیں۔ اور نئے فلسفیانہ شعور کا بھی
اظہار کرتے ہیں۔ جدید تنقید خواہ

---

[1] ۔ ڈاکٹر عالم خوندمیری۔ بازیافت (پیش نامہ) ص ۸

صرف نفسیاتی بصیرت اور نئے فلسفیانہ
شعور سے تکمیل نہیں پاتی، ہر چند کہ
اس کے ناگزیر عناصر ہیں۔ اس نئی
بصیرت اور نئی فلسفیانہ آگہی کے ساتھ
نئے نقاد کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ لسانی
تجزیے کے Tools کا بھی مالک ہو۔[1]

"الف" یہ جعفر طاہر کا پہلا مجموعہ کلام ہے۔ جس میں شامل نظموں اور غزلوں میں پائے جانے والے نئے اظہارات اور تجربات کی تعریف کی گئی ہے۔ کہتے ہیں:

"رئیس امروہوی صاحب نے بظاہر
شعری اصناف کے قدیم سانچوں سے
کام لیا ہے لیکن غزل میں اور
نظم میں بھی ان کے اظہارات نئے ہیں۔
اردو غزل کو زندہ رکھنے کے لیے اسے
ہر عہد کے انسان کے جذبات
کا ترجمان بنانا ہوگا۔ اس کے لیے نئی
علامتوں اور رمزوں کی ایجاد
اور معنوی تلازموں کی دریافت
ایک اہم مسئلہ ہے۔ جدید شاعروں
کو اپنی اس ذمہ داری کا احساس ہے
اس کا اندازہ ان تجربات سے ہوتا ہے
جو آج کی غزل میں کیے جا رہے ہیں۔

---

[1] ۔ ڈاکٹر عالم خوندمیری۔ بازیافت (پیش نامہ) ص ۶

رئیس صاحب نے بھی تجربے کیے ہیں
اور وہ اپنے تجربوں میں کامیاب ہیں"۔[1]

برق موسوی کی رباعیات کے مجموعے "فردات و فرتاب"
پر تبصرہ کرتے ہوئے مغنی تبسم نے صنفِ رباعی اور فنِ رباعی کے متعلق
بڑے بصیرت افروز باتیں پیش کی ہیں۔ برق موسوی ایک پرگو
شاعر ہیں۔ صنفِ رباعی گوئی پر بھی انھیں عبور حاصل ہے۔ اور کلاسیکی
رباعی کے چار مصرعوں میں خیال کی تعمیر کے چار مرحلے ابتدا، توسیع،
ارتفاع اور اختتام کا التزام بھی برق موسوی کی رباعیوں میں
شامل ہے۔ الفاظ کے انتخاب اور اس کے استعمال کا ہنر خوب
جانتے ہیں۔

مغنی تبسم لکھتے ہیں،

"وہ زندگی اور کائنات کو ایک
خاص زاویہ نظر سے دیکھتے ہیں۔ یہ
زاویہ نظر منفرد اور اچھوتا نہ سہی
لیکن اسے ان کے اپنے مشاہدات و
تجربات اور ذاتی غور و فکر کی تصدیق
حاصل ہے۔ وہ جو کچھ دیکھتے اور
سوچتے ہیں اسے شعر کے سانچے میں
ڈھال کر اس طرح پیش کرتے ہیں کہ
قاری کے دل میں ان کی بات
اتر جاتی ہے جہاں ان کی فکر تصوف
اور مشرقی علوم کے سرچشموں سے

---

[1] ۔ پروفیسر مغنی تبسم۔ بازیافت۔ "الف" ص۔ ۲۵

فیض یاب ہے وہیں ان کا ذہن جدید
افکار کی روشنی سے منور بھی ہے" [1]

شہریار، ساذ تمکنت اور وحید اختر ان تینوں جدید شعراء کے پہلے مجموعے کلام پر بھی مغنی تبسم نے تبصرہ کیا ہے۔ "اسم اعظم" شہریار کا اولین مجموعہ ہائے کلام ہے۔ جس کو مغنی تبسم نے تبصرہ کے لیے منتخب کیا ہے۔ انھوں نے اس طرح باریک بینی سے تجزیہ کیا ہے کہ شہریار کے کلام کی انفرادی خصوصیات اُجاگر ہو جاتی ہے۔

"کلام اسم اعظم کا شاعر عام شاعروں
کی طرح عشق زدہ ہیں ہے وہ
حواس "پنچگانہ" اور تخیل کی مدد
سے اپنے اطراف پھیلی ہوئی کائنات
اور زندگی کا ادراک کرتا اور اپنے
تجربات، مشاہدات، محسوسات
اور جذبات کو فکر کی آنچ میں تپا کر
شعر کے قلب میں ڈھالتا ہے۔
اس کی شاعری نوع انسان کے کلی شعور
سے متوافق اور زندگی میں رچے ہوئے
حزن کے گہرے احساس سے مملو ہے۔
اس احساس نے اس کے لہجے کو طنز آمیز
بنا دیا ہے۔ لیکن اس طنز میں
نفرت کی تلخی نہیں ہے۔ اس لیے کہ
وہ زندگی سے پیار کرتا ہے، اور اس

---

[1] ۔ پروفیسر مغنی تبسم۔ "بازیافت" فراق و فرتاب" ص ۲۴۲

بتِ ہزار شیوہ کو اس کی تمام بے وفائیوں
اور کج اداییوں کے باوجود اپنے
سینے سے لگاتا ہے"[1]

اس مجموعہ میں شہریار کی مختصر نظمیں شامل ہیں۔ جدید شاعروں میں اختر الایمان، منیر نیازی کے ساتھ شہریار بھی مختصر نظم کو مقبول بنانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ جو ہماری شاعری کی ایک مستقل صنف بن چکی ہے۔ شاذ تمکنت کا مجموعہ کلام "تراشیدہ" میں مغنی تبسم نے اس کلام کی تمام خوبیات کا جائزہ لیا ہے۔

"شاذ نے الفاظ اور تراکیب کی انوازی
محاکات اور صوتی دل کشی پر
قناعت کی ہے اور ان کی مدد سے
اپنی نظموں کو ایسا لگا رکھا نہ
بنا دیا ہے جس میں مختلف
تصویریں سلیقے سے سجا دی گئی ہوں"[2]

مغنی تبسم نے شاذ کے کلام کی خوبیوں کا جن میں لفظ پرستی، تراکیب، تشبیہات، محاورات اور قواعد شامل ہیں کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ شاذ تمکنت کی نظموں کی توصیف کرتے ہوئے مغنی تبسم نے بھی اشارہ دیتے ہیں کہ

"شاذ نے اب تک اپنے لیے کوئی
راہ نہیں بنائی ہے"[3]

۱۔ پروفیسر مغنی تبسم۔ بازیافت۔ "اسم اعظم" ص ۴۶، ۴۷
۲۔ " " "تراشیدہ" ص ۵۴
۳۔ ایضاً ایضاً ص۔ ۵۸

وحید اختر کے مجموعہ " پتھروں کا مغنی " اس تبصرہ میں مغنی تبسم نے وحید اختر کی نظم بیا تا گل بیا فشانیم" کے آہنگ کا مطالعہ موضوعاتی نقطہ نظر سے کیا ہے۔

مغنی تبسم نے خواہ کسی بھی زاویے سے ~~انھوں نے~~ شعر و ادب کا جائزہ لیا ہو لیکن انھوں نے معروضیت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ اور تکلف برطرف والے انداز میں انھوں نے دو ٹوک بات بھی کہہ دی ہے ان کا موقف معقول اور مدلل ہوتا ہے۔ وحید اختر کے شعری مجموعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

" میں وحید اختر کے اس خیال سے
متفق نہیں ہوں کہ ہیت، تکنیک اور
ڈکشن کے سوالات ضمنی ہیں۔ ہر تجربہ
یا خیال یا احساس اپنے ساتھ موزوں
لباس، مخصوص ڈکشن اور مناسب
ہیئت لے کر ذہن پر وارد ہوتا ہے۔
شاعر کا کام یہ ہے کہ جو خیال یا تجربہ
اپنی زبان استعداد کے مطابق لباس
مانگے اسے وہی پہنا دے۔ وحید اختر
کے اس بیان میں تناقض ہے جو اس
خرد و تصور کی وجہ سے پیدا
ہوا ہے کہ ہیت اور مواد دو
مختلف چیزیں ہیں اور شاعری الہام ہے۔
شاعری الہام ہی نہیں صناعی بھی ہے" [1]

---

[1] ۔ پروفیسر مغنی تبسم ۔ بازیافت " پتھروں کا مغنی " ص ۔ ۶۴

"نئے نام" اس کتاب کو شمس الرحمٰن فاروقی اور حامد حسین حامد نے ترتیب دیا تھا۔ اس انتخاب نے جدید اردو شاعری سے متعارف کروانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ محمد علی اثر لکھتے ہیں:

"شاعری میں ابلاغ اور ترسیل کے
موضوع پر شمس الرحمٰن فاروقی کا
مقصد کافی عرصہ تک ادبی حلقوں
میں موضوعِ بحث رہا۔ ان سے اختلاف
کرنا بڑی دلیری چاہتا ہے۔ مغنی تبسم نے
اسی زمانے میں ایسا کیا اور
فکری جرأت مندی کے ساتھ متبادل
اور معقول اصطلاحیں پیش کیں۔
ان کا تبصرہ علمیت کا حامل ہے
لیکن اسی تبصرے میں انھوں نے
لجد کو زیادہ فروغ پانے والے
اوزان و بحور کی بہ جائے آہنگ
کی بنیاد پر کی جانے والی شاعری
کے امکانات کی نشان دہی کی ہے"[1]

"کالے کاغذ کی نظمیں" یہ باقر مہدی کا مجموعہ کلام ہے۔ جس میں مغنی تبسم نے ان کے کلام میں بدلے ہوئے پیرائے اظہار کی نشان دہی کی ہے۔ یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیے۔

"یہ باقر مہدی کی شاعری کا اور سچی
شاعری کا اچھا نمونہ ہے۔ جس کا مطالعہ

---

[1] ڈاکٹر محمد علی اثر۔ مہاراشٹر۔ شمولہ نذرِ مغنی تبسم۔ ص۔ ۱۳۷

نہ صرف باقر مہدی کی شاعری سے
لطف اندوز ہونے اور اس کی
قدر و قیمت کا تعین کرنے بلکہ
جدید نسل کی شاعری سے متعلق
روشناس ہونے کے لئے بھی ضروری ہے۔
ان نظموں کے تجزیے سے یہ بات
کھلتی ہے کہ شاعر نے "بیان" سے
"اظہار" کی طرف قدم بڑھایا ہے۔
پہلے وہ پابند طریق تھا، زندگی کا
تماشائی تھا لیکن اب خود زندگی میں
شامل ہو گیا ہے"[1]

کوثر چاندپوری کے مضامین کا مجموعہ "دیدۂ بینا" ہے
مغنی تبسم کا یہ تبصرہ نہایت مختصر ہے انھوں نے لکھا ہے کہ اس
مجموعے کے تمام مضامین میں نقطۂ نظر کی وحدت اور تنقیدی
طریقۂ کار کی یکسانیت نہیں ملتی۔ اس سے قطع نظر ہر مضمون
اپنی جگہ دلچسپ اور خیال افروز ہے۔

"اپنی زبان پر عبور اور اظہار پر
قدرت حاصل ہے۔ جو کچھ سوچے
اور محسوس کرتے ہیں بڑی خوبی سے ضبط
تحریر میں لے آتے ہیں۔ وہ تنقید اور
تحقیق کے باہمی ربط اور فرق سے
بخوبی واقف ہیں۔ تنقید میں

---

[1] ۔ پروفیسر مغنی تبسم۔ بازیافت" کالے کاغذ کی نظمیں ص۔ ۸۴

سائنٹفک نقطۂ نگاہ کی اہمیت کو
سمجھنے اور کام میں لانے کی کوشش
بھی کرتے ہیں۔"[1]

"اردو ادب آزادی کے بعد" ڈاکٹر اعجاز حسین کی تصنیف پر تبصرہ تجزیاتی انداز میں کیا گیا ہے اور اس کتاب میں شامل مختلف اصناف ادب کے تحت پائی جانے والی کمزوریوں کی بھی نشان دہی کی گئی ہے۔ مغنی تبسم نے اس کتاب کو یک رخا اور نامکمل جائزہ قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں!

"ضروری ہے کہ کوئی گہری نظر
رکھنے والا ادبی مورخ جسے
اتنی فرصت ہو کہ وہ پچھلے تیرہ سالوں
میں جمع شدہ سارے ادبی ذخیرہ
کو کھنگال کے۔ جدید اردو ادب
اور شاعری کا اثر سرِ نو جائزہ لے
اور موضوع کے ساتھ پورا انصاف
کرے"[2]

جامعہ عثمانیہ شعبۂ اردو کی جانب سے شائع ہونے والا پہلا تحقیقاتی مجلہ "قدیم اردو" ہے جس کے مدیر اعلیٰ اس وقت کے صدر شعبہ پروفیسر مسعود حسین خاں ہیں۔ قدیم اردو زبان و ادب کے مخطوطات، ارباب شعبہ کے ذریعے مرتب و مدون کرکے اس مجلہ میں شائع کیے جاتے تھے۔ مغنی تبسم نے اس تبصرہ

---

[1] ۔ پروفیسر مغنی تبسم ۔ بازیافت ۔ "دیدۂ بینا" ص ۸۷، ۸۸
[2] ۔ پروفیسر مغنی تبسم ۔ بازیافت "اردو ادب آزادی کے بعد" ص ۹۵

میں قدیم اردو ادب کے متعلق بعض اہم معلومات سے بھی روشناس کرایا ہے۔ اور ایڈیٹنگ کے طریقہ کار میں بھی یکسانیت پیدا کرنے کی طرف متوجہ کیا ہے۔

"مکھی" احمد ہمیش کے ابتدائی افسانوں کا مجموعہ ہے مغنی تبسم نے اس مجموعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے احمد ہمیش کے افسانوی کی خصوصیات کو اجاگر کیا ہے اور جدید افسانے کے خدوخال سے بھی قارئین کو متعارف کروایا ہے۔ لکھتے ہیں:

"تمام خصوصیات کے ساتھ ترکیب
یا سنہ والا یہ اسلوب احمد ہمیش
کی کہانیوں کا جز لاینفک ہے۔
ان کہانیوں کو اور طرح سے بیان ہی
نہیں کیا جا سکتا۔ شاید یہی وہ بنیادی
وصف ہے جو نئی اور پرانی کہانی
کے درمیان حد فاصل قائم کرتا ہے"[1]

اس تبصرہ کے بعد مغنی تبسم نے یوگو سلاویہ کے ناول نگار اور شاعر سی۔ منڈروک کے ناولٹ "کاکٹیل" کا بھی تعارف کروایا ہے۔

بازیافت کا آخری تبصرہ عوض سعید کے افسانوں کا مجموعہ "سائے کا سفر" ہے۔ اس تبصرہ کی ابتدا اس طرح سے کرتے ہیں کہ

"کہانی جہاں حقیقت نمائی کا ایک
دلکش پیرایہ ہے وہیں عدم آگاہی

---

[1] ۔ پیروفیسر مغنی تبسم۔ بازیافت "مکھی" ص۔ 119

"رخ پر حسین نقاب کا بھی کام
کرتی ہے - ہر اظہار اپنے پیچھے ایک
حکایت رکھتا ہے اور اس جہانِ گزراں
میں ہر حقیقت بالآخر ایک کہانی
بن جاتی ہے" [1]

اس تبصرہ میں مغنی تبسم نے عوف سعید کے فن کے
مختلف گوشوں کو نمایاں کیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ فکشن کی تنقید
اور اس کے طریقۂ کار پر بھی روشنی ڈالی ہے -

"نکاتِ اردو" اس کتاب کو مغنی تبسم نے اس وقت لکھا جب کیمبرج اسکول سرٹیفکٹ کے اردو نصاب میں تبدیلی ہوئی تھی اور اب انگریزی نصاب کے ڈھنگ پر ترتیب دیا گیا تھا اس نصاب کے متعلق انگریزی زبان میں اس قسم کی بہت سی کتابیں مل جاتی ہیں. جن میں قواعدِ زبان، الفاظ اور محاوروں وغیرہ کا استعمال اور مضمون نگاری کی مہادیات کو تدریجی عملی مشقوں کے ذریعہ سکھایا جاتا ہے۔ ایسی مشقیں کسی زبان کو سیکھنے اور اس میں مہارت حاصل کرنے میں مدد دیتی ہیں۔ لیکن مدرسوں میں جہاں اردو پڑھائی جاتی ہے صرف قواعد کے اصول اور قواعد کی اصطلاحوں اور تعریفات کو چند مثالوں کے ساتھ پڑھا دیا جاتا ہے۔ جن سے طالب علموں کی معلومات صرف سرسری رہ جاتی ہیں۔ اس کتاب میں مغنی تبسم نے سینئر کیمبرج طلباء کے لیے، صرف و نحو کے قاعدے مشقوں کے ذریعہ ذہن نشین کرانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ سید محمد صاحب ریڈر شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ اس کتاب کے پیش لفظ میں قواعد کی مشقوں کے متعلق لکھتے ہیں:

> "کسی زبان کی انشا پرداری کی تعلیم
> کا یہ بہت پسندیدہ اور معقول طریقہ ہے
> کہ صرف و نحو انشا اور املا کے
> قاعدے مثالوں اور مشقوں کے
> ذریعہ سمجھائے جائیں۔ اس طریقہ کار
> کے ذریعہ طلبا پر خود بخود اچھی اور
> صحیح زبان لکھنے کا مذاق پیدا ہو جائے گا۔
> اور وہ مختلف نمونوں کو دیکھ کر
> اور عام طور پر جو غلطیاں ہوتی ہیں
> اُن سے بچنے کی کوشش کرتے ہوئے

شہری زبان میں اپنے خیالات پیش
کرنے کے قابل ہو جائیں گے "[1]

مفتی قسم نے نکات اردو میں (۲۵) مشقیں کروائی ہیں۔
جن میں الفاظ کے معنی، محاوروں کو جملوں میں استعمال کرنا،
کہاوتوں کی تشریح، اسم پہچاننے کا طریقہ اُن کی قسم جنس اور
تعداد بتانا۔ جملوں کو صحیح کرنا، فعل اور متعلق فعل۔ عبارت
پڑھ کر جواب دینے کا طریقہ۔ مکالمے کو بیانیہ انداز میں لکھنا،
جملے میں فعل اور اس کی قسم زمانہ اور صیغہ کی تعریف کو بھی
سمجھایا گیا ہے۔ افعال کو پہچاننا۔ قدیم اردو کی عبارت کو
جدید اردو زبان میں لکھنے کا طریقہ مشابہ الفاظ کے معنوں کا
فرق وغیرہ آسان انداز میں سمجھایا گیا۔

اس کتاب کو کیمبرج سرٹیفکیٹ کے امتحانات کے لیے
لازمی اور اختیاری اردو میں بطور نصابی کتاب کے قبول
کر لیا گیا ہے۔

---

[1] ۔ سید محمد۔ پیش لفظ۔ نکاتِ اردو۔

سن ۱۹۵۸ء میں مغنی تبسم نے ایس۔ انتونوف کے ایک بہت ہی مارک انگیز مضمون Letters on the short stories کا ترجمہ کہانی اور اس کا فن کے عنوان سے ترجمہ کرکے شائع کیا۔ انتونوف ایک روسی ادیب تھا اور کارل مارکس کا مداح۔ مغنی تبسم کے اس مضمون کو اردو میں ترجمہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ انھیں یہ احساس تھا کہ اُردو کے نقاد زبان و ادب کے بنیادی مسائل پر غور و فکر کرنے کے عادی نہیں ہیں۔ مغنی تبسم نے اس کتاب کے ذریعہ ناقدین کو اس طرف متوجہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس مضمون میں سوویت یونین میں تحریر کردہ روسی زبان کی کہانیوں کی کمزوریاں بتائی گئی ہیں۔ مغنی تبسم کا یہ احساس تھا کہ کم و بیش اسی طرح کی خامیاں اردو کہانیوں میں بھی موجود ہیں۔ اور اس خیال سے کہ نئے افسانہ نگاروں کو ایک راہ مل سکے۔ مغنی تبسم نے اس مضمون کا ترجمہ کیا۔ انتونوف کا یہ مضمون دراصل تین خطوط پر مشتمل ہے۔ جو اس نے روسی زبان کے ایک ناوارد افسانہ نگار کے خط کے جواب میں لکھا تھا۔ یہ خط بھی نوعیت کا نہیں بلکہ کھلا خط ہے اور اس کی حیثیت خط سے زیادہ ایک مضمون کی ہے۔ انتونوف نے کہانی، خاکہ، کردار، نقطہ نظر، پلاٹ، مصنف کا رجحان اور لہجہ جیسے مسائل پر قلم اٹھایا ہے اور یہ سارے مسائل صرف روسی زبان کے ہی نہیں بلکہ دنیا کی ہر اُس زبان سے متعلق ہیں جس میں مختصر افسانہ لکھا جا رہا ہے۔ اُردو میں مختصر افسانہ ترقی پسند تحریک کی دین مانا جاتا ہے۔ لیکن کئی افسانہ نگار کہانی کے صحیح خد و خال اور نظریاتی مسائل سے عدم واقفیت کی بنا پر

وہی غلطیاں کرتے رہے جو اُن کے پیش رو یا خود روس میں
لکھنے والوں نے افسانہ نگاروں نے کی تھی جن کی طرف
انتولوف نے اپنی خطوط میں اشارہ کیا مغنی تبسم نے اس
کتاب کے ذریعہ اُردو افسانہ نگاروں کو کہانی کے سانچے،
لب و لہجہ اور نقطۂ نظر کی وضاحت کی طرف متوجہ کیا ہے۔

شادی کی آخری سالگرہ

شیو۔ کے۔ کمار انگریزی کے استاد بھی ہیں اور
اچھے انگریزی کے شاعر بھی ہندوستانی نژاد انگریزی میں
شیو کے کمار کو ایک اہم مقام حاصل ہے۔ وہ انگریزی کے
استاد بھی رہے کہانیاں بھی لکھیں اور ڈرامے بھی تحریر کیے
اُن کا ایک ڈرامہ لاسٹ ویڈنگ اینورسری کا ترجمہ شادی
کی آخری سالگرہ کے نام سے مغنی تبسم نے ۱۹۷۵ء میں شائع
کیا۔ یہ ڈرامہ تین منظروں پر مشتمل ہے۔ اور اس کے پلاٹ
میں ایٹمبع کی ضروریات کا بھی خیال رکھا گیا ہے۔ اُردو میں ڈرامے
کی روایت ناول افسانے اور شاعری کے مقابلے میں قدرے کمزور رہی ہے
مغنی تبسم نے اس ڈرامے کے ترجمے کے ذریعہ اس خلا کو پُر کرنے کی
کوشش کی۔ اثر انگیزی کے اعتبار سے یہ ڈرامہ قارئین اور
اس کے ساتھ ساتھ ناظرین کی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب ہے اور
شاید اسی لیے مغنی تبسم نے اس ڈرامے کا ترجمہ کیا۔

"تلگو ادب کی تاریخ پر ایک نظر

سن ۱۹۵۹ء میں مغنی تبسم کی ایک اور کتاب تلگو ادب کی تاریخ پر ایک نظر منظرِ عام پر آئی جو تلگو کی تاریخ پر ایک سرسری تبصرہ ہے۔ اس کتاب کی تیاری میں مغنی تبسم نے لکشمی رنجن صدر شعبہ تلگو عثمانیہ یونیورسٹی کی کتاب آندھرا ساہتیہ سنگھرام کے علاوہ کئی دوسرے مضامین اور کتابوں سے استفادہ کیا۔ اس کتاب کے پیش لفظ میں مغنی تبسم نے بہت واضح طور پر اعتراف کیا ہے کہ تلگو ادب کی تاریخ میں ان کی معلومات بالواسطہ ہے جو مغنی تبسم کی ادبی دیانت پر دال ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے تلگو زبان کی وجہ تسمیہ ماخذ اور آغاز کے بعد تلگو ادب کے مختلف ادوار متعین کیے ہیں۔ ان کے مطابق نانیا کا دور گیارھویں صدی تکنا کا تیرھویں صدی ارتنا کا چودھویں صدی سری ناتھ کا چودھویں صدی کا آخری ربع حصہ کرشن دیورائے کا دور چھٹی صدی عیوی اور پھر سترھویں اور اٹھارویں صدی کے شعرا کے علاوہ حیدرآباد کے شاعر اور آندھرا کی خاتون شعرا پر معلومات پیش کی گئی ہیں۔ تلگو میں تاریخِ ادب بھی ملتا ہے بالکل ویسے ہی جیسے دکنی زبان میں مختلف جنگوں کے حالات یا بادشاہوں کے کارنامے نظم کیے گئے ہیں۔ تاریخی ادب کے نام سے بھی چنانچہ مغنی تبسم نے تلگو ادب کا بھی سرسری جائزہ لیا ہے۔ علاوہ ازیں مغنی تبسم نے تلگو ڈرامے کی ایک قدیم شکل یکشا گانو اور شتکا کا بھی احاطہ کیا ہے۔ شتک کے

معنی سو کے ہیں لیکن وہ یمننا کے شتکوں میں پیش کی جانے والے
اشعار کی تعداد تقریباً ایک ہزار بتائی گئی ہے ۔ مفتی تبسم نے ان
شتکوں کو موضوع کے اعتبار سے مختلف اقسام میں تقسیم کیا ۔
یہ کتاب تلگو ادب کی تاریخ سے ناواقف طالب علم کے لیے ایک
اہم معلوماتی ذریعہ ہے ۔ جس کو پڑھ کر وہ تلگو زبان کی
سمت و رفتار کے علاوہ اس میں مروّجہ اور مقبول عام اصناف
کے بارے میں ابتدائی معلومات اردو میں حاصل کر سکتا ہے۔

مختلف کتابوں پر
پیش لفظ، تبصرے

اکثر مصنفین کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ اُن کی کتاب پر کوئی مشہور شخصیت پیش لفظ تحریر کریں۔ اور یہ روایت کوئی نئی نہیں۔ ڈیڑھ سو سال قبل سرسید احمد خاں نے غالب سے اپنی کتاب "آئینہ اکبری" پر تقریظ لکھنے کی خواہش کی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ غالب نے سرسید کی کاوشوں کے سراہنے کے بجائے انھیں اُس دور کے ہونے والی تبدیلیوں کی طرف متوجہ کیا تھا جسے سرسید نے لبّہ نہیں کیا۔ دراصل مصنف یہ چاہتا ہے کہ اُس کی کتاب کو زیادہ سے زیادہ وقعت حاصل ہو اور اسی لیے وہ کسی ایسی نام ور شخصیت کا سہارا لیتا ہے جس کی تحریر پر لوگ اعتبار کرتے ہیں۔ مغنی تبسم نے (۳۵) سے زیادہ پیش لفظ اور مقدمے تحریر کیے ہیں۔ ان میں شعری مجموعے بھی ہیں، تنقیدی کتابیں بھی اور تراجم بھی۔ اس تعداد کو دیکھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ مغنی تبسم کی علمی صلاحیتوں کا اعتراف ہر کسی کے دل میں ہے۔ پیش لفظ کے ساتھ ایک مسئلہ یہ بھی ہوتا ہے کہ غالب کی طرح دو ٹوک تحریر ہر ایک کے لیے ممکن نہیں ہوتی۔ مروتیں خامیوں کی نشاندہی سے باز رکھتی ہیں اور زیادہ تر خوبیوں کو واضح کیا جاتا ہے۔ مغنی تبسم کی تحریروں میں یہ بات واضح طور پر محسوس کی جا سکتی ہے وہ جس کتاب کا پیش لفظ لکھتے ہیں اس کی تمام خوبیوں کو واضح کر دیتے ہیں اُن کے ہاں پیش لفظ اور تنقید میں ایک خط فاصل محسوس ہوتا ہے۔ شعری مجموعوں کے جو اشعار مغنی تبسم اپنے پیش لفظ

کے لیے منتخب کرتے ہیں۔ ان کو دیکھتے ہوئے مغنی تبسم کے شعری
مزاج کا بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ وہ شاعر کی روح تک
پہنچ کر اس کے بہترین اشعار چنتے ہیں یہ اشعار جو مغنی تبسم کے
انتخاب کا نتیجہ ہوتے ہیں اُن کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ
وہ شاعر کے بہترین اشعار ہوتے ہیں مغنی تبسم کی تحریروں کی
خصوصیت یہ ہے کہ اُن کا لہجہ عالمانہ اور خوب صورت اظہار
سے مزین ہوتا ہے۔ احسن رضوی کے مجموعے کلام کے پیش
لفظ میں اس طرح رقمطراز ہیں:

" انھوں نے شعر کہنا اُس وقت
شروع کیا جب ہماری شاعری
ترقی پسند دور سے نکل کر جدید
ترجمانات سے ہم کنار ہو چکی تھی
خاص طور پر غزل کی فضا کا
لسانی و جذباتی ماحول بالکل بدل
چکا تھا پانچ روایت سے دامن
چھڑانے کی سعی و کشمکش سے وہ
بڑی حد تک محفوظ رہے" [1]

وہ آگے لکھتے ہیں:

" ان کی ابتدائی دور کی شاعری کا
اسلوب بیانیہ ہے اُس وقت اُن
کے جذبات اور تجربے واقعے
سنوری زبان کی تخلیق اور زبان

---

[1] - پروفیسر مغنی تبسم - پیش لفظ - " بھیگی زمین " مجموعہ کلام - مصنف ڈاکٹر احسن رضوی
ڈسمبر ۱۹۸۰ ص - ۱۳

کے تخلیقی استعمال کا عمل اس وقت
شروع ہوا جب شعور کی بالیدگی
کے ساتھ بچپن اور اوائل شباب
کے حسین اور دلکش خوابوں کا
تصادم خارجی دنیا کے سنگین حقائق
سے ہوا اور زندگی کی تصویر
اس طرح دھندلا کر رہ گئی جیسے
بھرے ہوئے پانی میں کوئی
عکس کنکری پھینکے۔ پر منتشر
ہو جاتا ہے ان کی شاعری جو اس
عکس کی بازیافت کی خواہش لے کر
ابھری تھی اب ایک انجان اور
نا معلوم شے کی جستجو میں کبھی نہ ختم
ہونے والا سفر بن گئی "[1]

احسن رضوی کے اشعار کا انتخاب کرتے ہوئے مغنی تبسم کے تنقیدی نظریات واضح طور پر نظر آتے ہیں وہ لکھتے ہیں:

آج ہر شخص اپنے چہرے پر نقاب
ڈالے خود اپنی تلاش میں سرگرداں ہے
ہر انسان ادھورا ہے اور اپنی
تکمیل کے کرب میں مبتلا نظر آتا ہے۔

احسن رضوی کے یہ اشعار جدید
دور کے انسان اور اس کے وجود کی

---

[1] ۔ پروفیسر مغنی تبسم ۔ پیش لفظ ۔ بھیگی زمین مجموعہ کلام ۔ مصنف ڈاکٹر احسن رضوی
دسمبر ۱۹۸۰ء ص ۱۳، ۱۴

موقف کی تصویر پیش کرتے ہیں" [1]

مغنی تبسم کے انتخاب کو سمجھنے کے لیے ذیل میں احسن رمزی کے چند شعر درج کیے جا رہے ہیں:

کتے خانوں میں بٹا ہے زندگی
اس طرح تو میں کبھی بکھرا ہوا تھا

مرا خمیر یہ کہتا ہے بار بار مجھ سے
تو اپنے چہرے سے بے چہرگی اتار بھی دے

شجر سارے برہنہ ہو چکے ہیں
کہاں جائیں کہیں سایہ نہیں ہے

رئیس اختر کے لیے وہ لکھتے ہیں۔

"مجموعی طور پر رئیس اختر کی شاعری
میں شکست خوردگی اور تشنگی کی
کیفیت نمایاں ہیں یا لخصوص زندگی
کی ناپائیداری کے احساس اور عمر رفتہ
کی تلخ و شیریں یادوں سے
ان کے لہجے میں حزن و ملال

---

[1] ۔ پروفیسر مغنی تبسم ۔ پیش لفظ ۔ "بھیگی زمین"۔ مجموعہ کلام ۔ احسن رمزی
ڈسمبر ۔ ۱۹۸۰ء ص ۱۴

کی ایک لطیف کیفیت کے ساتھ عصری
حسیت بھی پائی جاتی ہیں۔ جس میں
جدید عہد کے انسان کا وجودی
کرب اور قدروں کی شکست
و ریخت کا احساس بھی شامل ہے"[1]

بودھن کے ایک شاعر سالک بودھنی کا پیش لفظ مختصر ہے لیکن صاحبِ کتاب کی شاعری پر نہایت چابکدستی سے انھوں نے خیالات پیش کردیئے ہیں وہ لکھتے ہیں،

"سالک صاحب فطری شاعر ہیں
صحیح معنوں میں سخن الرحمن ہیں۔
نام و نمود سے بے نیاز رہ کر محض اپنے
ذوق کی تسکین کے لئے شعر کہتے ہیں۔
زبان و فن پر کمال کا اظہار انھیں
مقصود نہیں۔ ان کا کلام تصنع
سے مبرا ہے"[2]

فاطمہ تاج کے مجموعے اب کے برس کے پیش لفظ میں وہ لکھتے ہیں۔

"اس کے مطالعہ سے اندازہ
ہوتا ہے کہ (وہ) ایک منفرد
لہجہ اور اسلوب کی تلاش میں ہیں"[3]۔
اور اس میں وہ بڑی حد تک کامیابی حاصل کرلی ہے"[3]

---

[1] پروفیسر مغنی تبسم - پیش لفظ - آئینۂ دل میں عکس غزل مصنف رئیس اختر دسمبر ۱۹۷۹ ص-۸

[2] پروفیسر مغنی تبسم - پیش لفظ - "بادۂ گل" مصنف سالک بودھنی، ۱۹۹۷، ص-۵

[3] پروفیسر مغنی تبسم - پیش لفظ "اب کے برس" مصنف فاطمہ تاج - مئی ۱۹۹۲ ص-۸

ارشد علی خاں کے مزاحیہ مضامین کے مجموعے پر لکھتے ہیں:

"ارشد علی خاں نے عرصۂ ادب میں
ابھی قدم رکھا ہے - اس دشت کی
سیاحی کے لئے ایک عمر پڑی ہے۔ ان
کی جو کچھ تخلیقات سامنے آئی ہیں
وہ اس امکان کی نشان دہی
کرتی ہیں کہ بہت جلد ان کا شمار
اردو کے اچھے مزاح نگاروں میں
ہونے لگے گا۔ کسی نئے قلم کار سے
یہ توقع رکھنا شاید زیادتی ہوگی کہ
اس کی تحریر میں، زبان اور فن کے
استعمال سے یکسر مبرا ہوں"[1]

منیر الزماں کے لئے مذاب رائے لکھتے ہوئے وہ رقمطراز ہیں۔

"چوتھی اور پانچویں دہائی میں
نوجوان شعراء بالعموم جس
انداز کی رومانی شاعری کرتے تھے
اس کا پرتو اس مجموعے کی نظموں
اور غزلوں میں جھلکتا ہے تربیتی
دور کی یہ شاعری امکانات
سے خالی نہیں ہے۔ پختگی، شعور
کے ساتھ یقین ہے کہ ان کے کلام
میں تصوری آگہی کے ساتھ زندگی

---

[1] - پروفیسر مغنی تبسم - پیش لفظ۔ "شوشے" مصنف ارشد علی خاں اشاعت 1979ء
ص - ا

زندگی کے گہرے اور وسیع تجربات
کا منکا رانہ اظہار ہونے لگے گا"[1]

یہ چند نمونے اس لیے پیش کیے گئے کہ مغنی تبسم کی تحریر کے انداز کو محسوس کیا جا سکے۔ اُن کے ہاں ایک طرف مروتیں ہیں تو دوسری طرف ایک نقاد کی حیثیت سے اُن کا شعار حق گوئی بھی ہے لیکن اس طرح کہ یہ حق گوئی دل توڑنے کا سبب نہ بن جائے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کی تحریر کے لیے بے حد مشاقی کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ مشاقی مغنی تبسم کے ہاں واضح طور پر دیکھی جا سکتی ہے۔

تبصرے

تبصروں کا معاملہ پیش لفظ سے جدا ہے۔ پیش لفظ کے ساتھ مروتیں وابستہ ہوتی ہیں جبکہ تبصرہ میں ایسی کوئی بات نہیں ہوتی۔ مغنی تبسم نے کئی تبصرے تحریر کیے اور اُن کے طویل تبصروں پر مشتمل ایک کتاب بازیافتیں شائع ہو کر منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔ جیسا کہ عرض کیا گیا تبصرہ نگار اُن ہی کتابوں پر تبصرہ تحریر کرتا ہے جس سے اس کو لکھنے کی تحریک ملتی ہے کبھی کبھی اس بات کا امکان ہے کہ فرمائش پر بھی تبصرے لکھے جائیں۔ فرمائشی تبصروں میں اس بات کا امکان ہے کہ قدرے مروت سے کام لیا جائے۔ لیکن چونکہ یہاں تبصرہ نگار کے ناقدانہ رویہ کا بھی دخل ہوتا ہے

---

[1] ۔ پروفیسر مغنی تبسم ۔ پیش لفظ ۔ "شفق رنگ" مصنف میزا لزماں نومبر ۱۹۸۵ء ص ۔ ۱

اپنے تبصرے میں حقائق بھی کھل کر پیش کیے جا سکتے ہیں۔
مغنی تبسم کے تبصرے دیکھنے سے محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے
نکتہ چینی کا قاطر تبصرہ نہیں کیا بلکہ صرف اُن کی کتابوں پر
قلم اٹھایا جو انھیں پسند آئیں۔ پسندیدگی کے اس عمل نے
انھیں کتاب کی خوبیوں کی طرف متوجہ کیا۔ چنانچہ حنیف کیفی
کی تصنیف "اردو میں نظم معریٰ اور آزاد نظم" پر
تبصرہ کرتے ہوئے انھوں نے حنیف کیفی کی صلاحیتوں کو
بھرپور خراج پیش کرتے ہوئے لکھا

"ایک اچھا محقق اور نقاد بننے کے لیے
سہل ذوق ہونا اولین شرط ہے
جو شخص شعر و ادب کا مذاق
صحیح نہ رکھتا ہو وہ تحقیق و تنقید
کے میدان میں کوئی قابلِ قدر
کارنامہ انجام نہیں دے سکتا۔
حنیف کیفی اس شرط کو بدرجہ
احسن پورا کرتے ہیں"[1]

تنقیدی تحقیق میں کوئی بات حرفِ آخر قرار دینا درست
نہیں ہوتا۔ مغنی تبسم اس بات سے بخوبی واقف ہیں۔ حنیف کیفی
کی کتاب پر ستائشی کلمات کے باوجود جہاں انھیں اختلافی
باتیں نظر آئیں انھوں نے کیا ان کا بھی ذکر حنیف کیفی سے کہیں کہیں اہم
نقادوں سے اختلاف کیا ہے جیسے شمس الرحمٰن فاروقی کا خیال ہے کہ ایک
دو افاعیل کی تکرار کے بجائے نظم میں مطالعہ کر کے

---

[1] پروفیسر مغنی تبسم۔ تبصرہ۔ رسالہ "آہنگ" ستمبر ۱۹۸۳ء۔ ص ۴۶

زحافات کو بھی استعمال کرنا چاہیے۔ اور ساتھ ہی انھوں نے
کہا ہے کہ ایک ہی نظم میں مختلف بحریں استعمال ہو سکتی ہیں۔
حنیف کیفی نے اس بات سے اختلاف کیا کیوں کہ انھیں
اندیشہ تھا کہ اس کی وجہ سے آہنگ بگڑ جائے گا اور
نظم ایک میکانکی عمل ہو کر رہ جائے گی لیکن معین نسیم
حنیف کیفی کے اس خیال سے اتفاق نہیں کرتے وہ لکھتے ہیں۔

"شاعر اگر اچھا صناع ہو تو وہ
زحافات کا استعمال اس طرح
کرے گا کہ آہنگ بگڑے گا نہیں
بلکہ ایک خوش گوار تنوع پیدا
ہوگا۔ ایک سے زیادہ بحروں کے
استعمال کی گنجائش خود
ہمارے عروضی نظام میں ہی
نکل آتی ہے۔ ایک دائرے
سے تعلق رکھنے والی بحریں چھوٹے
اور طویل مصوتوں کی مخصوص ترتیب
سے بننے والی زنجیر کا حصہ ہوتی ہیں
ان بحروں کی باہم تبدیلی اور
امتزاج سے آہنگ کے دلکش
خوش گوار تجربے کیے جا سکتے ہیں۔
مثلاً ہزج اور رمل کو بآسانی
ایک دوسرے میں مدغم کیا جا سکتا ہے"[1]

---

[1] - ہمدم نسیم معنی تبسم - شمارہ ۵ - رسالہ "آہنگ" ستمبر ۱۹۸۳ء ص ۴۷

یہ طرزِ فکر مکلد سیکی مزاج رکھنے والے ناقدین اور شعرا
کے لیے شاید قابلِ قبول نہ ہو لیکن یہ بات بالکل درست ہے
کہ لاعلمی سے ہونے والی غلطی اور قصداً کیے جانے والے
تجربے میں فرق ہوتا ہے۔ مصحفی کے ایک شاگرد نے
غلطی سے بحرِ رمل میں ہزج کے ارکان شامل کر دیے تھے
جس پر انشا نے سخت گرفت کی اور کہا کہ

"بحرِ ہزج میں ڈال کے بحرِ رمل چلے"

اس کے جواب میں شاعر نے اپنی غلطی کا اعتراف کرتے
ہوئے یوں جواب دیا تھا کہ

گرتے ہیں شہسوار ہی میدانِ جنگ میں
وہ طفل کیا گرے گا جو گھٹنوں کے بل چلے

اساتذۂ فن مروضہ کے نزدیک یہ بات معیوب
مانی جاتی ہے کہ ایک بحر کے ارکان کو دوسری بحروں میں
استعمال کیا جانا چاہیے، وہ ایک واقعہ ہے متعلق
کیوں نہ ہو لیکن اگر یہی عمل واقفیت کے ساتھ اور تجربے
کا خاطر کیا جائے اور آہنگ میں بھی ایک خوش گوار
کیفیت پیدا ہو جائے تو ظاہر ہے کہ اس طرح کی کوشش
مستحسن قرار دیے جانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

مغنی تبسم کے بیشتر تبصرے مضامین کی نوعیت
کے ہیں۔ حیدرآباد سے نکلنے والے ایک جریدے "صبر" میں
بارِ خاطرِ مریم برلکھا گیا تبصرہ مضمون کی نوعیت رکھتا ہے۔
اسی طرح بازیافت میں شامل تبصرے سارے کے سارے
مضامین ہیں۔ اور ان کے مضامین لکھنے کی وجہ یہ ہے کہ
ان کتابوں میں مغنی تبسم کے قلم کو لکھنے پر مجبور کیا۔

دیے ماہ نامہ صبا "سب رس"، "شعر و حکمت" "سیاست" اور
کئی دوسرے جریدوں کے لیے مغنی تبسم متواتر تبصرے لکھے
اور جہاں انھوں نے ان تبصروں میں کتاب کی خوبیوں کی
نشان دہی کی ہے وہیں انھوں نے مصنف کے نقطۂ نظر سے
اختلاف بھی کیا ہے۔ اور جہاں جہاں انھوں نے ضروری سمجھا
غلطیوں کی نشاندہی کی جو ایک تبصرہ نگار کا فرض ہوتا ہے۔

تحسینِ شعر

جنوری سن ۱۹۹۹ء سے مغنی تبسم نے روزنامہ سیاست کے لیے ایک خصوصی کالم تحسینِ شعر کے عنوان سے لکھنا شروع کیا۔ یہ سب ہی جانتے ہیں کہ مغنی تبسم بنیادی طور پر استاد ہیں اور تدریس کے مشغلہ نے کم و بیش چالیس سال گذارے ہیں۔ شعر کی تفہیم کا عمل طالب علم کے لیے پہلے ہونا ہی سے ضروری ہوجاتا ہے۔ طالب علم پر ہی کیا موقف ہے کوئی بھی قاری شعر پڑھ کر اپنی معلومات اپنے مشاہدے اور تجربے کی روشنی میں مطالب اخذ کرتا ہے لیکن ایک کھلے ذہن کا وسیع مطالعے کا حامل شخص کسی شعر کو پڑھتا ہے تو اس کے سامنے مفاہیم کے دریچے وا ہونے لگتے ہیں۔ کچھ ایسا ہی حال مغنی تبسم کا بھی ہے وہ یہ جانتے ہیں کہ شعر کے بطن میں کیسے داخل ہوا جاسکتا ہے چنانچہ انھوں نے یہ سوچا کہ شعر کے دریچوں میں داخل ہوکر مفاہیم کی نئی دنیا میں کیسے قدم رکھا جاسکتا ہے۔ یہاں ایک بات کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے پہلے بھی کہیں اس

اس بارے میں لکھا گیا ہے کہ مغنی تبسم کے اندر ایک صوفی بھی دبا بیٹھا ہے۔ تحسین منظر کے سلسلے کا پہلا شعر مغنی تبسم کی ذہنی کیفیات اور راہِ تصوف کے نازک مقامات تک ان کی نظر کی دلالت کرتا ہے۔

میں تو ان مجوبیوں پر بھی سراپا دید ہوں
اس کے جلووں کی ادا اک شانِ مستوری بھی ہے

مغنی تبسم وجودی اور شہودی طرزِ فکر کی نزاکتوں سے واقف ہیں غالب اس بات پر حیران ہیں کہ جب شہود شاہد اور مشہود کی اصل ایک ہے تو پھر مشاہدہ کا کیا مطلب و مقصد ہو سکتا ہے۔ مغنی تبسم اس حیرت کی وضاحت کرتے ہیں اور اصغر گونڈوی کے متصوفانہ نظریہ کو واضح کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ

"یہ تو تنزیہہ کے عالم کی بات ہوئی۔
مرتبۂ احدیت میں بس اللہ ہی اللہ ہے۔
اس کی ساری صفات اس کی ذات
میں مجتمع ہیں۔ وہ عالم ہے اور
معلومات عین ذات ہیں"[1]

اور اب محویں ہوتا ہے کہ مخلوق صرف معلوم نہیں بلکہ عینِ ذات کی غیر بھی ہے۔ اس کے باوجود ذاتِ باری مخلوق کے آئینے میں جلوہ افروز ہے کیوں کہ وہ ہر چیز پر محیط ہے اسی لیے جب عارف پر انکشافِ ذات کا مرحلہ آتا ہے تو وہ فنا فی اللہ کی منزل میں داخل ہوتے ہوئے کثرت کے جلووں سے آگے بڑھ کر دیدار کے درجہ میں پہنچ جاتا ہے۔ اصغر گونڈوی کے اس شعر

---

[1] ۔ پروفیسر مغنی تبسم۔ "تحسین منظر" روزنامہ سیاست بتاریخ ۱۸/جنوری ۱۹۹۹ء

مغنی تبسم نے جو کچھ لکھا ہے اُسے پڑھ کر ایک طرف تو امغر گونڈوی کے مزاج کو سمجھنے کا موقع ملتا ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ صاحبِ حال صوفی کے نزدیک ادائے جلوہ میں بھی شانِ مستوری دیکھی جا سکتی ہے۔ اگر وہ غریت کو ہٹا کر دوئی کو مٹا کر اپنے آپ کو یا اپنی ذات کو ذاتِ کل میں اس طرح جذب کر دیں کہ درمیان میں فاصلہ نہ رہے

شعر کی تفہیم کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ لفظ کے واسطے سے تشبیہ کی نکتہ آفرینی پر غور کیا جائے اُس کیفیت کو محسوس کیا جائے جو شعر کو پڑھنے کے بعد قاری پر ایک طرح سے نازل ہونے لگتی ہے۔ سودا اردو کے ایک بہت ہی اہم شاعر ہیں۔ امراپنے دور کے مزاج کے مطابق ان کے ہاں بھی تصوف زیریں لہروں کی طرح موجزن ہے مغنی تبسم شعر کے واسطے سے بننے والے پیکر محسوس کرتے ہیں۔ لفظ کے مختلف رُخ ان کے سامنے عیاں ہوتے ہیں اور پھر جب وہ دوسرے اہم شعراء کی تخلیقات کو سامنے رکھ کر سودا کا شعر پڑھتے ہیں تو بات خود بہ خود کھلتی چلی جاتی ہے۔ فانی مغنی تبسم کے محبوب شاعر ہیں۔ مغنی تبسم کا پی۔ ایچ ڈی کا مقالہ بھی فانی بدایونی پر ہی ہیں اور انھوں نے بہت واضح انداز میں مثالیں دیتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ فانی جز کل کے قائل تھے۔ چنانچہ اس شعر میں بھی یہی کیفیت ہے۔ شعر یوں ہے

چاہوں بھی اور یہ منہ سے چاہا انھیں کا چاہوں
دل سے دعا بھی نکلے، دل نرا ہو بھی نہ نکلے

مغنی تبسم کی حرکیات پر گہری نظر اور غنائیت کے ادراک نے چاہوں چاہا چاہوں کی تکرار سے پیدا ہونے والے حرکی حسن کو بھی واضح کیا ہے۔ ایسا ہنر ہے کہ مغنی تبسم نے صرف تصوف

کے نظریے سے ہی شعر کو سمجھنے کی کوشش کی ہر حسن کے شعر کی تشریح کرتے ہوئے انھوں نے حسن ادا اور لطفِ خاص کی کیفیات پر بھی اظہارِ خیال کیا ہیں۔ شعر اس طرح ہے

جس ادا کا کشتہ ہوں میں وہ رہے میرے ہی ساتھ
اس ادا کو مبتذل لے خوب رومت کیجیو

اور مغنی صاحب نے ادا کے موضوع پر اس شعر کو بے مثل قرار دیتے ہوئے بتایا ہے کہ جس ادا کا عاشق گرویدہ ہے وہ نہیں چاہتا کہ وہ ادا کسی اور کے سامنے بھی آئے۔ کیوں کہ اس طرح اُس میں عامیانہ پن آسکتا ہے۔ مغنی تبسم نے صرف اساتذہ کے اشعار پر ہی اظہارِ خیال نہیں کیا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ جس شعر میں اُن کے ذہن کو جھنجوڑا انھوں نے اس شعر پر قلم اٹھایا اور وہ کیفیات ضبطِ تحریر میں لے آئے جو عام قاری کی دسترس میں نہیں ہوتے۔ حیدرآباد کے ایک شاعر ہیں ذکی بلگرامی تحسین شعر کا ایک معمون ذکی بلگرامی کے اس شعر پر ہیں۔

آنگن میں لوٹتی ہوں آں ساعت سبک
سب کچھ سمیٹ کر مرے گھر سے نکل گئی

وہ بتاتے ہیں کہ ساعتِ جدائی گھر کی ساری رونق سمیٹ کر گھر سے نکل جاتی ہے۔ اسی طرح عرفان صدیقی کا یہ شعر پڑھ کر مغنی تبسم الف لیلیٰ کی داستان کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ شعر یہ ہیں۔

صبح تک جینا تھا ہم نے بات کو کیا کیا طول دیا
اگلی رات کو پھر سوچیں گے اگلا موڑ کہانی کا

شاعر نے الف لیلیٰ کی سلسلہ وار کہانی کے پس منظر میں اچھے دل کی بات کہی ہے۔ الف لیلیٰ میں شہر یار پوری

کہانی سننے کی خاطر ملکہ کو قتل نہیں کرتا اور اس طرح اس
کو مزید ایک رات مل جاتی ہے اور اس طرح کہانی کا
سلسلہ ہزار راتوں تک چلتا ہے ۔ مغنی تبسم نے بتایا ہے کہ
انسان کے لیے بھی یہ ضروری ہے کہ وہ شہزادی کی طرح اپنی
کہانی کو آگے بڑھاتا رہا ۔ اور ہر گذرنے والے دن کے ساتھ
کہانی کے اگلے موڑ پر غور کرتا رہے ۔ تین شعر کے بعض
مضامین میں مغنی تبسم نے مختلف شعرا کے ایک دو یا تین
اشعار کو لے کر بھی توضیحات پیش کی ہیں ۔ پچھلے کئی دن سے
تین شعر کا یہ سلسلہ رُکا ہوا ہے اس کی وجہ مغنی تبسم
کی صحت اور گوناگوں مصروفیات ہیں لیکن اس سلسلے کے
جتنے مضامین ہیں وہ قاری کو نئے جہانوں سے آشکار کرتے ہیں ۔
اور اس کے سامنے مفاہیم کی ہتیں ایک کے بعد ایک کھلتی جاتی ہیں۔
ایک شعر کے بارے میں بات کرتے ہوئے مفہوم کو واضح کرتا ہوا
کسی اور شاعر کا دوسرا ایسا ہی شعر پیش کرنا جو اصل شعر کی
روح کو کھول دے کوئی آسان کام نہیں ہے اس کے لیے نہ صرف
وسیع مطالعہ درکار ہوتا ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ مستحضر
حافظہ بھی ضروری ہے ۔ مغنی تبسم کے ہاں یہ دونوں چیزیں
اپنی پوری تابناکی کے ساتھ موجود ہیں اور پھر یہ بھی ہے کہ
وہ استاد ہونے کی وجہ سے تفہیم کا ایسا طریقہ اختیار کرتے ہیں
کہ سننے یا پڑھنے والا ان کی انگلی پکڑ کر بطنِ شعر میں
داخل ہونے کا مکلف ہو جاتا ہے بیش تر اہلِ ذوق اپنی ایک
بیاض رکھتے ہیں جس میں وہ اپنی پسند کے اشعار درج
کرتے چلے جاتے ہیں مغنی تبسم بھی اس شوق سے بری نہیں ہیں اُن
کی بھی یہ عادت ہے کہ جو شعر اُن کے دل کو چھو لیتا ہے وہ

اُسے اپنی بیاض میں درج کرلیتے ہیں یہ اشعار جن کو تحسین شعر کے لیے منتخب کیا گیا وہ مغنی تبسم کی ذاتی بیاض میں موجود ہیں اور وہ مختلف اوقات میں ان اشعار پر غور کرتے رہے ہیں لیکن انھوں نے اپنے اس تجربے کو اپنی ذات تک محدود رکھنے کی بجائے ضبط تحریر میں لاکر اُردو کے ہر قاری کو یہ موقعہ بخشا کہ وہ خود بھی اپنے طور پر شعر کی اتاہ گہرائیوں میں شناوری سے لطف اندوز ہو۔

"میری بیاض سے"

جیسا کہ اوپر لکھا گیا مغنی تبسم کے مطالعے میں کوئی ایسا شعر آجاتا ہے جو اُن کے ذہن و دل میں تموج پیدا کردے وہ ایسے اشعار کو ایک بیاض میں لکھ لیا کرتے ہیں روزنامہ سیاست کے ارباب حل وعقد کی فرمائش پر انھوں نے میری بیاض کے عنوان سے ایک سلسلہ شروع کیا تھا یہ بات طے ہے کہ قاری کو جو شعر پسند ہے وہ کسی سطح کا کیوں نہ ہو وہ اُسے پسند آتا ہے جو اُس کی مزاج سے مطابقت رکھتا ہے۔

غالبؔ نے کہا تھا میں نے یہ جانا گویا یہ بھی میرے دل میں ہے اور جب دل کی بات سامنے آتی ہے تو وہ اپنا اثر بھی دکھاتی ہے سیاست کے ذمہ داروں کی فرمائش پر انھوں نے جو سلسلہ شروع کیا تھا وہ بے حد مقبول ہوا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی محسوس کیا گیا کہ کیوں نہ مغنی تبسم سے ان اشعار کی گرہیں کھولنے کے لیے کہا جائے اور اس طرح تحسین شعر کا سلسلہ شروع ہوا۔ اور جب ہم میری بیاض سے اور تحسین شعر کے سلسلوں کو پڑھتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ مغنی تبسم کی نظر کس قدر دور رس ہے کہ وہ لفظ کے پیچھے چھپی ہوئی

پرچھائیوں کے پیکر تلاش کر کے امراہیں نہایت کامیابی سے
متشکل کر دیتے ہیں۔ شاعر کا تصوّر لفظوں میں ڈھال کر وہ
قاری کو وضاحت کی نئی دنیا میں لے جاتے ہیں۔ یہ سلسلہ
ایک طرح سے تربیت کا کام بھی کرتا ہے۔ چنانچہ یہ دیکھا گیا ہے کہ
کئی قارئین نے ان اشعار کو اور ان کی تحسین پر لکھے گئے
مضمون کو پڑھ کر تفہیم کی نئی راہیں معلوم کیں اور اس سفر پر
نکل پڑے جہاں معنی تبسم لے جانا چاہتے ہیں۔

نذرِ مغنی تبسّم

پروفیسر مغنی تبسّم کی شخصیت محتاج تعارف نہیں انھوں نے اپنی ساری زندگی اردو کی خدمت کے لیے صرف کردی ہیں اور آج بھی وہ ادارۂ ادبیاتِ اردو میں ہمہ تن خدمات انجام دے رہے ہیں۔ آج اردو دنیا کو اُن پر ناز ہے۔ ان کے شاگرد ان کی خدمات کا اعتراف کرنا چاہتے تھے لیکن انھوں نے کبھی دکھاوے کو پسند نہیں کیا۔ وہ جو بھی کام کرتے ہیں خاموشی سے کر گذرتے ہیں۔ انھوں نے ملک اور بیرونِ ملک اپنی قابلیت کا سکّہ منوالیا ہے۔ جو ان کا ایک وسیع مطالعہ ہے جس میں وہ ہمہ وقت لگے رہتے ہیں۔ کافی ذہین انسان ہیں۔ بیگ احساس نے جب بھی ان سے اعترافِ خدمات کے سلسلے میں بات کی انھوں نے سختی سے منع کردیا۔ لیکن حمایت اللہ اور ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ مسلسل کوشش کرتے رہے۔ پھر حمایت اللہ نے آخر اپنی کرامت دکھائی کہ مغنی تبسّم کی (۵۰) سالہ ادبی خدمات پر اعتراف کے لیے دو روزہ سمینار ۲۶ / ۲۷ فروری بہ مقام غالب اکیڈمی حیدرآباد میں منعقد کیا گیا اور ایک سوونیر بھی جاری کی گئی۔ جس کا افتتاح محترمہ راج کماری اندرا دھن راج گیر نے انجام دیا۔ اور صدارت کے فرائض ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے انجام دیئے۔ مہمانانِ خصوصی میں پروفیسر جعفر نظام، پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی، پروفیسر عبدالستار دلوی، پروفیسر شہریار، ڈاکٹر حمید اللہ بھٹ، جناب مجتبیٰ حسین اور جناب انتظار نعیم شامل تھے۔ نواب شاہ عالم خاں صاحب نے استقبالیہ کمیٹی کی صدارت قبول فرمائی۔ تینتی نظمیں پروفیسر شہریار اور ڈاکٹر ملزم الفاری نے پیش کیں۔ جناب مجتبیٰ حسین نے مغنی تبسم پر خاکہ پیش کیا اور خطبۂ صدارت ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے کی۔ شکریہ کے فرائض پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے انجام دیئے۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر بیگ احساس کے ذمہ تھے۔ اس جلسے کے معتمدین میں محمد حمایت اللہ اور مرزا اکبر علی بیگ شامل ہیں۔

شب نغمہ جمعہ ۲۶ / فروری ۱۹۹۹ء کو ۸ بجے شب نمائش کلب میں انجام پائی۔ جس کی صدارت نواب شاہ عالم خاں صاحب نے پروفیسر حبیب ضیاء کنوینر تھیں

ادبی اجلاس بہ روز جمعہ ۲۷ فروری ۱۹۹۹ء

10:30 صبح نمائش کلب میں ہی منعقد ہوا۔ مجلس صدارت میں پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی، پروفیسر شیو کے کمار، پروفیسر انور معظم، پروفیسر لئی علی مرزا شامل ہیں۔ مقالہ نگاروں میں پروفیسر عبدالستار دلوی، پروفیسر اشرف رفیع، جناب مضطر مجاز، جناب خالد قادری اور ڈاکٹر بیگ احساس شامل ہیں۔ ان اصحاب کے مقالوں سے مغنی تبسم کی شخصیت، شاعری، تنقید کی صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ محققانہ رویہ اور دیگر سرگرمیوں پر بھرپور جائزہ ملتا ہے اور ان کی زندگی اور ادبی خدمات کے گوشے کھلتے ہیں۔

اس ادبی اجلاس کے دوسرے سیشن کی مجلس صدارت میں پروفیسر آئزک سکویرا، پروفیسر سید سراج الدین، پروفیسر عبدالستار دلوی، جناب رمن راج سکینہ شامل ہیں۔ اور مقالہ نگاروں میں پروفیسر یوسف سرمست، پروفیسر سلیمان اطہر جاوید، پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ، پروفیسر رحمت یوسف زئی اور جناب اقبال متین شامل تھے۔ اس سیشن کے کنوینر ڈاکٹر بیگ احساس تھے۔ اس شب مشاعرہ کا انعقاد عمل میں آیا جس کی صدارت پروفیسر شہریار کے ذمہ تھی۔ اس مشاعرہ کے کنوینر طالب خوندمیری تھے۔

اعتراف خدمات کمیٹی کی تجویز کے مطابق طے پایا کہ "نذر مغنی تبسم" کی اشاعت عمل میں لائی جائے۔ پروفیسر سلیمان اطہر جاوید کی کافی تگ و دو اور کدوکاوش کے بعد یہ کتاب جولائی ۲۰۰۰ء کو شائع ہوئی۔ جو ہر زاویے سے جامع اور مستند ہے۔ اس کتاب

کے معاونین اسامہ فاروقی اور جعفر جری ہیں۔ پروفیسر سلیمان اطہر جاوید نے اس کتاب کو مرتب کرکے نئی نسلوں کا نام ممنون کیا ہے۔

"نذرِ مغنی تبسم" اور شعروحکمت دورِ سوم کتاب ایک کی رسم اجراء ایک ہی ساتھ ۳۰ / جولائی ۲۰۰۰ء کو بہ روز اتوار ساڑھے دس بجے دن بہ مقام ہزو آڈیٹوریم مدینہ ایجوکیشن سنٹر ناملی، حیدرآباد میں عمل آئی۔ اس جلسے کی صدارت پروفیسر شیو کے۔ کمار نے کی اور "نذرِ مغنی تبسم" کا اجرا جناب شاہد مہدی والی چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ شعروحکمت کا رسم اجرا جناب مجتبیٰ حسین نے انجام دیئے۔ مہمان خصوصی جناب زبیر رضوی اور پروفیسر لطف الرحمٰن شامل تھے۔ پروفیسر سلیمان اطہر جاوید نے خیر مقدم کیا اور نظامت کے فرائض ڈاکٹر بیگ احساس نے انجام دیئے۔ محفل موسیقی میں سنگیت سادھنا انسٹی ٹیوٹ آف میوزک کے فن کاروں نے پرمغنی تبسم کی غزلیں پیش کیں۔ اسی روز ساڑھے چھ بجے شام مشاعرہ عمل میں آیا جس کی صدارت پروفیسر شہریار کی اور مہمانانِ خصوصی میں جناب لطف الرحمٰن جناب نفیس غازی پوری تھے۔ نظامت کے فرائض اسلم مرزا نے انجام دیئے۔ اس جلسے کے کنوینر محمد حمایت اللہ تھے۔

اس کتاب کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں گذشتہ اعزاز خدمات کا جائزہ شامل ہیں پروفیسر بیگ احساس نے اعزازِ خدمات کی رپورتاژ پیش کی۔ اس کے بعد کے ابتدائی اوراق میں مغنی تبسم کے بچپن سے تا حال تصویریں پیش کی گئی ہیں۔ ان تصاویر میں ان کے افرادِ خاندان بھی شامل ہیں تصاویر کا یہ گوشہ بھی دیدنی ہے۔

دوسرے حصے میں بے حد اہم مقالے ہیں جو ہمارے
کلاسیکی ادب کی بہترین تفہیم و تنقید پر مبنی ہیں ۔ جملہ (۱۳)
مقالے ہیں ان میں سید ہاشم علی اختر کا مقالہ باقیات جو یاد رہ گئیں ۔
تقسیم ہند اور ہندو مسلمان ۔ پروفیسر گیان چند جین کا مقالہ
قدیم اردو میں ہندی اور فارسی کی آویزش ، پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی
کا مقالہ اٹھارویں صدی ـــــ نئے زمانے ، نئی ادبی تہذیب ،
پروفیسر گوپی چند نارنگ کا مقالہ جدید نظم کی شعریات پر نظر ثانی
کی ضرورت ، پروفیسر آلیزک مسکویرا کا مقالہ دارا یوفو ۱۹۹۷ ،
پروفیسر تقی علی رضا کا مقالہ ہندوستان کا انگریزی ناول ـــ
نئے رجحانات ، افتخار نسیم کا مقالہ امریکہ میں گے لبریشن موومنٹ ،
پروفیسر سید سراج الدین کا مقالہ اقبال ـــ ایک زاویہ ، ڈاکٹر ضیاالدین شکیب
کا مقالہ محمد قلی کی ایک غزل ، ڈاکٹر محمد علی اثر کا مقالہ گجری اردو ،
ڈاکٹر رحمت علی خاں کا مقالہ کتب خانہ سالار رنگ میرزم کے
نادر و نایاب مخطوطات ، ڈاکٹر نسیم الدین فریس کا مقالہ ولی اورنگ آبادی
جدید تحقیق کی روشنی میں اور ڈاکٹر داؤد اشرف کا مقالہ
مولانا عبدالماجد دریابادی ـــ ریاست حیدرآباد کی قدردانی شامل ہیں ۔
ان مقالوں سے

سہیل انجم کے مطابق ،
یہ مضامین اردو زبان و ادب کی بزرگ
و معتبر شخصیات کے قلم سے نکلے ہیں اور
ایک طرف مختلف قسم کی شخصیت کے مختلف گوشوں کو منور کرتے ہیں

تو دوسری طرف معاصر ادب پر بھی
روشنی ڈالتے ہیں ۔ اس طرح کے گلدستوں

کی روایت اردو میں نئی نہیں مالک
رام نذر مختار اور نذر عابد وغیرہ
مرتب کر چکے ہیں اور دوسرے بزرگوں
نے بھی اس طرح کے گلدستے مرتب کیے ہیں
اور نذر مغنی تبسم بھی اس سلسلے کی
ایک کڑی ہے ۔ ان گلدستوں کا
سب سے مثبت پہلو یہ ہے کہ ان میں
اچھے ادبی و تنقیدی مضامین یکجا کیے
ادب سے متعلق بھی شامل کر دیے جاتے ہیں
اس طرح یہ کتاب ایک شخص
یا ایک عہد سے ہی مخصوص و محدود
نہیں رہ جاتی ۔ یہ نذر مغنی تبسم کا
بھی نمایاں وصف ہے ''[1]

تیسرے حصے میں مغنی تبسم کی شخصیت سے متعلق
مضامین شامل ہیں جس کا آغاز راحمۃ الحروف (شاہد قلیم)
کے تومتیت نامہ سے ہوتا ہے جس سے مغنی تبسم کی سوانح 'مجمل' ہی یک
نظر سامنے آتی ہے ۔ اس کے بعد یوسف ناظم، مجتبیٰ حسین،
عوض سعید، پروفیسر گیان چند جین، اقبال متین، پروفیسر لطف الرحمٰن،
ڈاکٹر بیگ احساس، قدیر زماں، ڈاکٹر رفعت النسا بیگم، سید
خالد قادری، رحمن جامی، انیس پروین، ڈاکٹر عطا اللہ،
محمد خیر الدین اور ایک ادب دوست کے مضامین شامل ہیں ۔
ان مضامین سے مغنی تبسم کی شخصیت کے مختلف گوشے سامنے آتے ہیں ۔

---

[1] ۔ سہیل انجم ۔ تبصرہ :۔ نذر مغنی تبسم'' اردو بک ریویو ۔ مارچ، اپریل ۲۰۰۲

اس حصّے میں مغنی تبسم کے تنقیدی، تحقیقی اور شاعری کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔ تنقیدی دبستان میں ہرمندر سلیمان اہل جاوید، پروفیسر اشرف رفیع، پروفیسر گیان چند جین، ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ، رام پرکاش راہی، پروفیسر یوسف سرمست، پروفیسر انورالدین، ڈاکٹر نامرہ خانم کے ڈاکٹر محمد علی اثر کے مضامین شامل ہیں۔ ان مضامین سے مغنی تبسم کی ناقدانہ شخصیت اجاگر ہوتی ہے۔

"نذر مغنی تبسم" پر تبصرہ کرتے ہوئے سہیل انجم اس طرح رقمطراز ہیں:

"اسلوبیاتی تنقید کے اولین بنیاد گزاروں میں مغنی تبسم بھی شامل ہیں۔ جدید غزل و جدید نظم گوئی کی حیثیت سے بھی وہ بے حد اہم ہیں ان کی خدمات کا دائرہ تو یقیناً لفظ حدیث پر محیط ہے"[1]

بہ حیثیت شاعر مغنی تبسم پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ جس سے ان کی شاعری کے تین مجموعے "نوائے تلخ"، "لفظوں سے آگے" اور "مٹی میرا دل" کا بھرپور جائزہ لیا گیا ہے۔

سہیل انجم کے مطابق:

"مغنی تبسم کا شمار صف اول کے جدید شعرا میں ہوتا ہے ان کے مداحوں کا حلقہ کافی وسیع ہے"

---

[1] سہیل انجم۔ تبصرہ "نذر مغنی تبسم"، اردو بک ریویو مارچ اپریل ۲۰۰۲ء

ان کی شاعرانہ حیثیت مسلم ہے اور
ناقدانہ بصیرت میں بھی کلام نہیں
فانی کی شخصیت اور فن پر انہوں نے
جس سنجیدگی، محنت اور لگن سے
کام کیا ہے وہ ان ہی کا حصہ ہے۔
فانی ہماری جدید غزل کے علمبرداروں
میں بے حد اہم ہیں لیکن افسوس فانی
کو ان کا جائز مقام نہ مل سکا۔
یگانہ کو معاصرانہ چشمک لگ گئی
اور فانی کو جوش کی ہیولۂ عالم اور
امام یا سیلف والی پھبتی "۔[1]

شخص اور شخصیت کے باب میں مغنی تبسم کی مختلف تحریریں جو مختلف ملک اور بیرون ملک خطبات، تقاریر، مشاعرے، ادبی اجلاس، بابل ریڈی فاؤنڈیشن ایوارڈ، شہر حیدرآباد کے چار سو سالہ جشن پر اردو کی خدمات انجام دینے والوں کے ساتھ، ایک شام مغنی تبسم کے نام، زندہ دلان شکاگو، بنگلور اردو اکیڈیمی سمینار، شعبۂ اردو میسور یونیورسٹی، بزم اردو عالمی مشاعرہ امریکہ، عوض سعید کے ساتھ ایک شام امیر خسرو عالمی کانفرنس کا مشاعرہ، ساہتیہ اکیڈیمی ٹرانسلیشن ورکشاپ وغیرہ پر مختلف تصاویر قابل دید ہیں۔

اس کتاب کے پوتھے باب میں مغنی تبسم کے نام ادیبوں دوستوں اور اعزہ کے جملہ (۵۴) خطوط شامل ہیں۔

---

[1] ۔ سہیل انجم۔ تبصرہ۔ "نذر مغنی تبسم" اردو بک ریویو مارچ، اپریل ۲۰۰۲ء

ان خطوط میں رشید احمد صدیقی، میکش اکبر آبادی، مسعود حسین خاں، ن۔م راشد، جمیل جالبی، آل احمد سرور، سکندر علی وجد، گوپی چند نارنگ، شمس الرحمٰن فاروقی، مبارز الدین رفعت، سلیمان اریب، وحید اختر، جگن ناتھ آزاد، ساحر لدھیانوی، وزیر آغا، جوگیندر پال، خواجہ حمید الدین شاہد، مشفق خواجہ، زبیر رضوی، وارث کرمانی، عمیق حنفی، ساقی فاروقی، محمود ایاز، اقبال متین، شہریار، حمایت علی شاعر، اکبر حیدرآبادی، رفعت سروش، نجم الثاقب شمس، ناصر بغدادی، نیر مسعود، تابش دہلوی، محمد علوی، اقبال ٹھکر، آزاد گلاٹی، عبدالستار دلوی، قدیر زماں، جعفر جبری، شاہد احمد، اوم پرکاش بجاج، انور قمر، مائیکل ایس ڈیوک کے علاوہ عبدالغنی صاحب (والد محترم)، حبیب حیدرآبادی (برادر نسبتی)، صدیقہ شبنم (ہمشیرہ) اور رضیہ بیگم (ہمشیرہ) کے خطوط شامل ہیں۔

پانچویں باب میں مغنی تبسم کی منتخب تنقیدی مضامین، نظمیں اور غزلیں شامل ہیں۔ ان مضامین میں اردو عروض کا مطالعہ عرتیاتی نقطہ نظر سے، قافیہ، تبصروں میں ہند — آریائی اور ہندی، محمد تقی میر کی خودنوشت مواخ، جاں نثار اختر کا مجموعۂ کلام "پچھلے پہر"، آسمان میرا کمیں گاہ ہیں، آمنہ ابوالحسن کا نیا ناول، تحسین شعر کے حصے ہے ولی اورنگ آبادی، میر تقی میر، مرزا غالب، فیض احمد فیض، سلیم احمد، شان الحق حقی کے اشعار پر تشریح شامل کی گئی ہیں۔ نظموں کے انتخاب میں

(۱۶) نظموں کو منتخب کیا گیا اور غزلیات میں (۳۱) غزلیں
شامل کی گئی ہیں۔

نگاه بازگشت

حیدرآباد صدیوں سے ہی ادبی اور علمی میدان میں اپنی اہمیت ثابت کرتا رہا۔ چنانچہ اردو کی بیشتر اصناف کے ابتدائی نمونے ہم کو دکن ہی میں ملتے ہیں بلکہ یوں کہاں جائے تو شاید غلط نہ ہوگا کہ اردو سے متعلق ہر بڑا کام دکن اور خاص کر حیدرآباد کا مرہونِ منت ہے۔ اسی حیدرآباد کی بہت ہی اہم اور علمی شخصیت کا نام مغنی تبسم ہے جو اردو کے استاد ہونے کے علاوہ ایک بہت ہی اچھے جدید نقاد شاعر ادیب مدیر کی حیثیت سے عالمی شہرت کے حامل ہیں جب اردو تنقید کا ذکر آتا ہے تو مغنی تبسم کے نام سے صرفِ نظر کرنا کسی کے لیے ممکن نہیں ہے۔ اتنی ہمہ جہت شخصیت کے بارے میں معلومات کی شیرازہ بندی کرنا اس کا تجزیہ کرنا اور پھر اسے مبسوط انداز میں لکھنا آسان نہیں ہے۔

مغنی تبسم ایک بہت ہی انوکھے اور منفرد مزاج کے حامل ہیں۔ تنوع ان کی فطرت میں کوٹ کوٹ کر بسا ہے ان کی سوچ زمانے کی رفتار کے ساتھ چلتی ہے بلکہ یوں کہا جائے تو شاید غلط نہ ہو کہ وہ زمانے سے آگے چلتے ہوئے زمانے کو اپنے پیچھے چلنے پر مجبور کرتے ہیں۔ اردو میں جدیدیت کو روشناس

کرانے کا سہرا میرے خیال میں مغنی تبسم ہی کے سر جاتا ہے انھوں نے اُس وقت جدیدیت اور نئے مزاج کی بات کی جب اردو میں اس طرح کا کوئی تصور نہ تھا۔ البتہ حلقہ ارباب ذوق سے وابستہ کچھ شعرا نے نئے تیور اختیار کیے تھے لیکن وہاں بھی سے محسوس ہوتا تھا کہ یہ ترقی پسندی سے الگ رجحان کی حیثیت دی۔

بہ حیثیت شاعر مغنی تبسم نے جو کچھ لکھا وہ نہ صرف ادبی نقطہ نظر سے اہمیت کا حامل ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ فکری اور فلسفیانہ پہلو سے غور کیا جائے تو مغنی تبسم کی شاعری اردو شاعری میں ایک ممتاز مقام کی حامل نظر آتی ہے۔ مغنی تبسم کا لہجہ کچھ سرگوشی کا سا ہے۔ دھیمے دھیمے آہنگ سے متصف اُن کے اشعار دل کی گہرائیوں میں اترتے ہیں اور ذہن کو متاثر کرتے ہیں۔ تجسیم حنفی مغنی تبسم کے مطالعہ میں "مغنی تبسم شاہدات اور واقعات کے بجائے کیفیتوں کے شاعر ہیں اور یہ خصوصیت اردو کے بہت کم شعرا کو مل پائی ہے ایسا نہیں ہے اُن کے ہاں عشق کا جذبہ نہیں انھوں نے اپنے واردات قلبی کو لفظوں کا روپ دے کر اداسی کرب ناکی اور شدت احساس سے کچھ اس طرح جوڑ دیا کہ ان چیزوں کو الگ کرنا ممکن نہیں۔ نظم کے میدان میں بھی مغنی تبسم نے اپنی اہمیت ثابت کی ہے پابند آزاد اور نثری نظموں کے علاوہ انھوں نے گیت بھی لکھے اور ہندوستانی تہذیب اور ہندی زبان سے اپنی بھرپور واقفیت کا ثبوت بہم پہنچایا۔ شاعری کا تجزیہ کیا جائے تو مغنی تبسم کی شاعری کئی ادوار میں منقسم نظر آتی ہے۔ مذہب، تصوف، اقبال کا تتبع ترقی پسندی جدیدیت سے گذرتے ہوئے ما بعد جدیدیت تک اُن کا سفر اردو شاعری میں نئی منزلوں کا پتہ دیتا ہے۔ اور ساتھ ہی مغنی تبسم کے نظریۂ فن کا اندازہ ہوتا ہے۔ جدید شعرا کے یہاں ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ وہ فن سے قدرے بے پرواہ ہوتے ہیں لیکن مغنی تبسم کے ہاں فن اپنی پوری

پوری ذمہ داریوں کے ساتھ نظر آتا ہے۔ عروضی سطح پر ہو یا بلاغت
وہ بیان کے سطح پر مغنی تبسم ان تمام مسائل سے بخوبی واقف ہیں اور اس
کا پرتو بھی ہمیں جا بجا نظر آتا ہے۔

بہ حیثیت نقاد مغنی تبسم نے اردو دنیا میں اپنے آپ کو منوایا
اور اس طرح منوایا کہ آج اردو تنقید کا ذکر آئے تو مغنی تبسم کا نام آنا لازمی
ہے اُن کے مضامین کا پہلا مجموعہ "بازیافت" اگرچہ نومجری کا ہے۔ لیکن تنقید
کے میدان میں ان کی جولانی اُسی زمانے سے محسوس کی جاسکتی ہے۔

لیکن نقاد مغنی تبسم فانی بدایونی حیات شخصیت اور شاعری کا تنقیدی
مرقعے میں کھل کر سامنے آتے ہیں جہاں انھوں نے لسانیات، صوتیات،
اسلوبیات، عروض بیان، فلسفہ وغیرہ جیسے پیچیدہ طریقے کار کو اختیار
کر کے فانی کی شاعری کا تجزیہ کیا۔ اور اسی گہرائی سے کیا کہ ان کا یہ تجزیہ حرفِ
آخر بن گیا۔ سچ بات تو یہ ہے کہ اس نوعیت کی تنقیدی کتاب بہت کم لکھی
گئی۔ اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ لسانیات سے اردو والے گریزاں
رہتے ہیں چاہے کہ وہ لسانیاتی طریقہ کار استعمال کر کے کسی شاعر کے کلام
کا تجزیہ کریں۔

بحیثیت مدیر مغنی تبسم کی خدمات بے حد اہم ہے شبستانِ ادب،
شعور، صبا، سب رس، شعر و حکمت یہ سارے رسالے ایسے ہیں جن سے
اردو کا ہر طالب علم واقف ہے۔ اور اُن کی اہمیت کا قائل بھی ہے مشمولات
ترتیب انتخاب، غرض ہر شعبہ میں مغنی تبسم کے سلیقے اور بصیرت کے
نمونے محسوس ہوتے ہیں۔

بہ حیثیت استاد مغنی تبسم نے برسوں جامعاتی اور پوری لگن اور
دلچسپی سے اپنے علم کو شاگردوں تک منتقل کیا۔ اساتذہ کے بارے میں یہ
بات عام طور پر کہی جاتی ہے کہ وہ جدید علم سے بہرہ ور نہیں ہوتے۔

سب اُسی پہ اکتفا کرتے ہیں جو انھوں نے اپنے زمانہ طالب علمی میں حاصل کیا تھا جب کہ ایک اچھے استاد کے لیے یہ ضروری ہوتا ہے کہ وہ تازہ ترین معلومات سے لیس رہے مغنی تبسم میں یہ خصوصیت بدرجہ اتم موجود ہے وہ زمانہ قدیم سے لے کر آج تک ہر تحریک سے واقف ہیں اور اُس پر گہری نظر رکھتے ہیں

مغنی تبسم کی شاعری اور تنقید کو پڑھتے ہوئے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اُن کی ذات میں شاعر اور نقاد کچھ اس طرح سمائے ہوئے ہیں کہ ان دونوں کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا اور یہ خوبی انھیں ایک ایسا مقام عطا کرتی ہے جو بہت کم ناقدین کو حاصل ہے۔

مغنی تبسم کا تنوع پسند مزاج انھیں ہر بار نئی راہوں سے ہم کنار کرتا رہا ہے۔ اور نئی راہوں کا یہ سفر کوئی آج کی بات نہیں ہے۔ مغرب میں تنقید کی سو خات پر کوئی کتاب چھپتی ہے تو وہ مغنی تبسم کی نگاہ دور بین سے بچ نہیں سکتی۔ وہ اس کتاب کو کسی طرح حاصل کرتے ہیں اور جب تک اسے پڑھ نہیں لیتے انھیں چین حاصل نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ مغنی تبسم جدید سے جدید تر تنقیدی نظریات سے کماحقہ آگہی رکھتے ہیں۔ مغنی تبسم کی مجموعی خدمات کا احاطہ کرنا آسان نہیں ہے۔ ان کی ادبی شخصیت کے اتنے پہلو ہیں کہ ہر پہلو پر ایک الگ کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ نقاد، شاعر، ادیب، مترجم، صحافی، مدیر، منتظم، استاد، خطیب ان تمام حیثیتوں میں وہ کمال کا درجہ رکھتے ہیں۔

آج کے اس دور ابتلا میں جب اردو والے شدید احساس کمتری میں مبتلا ہیں مغنی تبسم اپنی قوت سے اردو کے کاز کو آگے بڑھانے میں شب و روز منہمک ہیں اور شاید ہی کوئی ایسا دانشور ہو جو ان کے ہمہ جہت مزاج کی برابری کر سکے۔

توقیت نامہ

پیدائشی نام : محمد عبدالمغنی

قلمی نام : مغنی تبسّم

تاریخ پیدائش : ۱۳ / جون ۱۹۳۰ء (آبائی مکان شکرکوٹھ)

والد کا نام : محمد عبدالغنی صاحب

پیشہ : ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ وسب جج

والدہ کا نام : حلیمہ بیگم صاحبہ

ابتدائی تعلیم : مدرسہ تحتانیہ چیلاپورہ، مدرسہ تحتانیہ جوگی پیٹ،
مدرسہ تحتانیہ یلّا ریڈی، مدرسہ وسطانیہ اُردو شریف حیدرآباد۔
مدرسہ فوقانیہ میدک۔

میٹرک : دارالعلوم ہائی اسکول (۱۹۴۶ء)
مضمونِ اختیاری : اعلیٰ ریاضی

انٹرمیڈیٹ : دارالعلوم کالج (۱۹۴۸ء)
مضامینِ اختیاری : اُردو، فارسی اور معاشیات

بی۔ اے : جامعہ عثمانیہ (۱۹۵۰ء)

مضامین : اُردو، سیاسیات اور معاشیات

ایم۔ اے (اُردو) : جامعہ عثمانیہ (۱۹۵۲ء)

ایم۔ اے (فارسی) : جامعہ عثمانیہ (۱۹۶۱ء)

پی۔ ایچ ڈی : جامعہ عثمانیہ (۱۹۶۲ء)

عنوان : "فانی بدایونی، حیات شخصیت اور شاعری"

نگران : پروفیسر مسعود حسین خاں

شادی : ۲۳/ اپریل ۱۹۵۱ء کو میر احمد علی خاں کی صاحب زادی اختر جہاں شاہین سے ہوئی۔

اولاد : دو لڑکے ایک لڑکی :

۱۔ محتشم نوید ۲۔ معتصم نجیب ۳۔ اسریٰ بتول

دوسری شادی : ۱۲/ ستمبر ۱۹۷۶ء کو قاضی معین الدین صدیقی صاحب کی صاحب زادی ناز صدیقی مرحومہ سے ہوئی۔

اولاد : دو لڑکیاں

۱۔ دیبا حشم ۲۔ دینا حلیمہ ناز

ناز صدیقی کی وفات : 9/ مئی ۱۹۸۲ء

ملازمت : ۱۹۵۲ء کیٹلیگر عثمانیہ یونیورسٹی لائبریری

۱۹۵۳ء تا ۱۹۵۵ء یو ڈی سی، اے جی آفس، حیدرآباد

۱۹۵۵ء تا ۱۹۵۷ء حیدرآباد ایوننگ کالج، سکندرآباد آرٹس اینڈ سائنس کالج، بدرہ کا کالج آف کامرس میں جز وقتی لکچرر کی حیثیت سے۔ اسی دوران اُردو کالج حمایت نگر اور حمایت نگر میں اعزازی خدمات انجام دی۔

۱۹۵۷ء میں شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ میں بہ حیثیت لکچرر تقرر۔

۱۹۶۹ء میں ریڈر شعبۂ اردو عثمانیہ یونیورسٹی
۱۹۸۳ء میں پروفیسر شعبۂ اردو عثمانیہ یونیورسٹی
۱۹۸۵ء میں ایک سال کے لیے وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے
سنٹرل یونیورسٹی آف حیدرآباد میں خدمات انجام دیں۔
۱۹۸۸ء میں صدر شعبۂ اردو عثمانیہ یونیورسٹی
۳۰/جون ۱۹۹۰ء کو وظیفہ حسن خدمت پر سبک دوش۔

ادارۂ ادبیاتِ اُردو سے وابستگی

شعبۂ اردو عثمانیہ یونیورسٹی کی ملازمت کے دوران ہی ادارۂ ادبیاتِ اردو سے وابستہ ہوئے۔ ڈسمبر ۱۹۷۹ء میں معتمد شعبۂ امتحانات نامزد کیے گئے۔ ۱۹۷۸ء میں ادارۂ ادبیاتِ اُردو کے ترجمان ماہنامہ "سب رس" کی مجلسِ ادارت کے معتمد اور اعزازی مدیر، ۱۷/اکتوبر ۱۹۹۳ء کو شریکِ معتمد ادارۂ ادبیات اُردو نام زد کیا گیا۔ ۴/اپریل ۱۹۹۴ء سے معتمد عمومی کی خدمت پر فائز ہیں۔

مختلف اداروں سے وابستگی

۱۔ انجمن شبستانِ ادب، حیدرآباد۔ (رکن)
۲۔ محفلِ علم وادب ــ عوامی مصنفین۔ (رکن)
۳۔ عوامی ادبی سوسائٹی (مشیر)
۴۔ نیشنل رائٹرس ایسوسی ایشن (معتمد)
۵۔ مجلسِ اشاعت دکنی مخطوطات (رکن)

۶۔ حیدرآباد لٹریری فورم	(صدر)
۷۔ اُردو مجلس	(معتمد ادبی)
۸۔ اقبال اکیڈیمی	(رکن)
۹۔ ساہتیہ اکیڈیمی۔ دہلی	(رکن اُردو کمیٹی)
۱۰۔ انجمنِ ترقی پسند مصنفین	(صدر)
۱۱۔ ادبی ٹرسٹ	(رکن)
۱۲۔ ایچ ای ایچ دی نظامس اُردو ٹرسٹ	(مختلف کمیٹیوں کی رکنیت)
۱۳۔ ادارہ شعروحکمت	(صدر)
۱۴۔ اُردو اکیڈیمی آندھراپردیش	(رکن بورڈ آف گورنرس)
۱۵۔ شامِ غزل سوسائٹی۔	(صدر)

تصانیف اور تالیف

۱۔ نوائے تلخ (شاعری) ۱۹۴۸ء

۲۔ فانی بدایونی، حیات، شخصیت اور شاعری (تحقیق/تنقید) ۱۹۶۹ء

۳۔ فانی کی نادر تحریریں (ترتیب) ۱۹۷۰ء

۴۔ پہلی کرن کا بوجھ (شاعری) ۱۹۸۰ء

۵۔ مٹی مٹی میرا دل (شاعری) ۱۹۹۱ء

۶۔ آواز اور آدمی (تنقید) ۱۹۹۲ء

۷۔ لفظوں سے آگے (تنقید) ۱۹۹۳ء

۸۔ بازیافت (تبصرے) مارچ ۱۹۶۸ء

۹۔ تلگو ادب کی تاریخ پر ایک نظر ۱۹۵۲ء

۱۰۔ نکاتِ اُردو ۱۹۵۲ء

ترتیب/تالیف

۱۔ فکرِ اقبال ۔ جنوری ۱۹۷۷ء
۲۔ نذرِ فانی بدایونی ڈسمبر ۱۹۶۸ء
۳۔ کہانیاں ۱۹۸۳ء
۴۔ انگریزی میں معاصر ہندوستانی کہانیاں ۱۹۹۶ء

ترجمے

۱۔ کہانی اور اس کا فن ۱۹۵۷ء
۲۔ شادی کی آخری سالگرہ ۱۹۷۵ء

ادبی صحافت : ادارت

رسالے

"شبستانِ ادب" (رکن مجلسِ ادارت)
"شعور" (مدیر)
ماہنامہ "صبا" (رکن مجلسِ ادارت)
سہ ماہی "شعر و حکمت" (مدیر)
شش ماہی "سوغات" (مدیر)
ماہنامہ "سب رس" (مدیر)

مضامین

۱۵۰ سے زیادہ تنقیدی مضامین شائع ہو چکے ہیں۔

توسیعی لیکچرس / خطابات

ملک اور بیرون ملک (لندن، امریکہ) کی مختلف یونیورسٹیوں اور اداروں میں توسیعی خطبات و تقاریر پیش کیں۔

اندرون ملک

۱۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
۲۔ جامعہ اُردو علی گڑھ
۳۔ میسور یونیورسٹی
۴۔ آندھرا پردیش اوپن یونیورسٹی
۵۔ بمبئی یونیورسٹی
۶۔ ہندی اکیڈیمی، آندھرا پردیش
۷۔ سنٹرل یونیورسٹی آف حیدرآباد

بیرون ملک:

۱۔ "اُردو مرکز" لندن
۲۔ "ایرخرو سوسائٹی آف امریکہ" شکاگو، یو۔ یس۔ اے
۳۔ "یونیورسٹی آف کیلی فورنیا" برکلے، یو۔ یس۔ اے

براڈ کاسٹ:

۱۔ بی بی سی لندن

۲۔ آل انڈیا ریڈیو۔ نئی دہلی، کلکتہ، بنگلور، اورنگ آباد، ممبئی اور حیدرآباد وغیرہ۔

انعامات واعزازات

۱۔ فانی بدایونی حیات، شخصیت اور شاعری	اتر پردیش اردو اکیڈیمی
۲۔ پہلی کرن کا بوجھ	اتر پردیش اردو اکیڈیمی
۳۔ آواز اور آدمی	بہار اردو اکیڈیمی
۴۔ لفظوں سے آگے	آندھرا پردیش اردو اکیڈیمی
۵۔ اکنا مادنا اوارڈ	مادنا ٹرمٹ آندھرا پردیش
۶۔ بابل ریڈی اوارڈ	بابل ریڈی فاونڈیشن، حیدرآباد
۷۔ "اردو پنڈت" لٹریری اوارڈ	پٹی شری راملو تلگو یونیورسٹی حیدرآباد
۸۔ ہندی اُردو ساہتیہ اوارڈ	کمیٹی لکھنؤ
۹۔ آزادی کے ۵۰ سال پر ادبی اعزاز	ICAP انڈسٹریل کونسل آف آندھرا پردیش
۱۰۔ جشن اعتراف خدمات (۱۹۹۹ء)	نمائش کلب، حیدرآباد
۱۱۔ جشنِ نذر معنی تبسم جولائی ۲۰۰۰ء	مدینہ بجوکیشنل سنٹر۔ ناندیڑ

ضمیمه

فنی شبنم کی نئی نظمیں الگ ہیں جو انھوں نے
کچھ تو دیر کیں نہ تو انھیں کسی مجموعے میں شامل کیا اور نہ ہی کسی
رسالے کو بھیجا۔ اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ وہ ان نظموں سے مطمئن
نہیں ہیں اور رد و بدل کی خاطر رکھ چھوڑا۔ لیکن شاید انھیں
اپنے بیاہ رخصت کی وجہ سے وقت نہ مل پایا۔ اور پھر کاغذات
میں دب کر یہ نظمیں فنی صاحب کی نظر سے اوجھل ہو گئیں۔ یہ نظمیں
اس قابل تھیں کہ انھیں اشاعت کے لیے کسی رسالے کو بھیج دیا جاتا۔
راقمۃ الحروف کو 30 نظمیں الگ دستیاب ہوئی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ
آئندہ کبھی فنی شبنم اپنا اگلا مجموعہ مرتب کریں تو ان نظموں اور کچھ غیر مطبوعہ
پر درج ذیل غزلوں کو اس میں شامل کر لیں۔

ذیل میں ان نظموں کے عنوانات درج کیے جا رہے ہیں۔

غیر مطبوعہ نظمیں

۱۔ تجدید
۲۔ پشیمانی
۳۔ آبھی جا
۴۔ اندیشہ
۵۔ کنارِ آبِ رواں
۶۔ فریبِ تصوّر
۷۔ سسکتی رات میں
۸۔ محرومی
۹۔ سہارا
۱۰۔ عدم سے عدم تک
۱۱۔ آخری خواب
۱۲۔ گریز کے بعد
۱۳۔ یہ جہاں کوزہ پشتوں سے آباد ہے
۱۴۔ بے مہر
۱۵۔ تہی دستی
۱۶۔ نظم
۱۷۔ یہ بادل برستے ہیں
۱۸۔ اے خداوندے کریم
۱۹۔ ذاکر صاحب کی وفات پر
۲۰۔ اشارے
۲۱۔ دوسرا نوحہ
۲۲۔ موت و حیات
۲۳۔ برکھا
۲۴۔ اعتزاز
۲۵۔ یہ جہاں
۲۶۔ رائیگاں
۲۷۔ یہی ہے اب ایک طرزِ گفت و شنید باقی
۲۸۔ خاکستر
۲۹۔ پچھلے پہر
۳۰۔ جبر و قدر

"مٹی مٹی میرا دل" کی غزلوں کے علاوہ معنی تبسم کی
نیز مطبوعہ غزلوں کے اشعار ملاحظہ فرمائیے۔

اور ہوں گے وہ جنہیں تابہ سحر جانا ہے
مجھ کو تو رات کی پوکھٹ پہ ٹھہر جانا ہے

جو پل بھر کو نگاہِ شوق دیوانہ بدل جائے
بہاروں کے تصوّر ہی سے ویرانہ بدل جائے

ان کی یادوں کے جنگل میں بھٹکتے رہنا
پھول کھلیں گے دیواروں کو تکتے رہنا

کوئی وعدہ ہے یہ اب آئے کہ نہ آئے
نیند آنکھوں میں میری آئے

نظر فریب تھا جو بھی جہاں دکھائی دیا
ستارہ چمکا کہاں اور کہاں دکھائی دیا

حیرتِ عشق سے تدبیر کہیں ہوتی ہے
لاہبر، پاؤں کی زنجیر کہیں ہوتی ہے

منزل کی جستجو میں تھے کل یہ قافلے بھی
کانٹے، رہینِ خاں تھے موسم تھے آبلے بھی

آئینہ تھا آئینے کے سامنے چہرہ نہ تھا
دل میں اس کی بھالو تھی جس کا کہیں سایہ تھا

وہ لذتِ فریبِ تماشا کہاں ہے اب
آنکھوں میں ہیں چراغ دل میں دھواں ہے اب

اپنی یادوں ہی کو نزدیک رگِ جاں کر دے
تو مرے کفرِ فراموشی کو ایماں کر دے

دل میں لگی ہے آگ ہوا سے بجھائیے ۔
باغوں میں گھومیے کبھی صحرا میں جائیے

تجھ کو ہو جائے کہیں بات نبھانا مشکل
بات اتنی نہ بڑھا بات پڑھانے والے

سمجھ رہے تھے بہت عشق میں خزانہ ملا
وہ اپنے دل میں سمایا تو پھر خدا نہ ملا

ایسا بیمار کسی نے کبھی دیکھا ہوگا
چارہ گر ہاتھ اٹھا لیں تو مداوا ہوگا

کشاکشِ زیست میں یہ کیا کم ہے گاہ گاہ
وہ یاد آئے
میرے خیالوں کی ظلمتوں میں بھی دیپ دو چار جھلملائے

یہ ساری غزلیں غیر مطبوعہ ہیں جو راقمۃ الحروف کو کاغذات کے انبار میں دستیاب ہوئیں ۔ نہ جانے کیوں انھوں نے یہ غزلیں نہ تو اپنے کسی مجموعے میں شامل کیں اور نہ ہی کسی رسالے کو بھیجیں ۔

ریڈیائی تقاریر

۱۔ سوویت ادیبوں کی دوسری کانگریس	جیک لنڈسے ترجمہ: مغنی تبسم	دسمبر ۱۹۵۵
2۔ بازارحسن		۱۹۵۸
3۔ نظیر اکبرآبادی		۱۹۵۸
4۔ اردو پر مغربی ادب کا اثر ــ شاعری		۱۹۶۰
5۔ "خانہ آزاد" کے چند مناظر		۱۹۶۰
6۔ کھوجی		۱۹۶۰
7۔ افہام و تفہیم ــ جذبہ		۱۹۶۰
8۔ طنز و مزاح ــ جدید مزاح		۱۹۶۰
9۔ تھامس ہارڈے		۱۹۶۱
۱۰۔ یوں ہوتا تو کیا ہوتا حالی اخبار کے ایڈیٹر تھے		۱۹۶۱
۱۱۔ اسٹیج کی کہانی (نذیر احمد کے ناول)		۱۹۶۱
12۔ اللہ شوق دے تو کتابیں پڑھا کرو (فسانۂ مبتلا)		۱۹۶۱
13۔ سبع سیارگان۔ آتش برہنہ (سات ستارے)		۱۹۶۲
14۔ "ماضی کا مستقبل"	تاراچند ترجمہ: مغنی تبسم	۱۹۶۳
15۔ ہندوستان کے قبائلی اقوام کی لوک کہانیاں	ڈاکٹر ورہیر ایلوین ترجمہ: مغنی تبسم	۱۹۶۳

	تقریب	تاریخ	تفصیل
۱۔	نیشنل رائٹرس اسوسی ایشن (آندھرا پردیش)	۹/نومبر ۱۹۵۸ء بروز یکشنبہ صبح ۱۰ بجے بمقام۔ اردو ہال۔ حمایت نگر	پروفیسر مغنی تبسم کنوینر
۲۔	مشاعرہ بصدارت۔ علامہ حضرت حیرت بدایونی بسلسلہ عرس شریف حضرت سید شاہ جمال الحق رح	۱۴ر اکتوبر ۱۹۶۲ء بروز اتوار بمقام درگاہ شریف	مہمان شعرا: مغنی تبسم
3۔	ممتاز افسانہ نگار عاتق شاہ کے طنزیہ مضامین اور خاکوں کا مجموعہ "چالیس قدم" کی رسم اجراء	۱۱/جون ۱۹۶۷ء اتوار ۵½ بجے شام بمکان نواب طاہر علی خاں، معظم جاہی مارکٹ	عاتق شاہ کے فن پر ڈاکٹر مغنی تبسم کا مضمون
4۔	جشن غالب "سیمینار" غالب کا شعور زیست	یکشنبہ ۹/فروری ۱۹۶۹ء زیر اہتمام۔ نقیب سخن بزم اردو، بمقام ویڈھی نواب حمایت جنگ بہادر حویلی قدیم حیدرآباد	شرکاء۔ ڈاکٹر مغنی تبسم
5۔	صد سالہ یادگار غالب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ	۱۷، ۱۸، ۱۹ر مارچ ۱۹۶۹ء	مقالہ:۔ ڈاکٹر مغنی تبسم
6۔	عوض سعید کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ "سائے کا سفر" کی رسم اجراء	۶/اپریل ۱۹۶۹ء یکشنبہ سماعت شام نمائش کلب	تقریر۔ ڈاکٹر مغنی تبسم

7۔ اردو اسیوسی ایشن ریلوے ۲۳/جولائی ۱۹۷۰ء افتتاح بدست ڈاکٹر مغنی تبسم
جونیر کالج کا جلسہ افتتاحیہ شام میں ۶ بجے

8۔ حیدرآباد کے ممتاز شاعر ۲۵/اپریل ۱۹۷۲ء مقررین۔
اکبر حیدرآبادی (مقیم آکسفورڈ) وقت ۶ ساعت شام ڈاکٹر مغنی تبسم
کے مجموعہ کلام "خط رہ گذر" مقام۔ ایوانِ اُردو پنجہ گٹہ
(ناشر: مکتبہ شعر و حکمت۔ حیدرآباد
حیدرآباد) کی رسم اجراء

9۔ یومِ اقبال۔ زیر اہتمام: ۲۱/اپریل ۱۹۷۵ء صہبا لنکار
اقبال اکیڈیمی حیدرآباد دوشنبہ ۸ ساعت شب ڈاکٹر مغنی تبسم
مقام: مدنیہ مینشن
نارائن گوڑہ۔ حیدرآباد

10۔ "محفلِ شعر" ۲۲/اپریل ۱۹۷۶ء مقرر
اجلاسِ دوم۔ فکر و فلسفہ پنجشنبہ ۲½ ۷ بجے شام ڈاکٹر مغنی تبسم

11۔ "یادِ مخدوم" اتوار ۲۱/۲۸/اگسٹ
آندھرا پردیش سوشیل ایجوکیشنل ۱۹۷۷ء ۱۱ بجے دن مقرر
اینڈلڑیری اسوسی ایشن بمقام "پروانہ ہال" ڈاکٹر مغنی تبسم
(اسپیلا) اردو کے نامور شاعر
جناب مخدوم محی الدین مرحوم
کی (۸) ویں برسی کے موقعے
پر ایک نشست بعنوان

یادِ مخدوم، زیرِ صدارت
جناب حامد علی خاں صاحب
ایڈیٹر روزنامہ سیاست

12۔ سیمنار ۴ اور ۵/فروری ۱۹۷۸ء شرکاء
مخدوم محی الدین کے ۷۰ ویں اُردو ہال حمایت نگر ڈاکٹر مغنی تبسم
یومِ پیدائش کی دوروزہ
تقاریب

13 اُردو مجلس کا ادبی اجلاس اتوار ۳۰/جولائی صدارت :
ومشاعرہ ۱۹۷۸ء ۵½ بجے شام ڈاکٹر مغنی تبسم
اردو ہال حمایت نگر

14۔ سیمنار
ایچ۔ای۔ایچ دی نظامس بروز ہفتہ ۲۵/نومبر کنوینر۔
اردو ٹرسٹ کیمانب سے ۱۹۷۸ء ۶ بجے شام ڈاکٹر مغنی تبسم
سیمنار آندھراپردیش میں بمقام۔ اُردو ہال حمایت نگر شگریہ :
اردو کے بائیس (۲۲) سال ڈاکٹر مغنی تبسم
کا جلسہ افتتاحیہ

15۔ یوم محمد قلی قطب شاہ افتتاحی اجلاس بتاریخ معتمد، تقاریب :
سترہواں سالانہ اجلاس ۱۱/فروری ۱۹۷۹ء ڈاکٹر مغنی تبسم
زیرِ اہتمام ادارۂ ادبیات اُردو روز یکشنبہ
بمقام گنبدانِ قطب
شاہی (گولکنڈہ)

16۔ اردو اکیڈمی آندھراپردیش اتوار ۱۸/مارچ کلیدی مضمون :
"اردو افسانے کے پچھلے ۲۵ برس" ۱۹۷۹ء ڈاکٹر مغنی تبسم

سمپوزیم اور "شامِ افسانہ" — بمقام - جانکی پرشاد ہال، انوار العلوم کالج جدید ملے پلی، حیدرآباد

17- ادارہ شعر و حکمت کے جانب — بروز جمعہ ۱۰ ستمبر ۱۹۷۹ء — تقریر۔
قدیر زماں کے مختصر افسانوں کا مجموعہ "رات کا سفر" کی اشاعت عمل میں آئی۔ — ۸ ساعت شب — پروانہ ہال — ڈاکٹر مغنی تبسم

18- تقریبِ رونمائی — ۱۲/ فروری ۱۹۸۰ء — مہمان خصوصی ڈاکٹر مغنی تبسم
'مرزا علی لطف' حیات اور کارنامے — ۴ بجے شام — مقام۔ اعظم ہال گورنمنٹ کالج حیدرآباد
مصنف۔ ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ

19- یوم محمد قلی قطب شاہ — افتتاحی اجلاس بتاریخ ۲۴/ فروری ۱۹۸۰ء — معتمدین "یوم محمد قلی قطب شاہ"
اٹھارہواں سالانہ اجلاس زیرِ اہتمام "ادارۂ ادبیات اردو" بہ تعاون گولکنڈہ سوسائٹی — روز یکشنبہ بوقت ۵ ساعت شام — بمقام۔ گنبدانِ قطب شاہی (گولکنڈہ) — ڈاکٹر مغنی تبسم

20- "یوم اقبال" — ۱۸، ۱۹ اور ۲۰/ اپریل ۱۹۸۰ء — مقالہ نگار: ڈاکٹر مغنی تبسم
اقبال اکیڈمی حیدرآباد — بمقام: مہبنہ منشن
سہ روزہ تقاریب — نارائن گوڑہ، حیدرآباد۔

21- ایچ ای ایچ دی نظامس — ۲۷/ اپریل ۱۹۸۰ء — ڈاکٹر مغنی تبسم
حلقہ اربابِ ذوق ماہانہ جلسہ روز یکشنبہ بوقت ۲½ ساعت

کتاب

"تنقید و تحریک"

مصنفہ ڈاکٹر احمد سجاد پیر

تبصرہ

22- رسم اجرا و افسانوی مجموعہ) 9/مئی 1980ء صدارت:

"نئی دھڑکن" بروز جمعہ وقت ۵½ بجے شام ڈاکٹر معنی تبسم

مصنف۔ رضا الجبار

23- رسم رونمائی اتوار ۲/۴ اگست 1980ء صدارت:

"پہلی کرن کا بوجھ" ۱۰½ بجے صبح عملی احمد جلیلی

مجموعہ کلام ایوانِ اردو پنجہ گٹہ

رسم رونمائی: مصحف اقبال

توصیفی

24- فانی صدی تقاریب شنبہ 17، 18/جنوری محتمد: ڈاکٹر معنی تبسم

زیرِ اہتمام۔ ایچ ای ایچ دی 1981ء ۵ بجے شام کنوینر: سیمنار: ڈاکٹر معنی تبسم

نظامس اردو ٹرسٹ اردو ہال حمایت نگر شکریہ: ڈاکٹر معنی تبسم

25- جدید نسل کے ممتاز شاعر یکشنبہ 15/مارچ 1981ء خطاب

شہریار ۱۰½ بجے صبح ڈاکٹر معنی تبسم

کا خیر مقدمی جلسہ ایوانِ اردو پنجہ گٹہ

زیرِ اہتمام: مکتبہ شعر و حکمت حیدر آباد

و ادارۂ سب رس

26- ایچ ای ایچ دی نظامس 19/ڈسمبر 1981ء تبصرہ نگار:

اردو ٹرسٹ حمایت نگر روز شنبہ ۵ بجے ساعت ڈاکٹر معنی تبسم

ماہانہ اجلاس حلقہ اربابِ ذوق شام

کتاب ۔" اردو افسانہ
روایت اور مسائل"
مرتبہ : پروفیسر گوپی چند
نارنگ
رسم اجراء : مبصر اشاعت
خاص نذر فانی بدایونی
بدست: حامد علی خاں صاحب

27۔ اراکین شعبہ اُردو علی گڑھ مسلم یو نیورسٹی صدی سیمنار کی افتتاحی تقریب
۱۶/ تا ۱۸ جنوری ۱۹۸۲ء
مقالہ نگار : ڈاکٹر مغنی تبسم

28۔ گولڈن جوبلی تقاریب ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد
مارچ ۱۹۸۲ء تا فبروری ۱۹۸۳ء
جشن افتتاح
ادبی اجلاس
"اردو زبان وادب کی ترقی میں ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ — اور ادارۂ ادبیات اُردو کا حصہ"

بدست: عالیجناب محمد ہدایت اللہ نائب صدر جمہوریہ ہند
۱۶/۱۳ مارچ ۱۹۸۲ء
۱۶ مارچ ۱۹۸۲ء ۵½ شام
بمقام ایوانِ اردو پنجہ گٹہ حیدرآباد

صدارت :
عالیجناب بھوانی وینکٹ رام صاحب
۱۳/ مارچ ۱۹۸۲ء ۵ بجے شام
بمقام گنبد محمد قلی قطب شاہ گولکنڈہ

مقرر
ڈاکٹر مغنی تبسم
مجلس انتظامی ادارہ ادبیاتِ اردو

ڈاکٹر مفتی تبسّم
رکن گولڈن جوبلی تقاریب کمیٹی
میموریل والیوم کمیٹی -
ڈاکٹر مفتی تبسم (کنوینر)
انتخاب سب رس کمیٹی -
کنوینر
مفتی تبسّم
ڈرامہ کلچرل پروگرام کمیٹی
کنوینر
ڈاکٹر مفتی تبسّم
شامِ انشائیہ
کنوینر
ڈاکٹر مفتی تبسّم

29- منجانب۔ اردو گھر مغل پورہ بتاریخ: ۲۱/ نومبر ۱۹۸۲ء — مقرر: ڈاکٹر مفتی تبسّم
تقریب رسم اجرائی
کشکول (الہامِ ثالث) روز یکشنبہ بوقت سوا چار
(رباعیات ڈاکٹر گھونندن) بجے شام
(راج سکینہ الہام) مقام۔ مکان ڈاکٹر
آر۔آر سکینہ

30- گولڈن جوبلی تقاریب ۸/ جنوری ۱۹۸۳ء — کنوینر: مفتی تبسّم
ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد پانچ ساعت شام
"شامِ انشائیہ" ایوان اردو پنجہ گٹہ حیدرآباد

31- جناب ہاشم اختر کے اعزاز میں تہنیتی تقریب — ادارۂ ادبیات اُردو — 23 جنوری 1983ء — کنوینر ڈاکٹر مغنی تبسم

32- زیر اہتمام ادارہ "معراجِ ادب" حیدرآباد — ۲۸/جنوری ۱۹۸۳ء روز جمعہ وقت ۶½ بجے شام — اظہارِ خیال ڈاکٹر مغنی تبسم

تقریب اجراء "آتشِ گفتار" محمد ظہ کلام حیدرآباد — اردو گھر مغل پورہ

جناب خورشید عبیدی

اجراء بدست:

سید ہاشم علی اختر صاحب

33- محترم جناب سعید شہیدی کے تیسرے مجموعہ "آفتاب غزل" — ۶/فبروری ۱۹۸۳ء روز یکشنبہ بوقت ۶½ بجے شام — تقریر ڈاکٹر مغنی تبسم

کارِ سم اجراء — بمقام اردو گھر مغلپورہ

اجراء: پدم شری جناب

عابد علی خاں صاحب مدیر سیاست

34- نئی نسل کے باشعور شاعر، ۱۲/مارچ ۱۹۸۳ء رسم اجراء بدست:
نثر نگار - جناب قطب بروز ہفتہ ۵½ سا ملت شام ڈاکٹر مغنی تبسم
سرشار، لکچرار اردو گورنمنٹ بمقام۔ ہنری مارٹن انسٹی ٹیوٹ
کالج ظہیر آباد کے مجموعہ کلام ناہیلی اسٹیشن روڈ عابڈز
"انفس و آفاق" کی رسم اجراء

35- تقریب رسم اجراء شب ۲۶/مارچ ۱۹۸۳ء
"شعلہ نم" بمقام: اردو گھر مغل پورہ خطبہ استقبالیہ
مجموعہ کلام حیدرآباد (اے-پی) ڈاکٹر مغنی تبسم
میر محمد علی راز عابدی

36- یوم محمد قلی قطب شاہ افتتاحی اجلاس معتمد "یوم محمد قلی قطب
اکسیواں سالانہ اجلاس ۲۷/مارچ ۱۹۸۳ء شاہ"
زیر اہتمام ادارہ ادبیات روز یکشنبہ بوقت ۵ سا ملت شام جناب ڈاکٹر مغنی تبسم
اردو حیدرآباد بمقام: گنبدان قطب شاہی
(گولکنڈہ)

37- سیاست توسیعی لکچر ۳۰/مارچ ۱۹۸۳ء کنوینر:
ادارہ روزنامہ سیاست کے چہار شنبہ شام ۶ بجے ڈاکٹر مغنی تبسم
زیر اہتمام مقام۔ اردو گھر مغل پورہ
پاکستان کے ممتاز محقق و نقاد
ڈاکٹر جمیل جالبی "ہندوستان
اور پاکستان میں جدید تحقیقی
کام" کے موضوع پر مخاطب
فرمائیں گے۔

38- پاکستان کے ممتاز افسانہ ۱۶/اپریل ۱۹۸۳ء کنوینر:
نگار انتظار حسن کے ۶ بجے شام ڈاکٹر مغنی تبسم
ساتھ ایک شام اردو گھر مغل پورہ
زیر اہتمام ادارہ روزنامہ
سیاست حیدرآباد

39- تہنیتی تقریب زیر اہتمام حیدرآباد مقرر
(گلبرگ سے گلبرگ تک) کرناٹک مرینڈس سی ایسوسی ڈاکٹر مغنی تبسم
مصنف: طیب انصاری ایشن)

دوشنبہ ۱۵/اپریل ۱۹۸۳ء

۶ بجے شام
اردو گھر مغل پورہ

40- جواں سال شاعر ۱۹/ستمبر ۱۹۸۳ء مقرر
جناب رشید شہیدی کے لیے بروز دوشنبہ بوقت ۷ ڈاکٹر مغنی تبسم
مجموعہ کلام سماعت شام
"فراز نظر" بمقام حسین آباد ٹرسٹ
کا رسم اجراء (دیوڑھی نواب کمال یار
جنگ)
منڈی میر عالم

41 تعزیتی جلسہ 8 اکتوبر 1983 تقریر.
بہ یاد پروفیسر عالم خوندمیری ڈاکٹر مغنی تبسم

اردو ہال
حمایت نگر

42 انجمن اتحادِ طلباء ۱۰/ڈسمبر ۱۹۸۳ء
"الواسع" انسٹی ٹیوٹ روز شنبہ بوقت ۶ مابعد
بمقام (شوکت منشن شام مہمانِ خصوصی
یاقوت پورہ)
جلسہ افتتاحیہ
جس میں جناب ڈاکٹر
مغنی تبسم صاحب (ریڈر
جامعہ عثمانیہ) بحیثیت
مہمانِ خصوصی شرکت
فرمائیں گے

43- ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد ۲۵/ڈسمبر ۱۹۸۳ء کنوینر:
ایوان اردو پنجہ گٹہ حیدرآباد بروز یکشنبہ بوقت ۱۰ بجے مغنی تبسم
"یوم زور" ایوان اردو پنجہ گٹہ
ڈاکٹر سید غلام محی الدین
تاریخی زور مرحوم ربانی
ادارۂ ادبیات اردو کے
۷۸ ویں یوم پیدائش کے موقع
پر ادارۂ ادبیات اردو کے
زیر اہتمام جلسہ

44- "قلم اور آواز" بنجارہ ہلز ۳۰/ڈسمبر ۱۹۸۳ء صدارت سید ہاشم
نوجوان ادیب اور محقق روز جمعہ ۵ بجے شام ایوان مقرر
ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ اردو پنجہ گٹہ میں منعقد ہوگی ڈاکٹر مغنی تبسم

استاد شعبہ اردو جامعہ
عثمانیہ کی نو تصنیف
کتابوں
خوشی نفساں اور
دیوانِ لطف کی اشاعت
کی مسرت میں

44- بتقریب رسم اجراء ہفتہ ۲۸-جنوری مقرر :
"خوشبو کا سفر" (شعری مجموعہ) ۱۹۸۴ء ڈاکٹر مغنی تبسم صاحب
مصنف صلاح الدین نیر بوقت ۶ ساعت شام صدر شعبہ اُردو جامعہ عثمانیہ
زیر اہتمام ادارہ شعر و حکمت بہ مقام اُردو گھر مغل پورہ
رسم اجراء
بدست: جناب ہاشم علی اختر
(وائس چانسلر جامعہ عثمانیہ)

45- زیر اہتمام "معراجِ ادب" ۱۱/فبروری ۱۹۸۴ء مہمان خصوصی:
اور "بزمِ شباب" حیدرآباد روز شنبہ ۸ بجے شب ڈاکٹر مغنی تبسم
رسم اجراء "قرینہ غزل" مقام: بیت المصطفیٰ
شعری مجموعہ حضرت حکیم میر دودھ خانہ اللہ رکھی بیگم
سرفراز علی ناوک مرحوم کوٹلہ عالیجاہ حیدرآباد
بدست: پروفیسر ڈاکٹر غلام
عمر خاں

46- اردو مرکز جمعہ ۱۱/مئی ۱۹۸۴ء ممتاز شاعر اور ناقد
۶ بجے شام پروفیسر مغنی تبسم کے اعزاز
مقام: اسکول آف اورینٹیل میں ایک محفل کا اہتمام

اینڈ افریکن اسٹڈیز لندن

یونیورسٹی میلٹ اسٹریٹ

صدارت: اکبر حیدرآبادی لندن ڈبلوسی

تعارف: باقر نقوی، سومن رامی

47 حیدرآباد دکن اسوسی ایشن 19/مئی ۱۹۸۴ء صدارت:

۶½ بجے شام پروفیسر مغنی تبسم

بمقام: ایرن اسکول ہال

لکشمی گارڈن۔لندن

48۔ جناب رشید شہیدی کے دورے 25/جنوری ۱۹۸۵ء مقرر:

مجموعہ کلام ۶ ساعت شام پروفیسر مغنی تبسم

"جاگتی راتیں" کا مقام فنکشن پلاؤ ا

حیدرآباد ہیریٹیج فورم (حلف) برکت پورہ۔

کے زیر اہتمام رسم اجراء

بہ دست: حضرت مہدی نظمی

49۔ Spectrum: 25 جنوری 1985

بین لسانی اجلاس

یوم جمہوریہ کے قریب سے موضوع پر۔

مقرر

Prof. Maghni

پروفیسر مغنی تبسم

Tabassum.

سٹی سنٹرل لائبریری

Central Library

اشوک نگر حیدرآباد

50۔ تقریب رسم اجراء 24/فبروری ۱۹۸۵ء رسم اجراء - ڈاکٹر مغنی تبسم

"حیدرآباد کی مشترکہ تہذیب" روز یکشنبہ وقت ۵½ ساعت شام

مصنف اقبال جہاں قدیر مقام - اُردو گھر

مغل پورہ

51- ڈائرکٹر ڈورڈرشن کیندر - سہ شنبہ ۲۶/فروری مشاعرہ:

حیدرآباد ۱۹۸۵ء کلام پیش کرنے والوں میں

کمشنر ریاستی محکمہ اطلاعات 6:15 بجے شام ڈاکٹر مغنی تبسم

وتہذیبی امور مقام: رویندر بھارتی تھیٹر

"محفلِ مشاعرہ" حیدرآباد

عزت مآب ڈاکٹر شنکر

دیال شرما

گورنر آندھراپردیش

مشاعرہ کا افتتاح کریں گے

52- رسم اجراء یکم/جنوری ۱۹۸۶ء مقرر

آسماں کا پیرھن ۴½ ساعت شام پروفیسر مغنی تبسم

یوسف اعظمی پریس کلب بشیر باغ

زیرِ اہتمام: حیدرآباد

حیدرآباد لٹریری فورم حلف

اقبال اکیڈیمی ادارہ جدید فکر

عصری رجحانات -

53- شعبہ اُردو جامعہ عثمانیہ ۳، ۴ اور ۵/جنوری ۵/جنوری تیسری نشست:

کے زیرِ اہتمام ۱۹۸۶ء مقالہ نگار

کل ہند سہ روزہ سمینار آئی - سی - ایس - ایس - آر پروفیسر مغنی تبسم لفظوں

"حیدرآباد میں بیرونی شعراء" کانفرنس ہال، جامعہ عثمانیہ، "کا نگر حیدرآباد میں"

حیدرآباد

3 جنوری 1986
عثمانیہ یونیورسٹی لائبریری

نظامت و شکریہ
ڈاکٹر مغنی تبسم

54 میکش میموریل سوسائٹی ۴/مارچ ۱۹۸۶ء خطاب

حیدرآباد بروز سہ شنبہ ۵½ بجے شام ڈاکٹر مغنی تبسم

کے زیرِ اہتمام ہنری مارٹن انسٹی ٹیوٹ

ممتاز شاعر صاحبزادہ میر محمد ناصلی روڈ حیدرآباد

علی خاں میکش مرحوم

کی یاد میں ایک

-55 شب ۲۲/مارچ ۱۹۸۶ء میزبان شعراء میں

گولکنڈہ سوسائٹی کا دوسرا ساڑھے آٹھ بجے شب بمقام پروفیسر مغنی تبسم

گل ہند مشاعرہ احاطہ گنبد محمد قلی قطب شاہ

زیر اہتمام گولکنڈہ سوسائٹی گولکنڈہ۔

حیدرآباد

افتتاح: میر بلدہ جناب ٹی پرکاش

راؤ صاحب

56- تین سو سالہ جشنِ شاہ سراج ۲۹/مارچ ۱۹۸۶ء

اورنگ آبادی روز شنبہ ۱۰ تا ۱ بجے دن

سمینار۔

صدارت۔ ڈاکٹر مسعود حسین

نظامت: اختر الزماں ناصر

اجلاس اوّل: ۲۹ مارچ ۸۶ء

اجلاس دوم: روز شنبہ ۱۰ بجے دن

اجلاس سوم، چہارم

۳۰/مارچ ۱۹۸۶ء روز یکشنبہ

۳ تا ۶ بجے شام

صدارت: ڈاکٹر ظ۔ انصاری — "سراج ایک صنّاع"

نظامت: اختر الزماں ناصر — ڈاکٹر مغنی تبسّم

57- جلسہ یادِ — جمعہ ۲۹/اگست ۱۹۸۶ء — تقریر

شاذ تمکنت — ۶ ساعتِ شام — ڈاکٹر مغنی تبسّم

صدارت: پروفیسر سراج الدین — پریس کلب فتح میدان بشیر

مہمانِ خصوصی: پروفیسر رفیعہ — باغ حیدر آباد۔

سلطانہ

زیر اہتمام:

حیدر آباد لٹریری فورم (حلف)

58- تہنیتی جلسہ — بمقام: دربار زنانہ کالج — مقرر:

زیر اہتمام — کوٹھی بتارنجی — ڈاکٹر مغنی تبسّم

عثمانیہ یونیورسٹی اردو ریسرچ ۶/نومبر ۱۹۸۶ء — پروفیسر اردو جامعہ عثمانیہ

اسوسی ایشن — بوقت ۵½ ساعت شام

بہ صدارت

پروفیسر نوسنیت راؤ وائس چانسلر

عثمانیہ یونیورسٹی

بتقریب اشاعتِ کتب

۱۔ ڈاکٹر محمد علی اثر (لکچرار اردو
جامعہ عثمانیہ)
"دکنی غزل"

۲۔ مس میمونہ وحید (لکچرار
اردو جامعہ عثمانیہ)
"پطرس بخاری حیات اور
کارنامے"
رسم روشنائی ۔ ڈاکٹر خواجہ
احمد فاروقی
پروفیسر ایمریٹس

59۔ زیر اہتمام غالب میموریل ویلفیئر سوسائٹی با اشتراک اردو اکادمی، دہلی — ۲۰/نومبر ۱۹۸۶ء شام ساڑھے پانچ بجے بمقام: غالب اکادمی بستی حضرت نظام الدین — اظہار خیال ڈاکٹر مغنی تبسم

استقبالیہ و جلسہ رسم اجراء
"تنہائی"
از۔ صدیقہ شبنم (لندن)
صدارت: جناب حیات اللہ
انصاری ایم۔پی
رسم اجراء: پروفیسر گوپی چند
نارنگ

60۔ تقریب رسم اجراء "تنہائی" — مقام: اردو گھر، مغل پورہ کنوینر مغنی تبسم — حیدرآباد

(مجموعہ کلام)
صدیقہ شبنم
زیر اہتمام:
مکتبہ شعر و حکمت حیدرآباد
صدارت: عابد علی خاں
(مدیر روزنامہ سیاست)
رسم اجراء: پروفیسر ٹی او نیتسکاؤ
وائس چانسلر عثمانیہ
یونیورسٹی

تاریخ: ۸/ دسمبر ۱۹۸۶ء
دوشنبہ
وقت: ۶ ساعت شام

61- "درد نارسا" رسم رونمائی — 20-21 دسمبر 1986
سید ہاشم — نٹ راج رنگ مندر
مہمان شاعر
پیر بخش
دفنی تبسم

62- بتقریب رسم اجراء — بمقام: مولانا آزاد ریسرچ — مہمان خصوصی:
"گل بانگ نسیم" — انسٹی ٹیوٹ — ڈاکٹر دفنی تبسم
(مجموعہ کلام)
مصنف: نسیم نیازی
سہ شنبہ ۶/ جنوری ۱۹۸۷ء
۶ بجے شام۔
زیر اہتمام دیار ادب
رسم اجراء: جناب ٹی او نیتسکاؤ
(وائس چانسلر جامعہ عثمانیہ)

63- بتقریب رسم اجراء — بمقام اردو گھر مغل پورہ — مہمان خصوصی:
رشتوں کی مہک (مجموعہ کلام) — چہار شنبہ ۲۱/ جنوری ۱۹۸۷ء — ڈاکٹر دفنی تبسم

صلاح الدین نیر ٹھیک ۵½ بجے شام
زیر اہتمام۔ ادارہ شفروحکمت
رسم اجراء: بدست عزت
مآب محترمہ کمود بین جوشی،
گورنر آندھرا پردیش

64۔ تقریب رسم اجراء بمقام: اُردو گھر محل پورہ رسم اجراء:
"فردوس بہار" بروز جمعہ ۲۱/اگست ۱۹۸۷ء پروفیسر مغنی تبسم
دستری مجموعہ) ۵½ بجے شام
مصنف: منوہر لعل بہار
زیر اہتمام:
دیار ادب اور
ہندی لیکھک سنگھ
صدارت: جناب حامد علی خاں
(مدیر روزنامہ سیاست)

65۔ حیدرآباد لٹریری فورم (حلف) ۲۲/ڈسمبر ۱۹۸۷ء صدارت:
کے زیر اہتمام بروز سہ شنبہ پروفیسر مغنی تبسم
محمد معین الدین اکبر کی تصنیف ۵½ بجے شام
"حیدرآبادی مصنفین کے مینری مارٹن انسٹی ٹیوٹ
ریڈیائی ڈرامے" ناپلی روڈ۔ حیدرآباد
رسم رونمائی
رونمائی بدست: عالی جناب
محمد فضل الرحمٰن صاحب
(سابق پرووائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی)

66۔ حیدرآباد لٹریری فورم (حلف) پریس کلب (بشیر باغ) مقرر
کے زیر اہتمام ۳۰/جنوری ۱۹۸۸ء ڈاکٹر مغنی تبسم
"آوازوں کا شہر" ٹھیک چھ بجے شام
کی رسم اجراء
صدارت: جناب اختر حسین

67۔ میکش میموریل سوسائٹی - on Saturday 6 فبروری 1988 بہ اہتمام
حیدرآباد the 6th Feb 1988 اختر حسین
"شبِ غزل" 8:30 بجے مغنی تبسم

"گاندھی بھون"
حیدرآباد

68۔ تقریبِ رسم اجراء ۶/فبروری ۱۹۸۸ء تقریر
"دو آتشہ" ہفتہ ۵½ بجے شام پروفیسر مغنی تبسم
میکش حیدرآبادی (مرحوم) بمقام - اُردو گھر
کے منتخب اور غیر مطبوعہ کلام محل پورہ حیدرآباد
کا مجموعہ
ناشر: اُردو اکیڈیمی آندھرا پردیش

زیرِ صدارت: جناب یوسف ناظم

مہمانِ خصوصی:

عزت مآب پی ہیندر ناتھ

(وزیر خزانہ)

عزتِ مآب این۔ ایتھی

راجہ راؤ

(وزیر امداد باہمی)

عزتِ مآب۔ ین محمد فاروق

(وزیر اُردو اکیڈیمی)

اوقاف و شوگر۔

انڈسٹریز

رسم اجراء: بدست جناب

محمد خلیل الرحمٰن

(ایم۔پی) سابق ڈائرکٹر اُردو اکیڈیمی)

69۔ ڈیموکریٹک اسوسی ایشن ۲۱/فروری ۱۹۸۸ء ادبی اجلاس:۔

حیدرآباد روزیکشنبہ، اُردو گھر صدارت: جناب اختر حسن

کے زیرِ اہتمام مغل پورہ، حیدرآباد مہمانِ خصوصی۔

اردو شاعر جناب مخدوم محی جناب حامد علی خاں

الدین کی ۸۰ سالہ یوم پیدائش ایڈیٹر روزنامہ سیاست

تقاریب مقالہ: "مخدوم کی انفرادیت"

ادبی اجلاس از: پروفیسر مغنی تبسم

۱۰½ بجے صبح طرحی مشاعرہ

۸½ بجے شب

70۔ "نذرِ غالب" ۲۲/ فروری ۱۹۸۸ء ادبی اجلاس
سرپرست اعلیٰ ۵½ ساعت شام شخصیت اور فن
نواب شاہ عالم خاں مقام: صدارت: ڈاکٹر سید عبدالمنان
صدر مجلسِ انتظامی انوار العلوم ایوننگ کالج مقرر
انوار العلوم کالجس (ملے پلی) ڈاکٹر معنی شبستم "غالب کی
سرپرست: نواب محبوب دنیا"
عالم خاں معتمد الخزانی

71۔ جشنِ عظمت عبدالقیوم ۱۵/ مارچ ۱۹۸۸ء تعارفی و خیر مقدمی تقریر:
عظمت عبدالقیوم کی ۰۵ سالہ ۵½ بجے شام روز سہ شنبہ ڈاکٹر معنی شبستم
شعری و ادبی خدمات کا جوبلی ہال باغ عامہ
اعتراف
"عظمت منزل"
عظمت عبدالقیوم۔
فن اور شخصیت
زیرِ اہتمام: ادارہ شعر و حکمت
افتتاح جشن و رسم اجراء
از۔ عزت مآب شریمتی
کمود بین جوشی
گورنر آندھرا پردیش
صدارت: پروفیسر جگن ناتھ آزاد
صدر شعبہ اردو جموں کشمیر
یونیورسٹی

72- ۲۰/جولائی ۱۹۸۸ء

بروز چہارشنبہ

12-2-282 ½ پروفیسر مغنی تبسم

نزد فضل ہاسپٹل کے اعزاز میں

مرادنگر، حیدرآباد خیر مقدمی تقریب

73- قطب شاہی فیسٹول ۲۸-جولائی ۱۹۸۸ء مقررین

۲۸-جولائی ۱۹۸۸ء نمایش-صبح پونے گیارہ بجے آچاریہ مغنی تبسم

تلگو ثقافت اور قطب شاہوں سیمنار : صبح گیارہ بجے

کی خدمات مقام : آرٹ گیلری، کلابھون

نمایش و سیمنار

74- جامعہ عثمانیہ بروز دوشنبہ، ۱۶/جنوری بہ صدارت :

نظام کالج صدی تقاریب ۱۹۸۹ء ڈاکٹر مغنی تبسم

افتتاحی ادبی ہفتہ ۳ بجے دن

زیر اہتمام : ڈپارٹمنٹ آف بمقام سالار جنگ ہال

لینگویجس۔ نظام کالج، حیدرآباد نظام کالج حیدرآباد۔

75- انجمن ترقی پسند مصنفین اردو ۲۱/۲۲/جنوری، گاندھی صدارت :

سالانہ کانفرنس بھون آڈی ٹوریم ڈاکٹر عابد علی خاں

ادارہ ادبیات اردو۔ اردو ہال-حمایت نگر سیاست

حیدرآباد آندھرا پردیش مہمان خصوصی :

کے زیر اہتمام مخلی سردار جعفری

تقریر مغنی تبسم

76- ادارہ ادبیات اردو اتوار ۲۴-ڈسمبر آخری
حیدرآباد ۱۹۸۹ء پروفیسر مغنی تبسم
کے زیر اہتمام ۱۰½ دن ،
"یوم زور" ایوان اردو (پنجہ گٹہ روڈ)
معتمد عمومی :
رمن راج سکینہ

77- "یہ لوگ" جمعہ ۱۱/جنوری ۱۹۹۰ء مقرر :
مصنف : جناب سری لدھوٹی ۶ بجے شام پروفیسر مغنی تبسم
تقریب رسم اجراء بمقام اردو گھر مغل پورہ
زیر اہتمام ادبی ٹرسٹ
رسم اجرا : جناب عابد علی خاں
معتمد ادبی ٹرسٹ
صدارت : جناب محمد فضل الرحمٰن

78- "پہچان" چہارشنبہ - ۱۷/جنوری مہمان خصوصی :
(کوینا کرن کا شعری مجموعہ) ۱۹۹۰ء پروفیسر مغنی تبسم صاحب
زیر اہتمام : دیار ادب اور ۶ بجے شام
سنگیت سادھنا بمقام : مولانا ابوالکلام
تقریب رسم اجراء : آزاد ریسرچ انسٹی
پدم شری جناب عابد علی خاں ٹیوٹ - باغ عامہ
مدیر سیاست
صدارت : جناب ایم باگا
ریڈی صاحبہ
(رکن پارلیمنٹ)

79۔ حیدرآباد کے علمی، ادبی اور تہذیبی اداروں کی جانب سے اُردو کے ممتاز محقق اور نقاد پروفیسر گیان چند جین کی وداعی تقریب — ۲۶/مارچ ۱۹۹۰ء ساڑھے پانچ بجے شام گاندھی سینٹری ہال (نمائش کلب) — تقریر پروفیسر مغنی تبسم

80۔ انجمنِ ترقی اُردو آندھرا پردیش — اتوار، ۱۳/مئی ۱۹۹۰ء — مقرر

رسم اجراء: محی الدین قادری زورؔ — ۵ بجے شام اُردو ہال — پروفیسر مغنی تبسم

مرتبہ: ڈاکٹر خلیق انجم — گلشن حبیب حمایت نگر

(معتمد عمومی انجمن ترقی اُردو) — حیدرآباد۔

رسم اجراء بدست:

ڈاکٹر سید عبدالمنان

صدر انجمن ترقی اردو

آندھرا پردیش

81۔ افتتاحی مشاعرہ: — ۱۶/جولائی ۱۹۹۰ء — صدارت:

ادارۂ عصری ادب حیدرآباد — یوم دوشنبہ — پروفیسر مغنی تبسم

افتتاح: — بوقت ۵ سالمت شام — سابق شعبہ اردو

بدست جناب محبوب حسین جگرؔ — مقام: مولانا آزاد — (عثمانیہ یونیورسٹی)

جائنٹ ایڈیٹر روزنامہ سیاست — اورنٹیل ریسرچ انسٹی

مہمان خصوصی: — ٹیوٹ ہال۔

جناب محبوب حسین جگر — باغِ عامہ

مہمان خصوصی: جناب عوض سعید

82- لینگویج اینڈ کلچر اکیڈمی بمقام: یووانیکا متصل ڈاکٹر مغنی تبسم
بنگلور، کے زیرِ اہتمام اُردو ریزرو بینک ویلفیئر
کے پہلے ملک الشعرا کرناٹک اردو اکیڈمی،
اسد اللہ وجہی کی ادبی سوانح نیو تپنگا روڈ، بنگلور
حیات بروز پیر، 23/ جولائی
"حیاتِ وجہی" 1990ء، شام 6 بجے

مہمانِ جناب:
خورشید عالم خاں صاحب
(عزت مآب گورنر گوا،
دمن اور دیو)

83- حیدرآباد لٹریری فورم مقام۔ پریس کلب کلامِ شاعر:
کے زیرِ اہتمام روبرو نظام کالج مغنی تبسم
"مغنی تبسم کے ساتھ ایک ۵½ سماعت شام
شام" جمعہ، ۲۲- فروری
1991ء
صدر: پروفیسر سیدہ جعفر
مہمانِ خصوصی:
بیگم خدیجہ عالم خوندمیری

84- "یوم اقبال" ۲۱/اپریل 1991ء موضوع: "اقبال اور
زیرِ اہتمام: روز یکشنبہ ۱۰½ بجے صبح ہندوستان"
اقبال اکیڈمی حیدرآباد بمقام: دفتر اقبال مقرر: پروفیسر مغنی تبسم
زیرِ صدارت: اکیڈمی
پروفیسر شیو کمار مدنیہ منشن۔ نارائن گوڑہ
حیدرآباد

85- جلسہ تعزیت ۵/مئی ۱۹۹۱ء شریک معتمد ادارۂ ادبیات اُردو
ڈاکٹر آر- آر سکینہ الہام روز یکشنبہ ۵ بجے شام
ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد
کی جانب سے ممتاز فزیشین
اور رباعی گو شاعر ڈاکٹر
آر- آر سکینہ الہام کی
وفات پر
بصدارت جناب
عابد علی خاں

تقریر و نظامت
مغنی تبسم

86- زیر اہتمام ادارۂ ادبیات اُردو حیدرآباد بہ تعاون محکمہ تہذیبی امور آندھرا پردیش ایوان شاد کا تمثیلی مشاعرہ (سلسلہ چار سو سالہ جشن حیدرآباد)
صدارت: جناب محبوب حسین جگر

مقام- رویندر بھارتی تھیٹر (مغنی تبسم)
تاریخ ۱۲/جولائی ۱۹۹۱ء
وقت ۶½ سات بجے شام
شریک معتمد ادارہ ادبیات اردو

87- اُردو ہندی کے ممتاز شاعر جناب عزیز بھارتی (صدر مرکز ادب) کے مجموعہ کلام "چشم معتبر" کی رسم اجراء

۴/جون ۱۹۹۲ء
بروز جمعرات ۵½ بجے شام
بمقام: ابوالکلام آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ باغ عامہ

رسم اجرا بدست:
پروفیسر مغنی تبسم
سابق صدر شعبہ اُردو
جامعہ عثمانیہ

4:00 Pm Center for South -88
Thursday, Asian Studies
14 Nov, 1991 University of
106 Dwinelle California at
Hill, Berkeley
Berkeley Yafis
Campus and
The Beginnings
of
Urdu Literature
Professor
Meghni
Tabassum.
Osmania
University

تقریر - (لیکچر)
پروفیسر مغنی تبسم

89- "شام دکن"
حیدرآباد دکن اسوسی
ایشن کی پیش کش
شام دکن میں حصہ والے کیلیفورنیا -
سنیل کھنہ
شمالی کیلیفورنیا کے جانے
مانے گلوکار
یاسمین، حیدرآباد کی گلوکارہ

۲۹/نومبر 1991ء
روز جمعہ ۷ بجے شام
لوئینا پارک ہوٹل

مہمان خصوصی
جناب مغنی تبسم
(حیدرآباد)

۹۰۔ اورلینڈو اردو سوسائٹی — تاریخ۔ — مہمان شاعر
کی جانب سے — ۶ دسمبر ۱۹۹۱ء — مغنی تبسم
انٹرنیشنل مشاعرہ — بروز جمعہ ۷½ بجے شام
وائس لینڈرو ڈ۔ اورلینڈو

۹۱۔ حیدرآباد لٹریری فورم — مقام پریس کلب روبرو — عوض سعید کی افسانہ نگاری:
کے زیر اہتمام — نظام کالج — پروفیسر مغنی تبسم
"عوض سعید کے ساتھ — ۶ ساعت شام 'منگل'
ایک شام" — جون ۱۹۹۲ء
مہمانِ خصوصی:
جناب محبوب حسین جگر

۹۲۔ The President — محمد قلی شاہ تقاریب
& the members — ادارہ ادبیات اردو
Of the Idara-e-
Adabiyat-e-Urdu,
Hyderabad
Cordially invite
you to grace the
inaugural Session
of : Mohd. Quli
Qutb Shah Day"

انبہام
4 فبروری 1993
پروفیسر مغنی تبسم

"لبنان شاہی۔ گولکنڈہ

۹۳۔ حیدرآباد لٹریری فورم — ۱۳۔ اگست ۱۹۹۳ء — مضمون:
کے زیر اہتمام — جمعہ ۶½ بجے شام — پروفیسر مغنی تبسم
"مرضیہ مجاز کے ساتھ — ابوالکلام آزاد انسٹی ٹیوٹ

ایک شام" باغ عامہ، حیدرآباد صدر جلسہ:
مغنی تبسم

94۔ تقریب رسم اجراء بروز اتوار ۲۹/ اگست زیر صدارت:
ریاض الاخبار ۱۹۹۳ء پروفیسر مغنی تبسم
(اردو ہفتہ وار) ۱۱ بجے دن

رسم اجرا بدست: بمقام۔ ایوان اردو
ڈاکٹر سید عبدالمنان صاحب پنجہ گٹہ حیدرآباد
صدر انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش

95۔ انجمن ترقی پسند مصنفین اور ۱۸/ ستمبر ۱۹۹۳ء صدارت:
حیدرآباد لٹریری فورم روز شنبہ ۶ بجے شام پروفیسر مغنی تبسم
کے زیر اہتمام نمائش گراونڈ مکرم جاہی
برصغیر کے ممتاز افسانہ نگار روٹھ
جناب انتظار حسین
کے اعزاز میں ایک خیر مقدمی
تقریب

96۔ دو روزہ ۱۳/۱۴ نومبر ۱۹۹۳ء "محفل اقبال"
اقبال تقاریب روز شنبہ، یکشنبہ موضوع: ابلیس کی مجلسِ
زیر اہتمام بمقام: مدینہ منشن شوریٰ۔
اقبال اکیڈیمی حیدرآباد نارائن گوڑہ، حیدرآباد نقاط نظر۔
وقت ۱۰½ صبح صدارت:
ڈاکٹر مغنی تبسم

97- بزم زینت آرائی صباحت زہرا بروز دوشنبہ — مقرر
سخن درفشاں — ۲/ڈسمبر ۱۹۹۳ء — پروفیسر مغنی تبسم
ڈاکٹر صبیحہ نسرین — ۴ ساعت شام
بمقام: دربار ہال
ویمنس کالج کوٹھی حیدرآباد

98- جیا مترا — مقرر
ادبی وتہذیبی فورم کی — ۹/ڈسمبر ۱۹۹۳ء — پروفیسر مغنی تبسم
جانب سے — بروز جمعرات
"ایک اور بنیاد" — شام ۶ بجے
اردو تلگو میں پہلا دوسانی بمقام سٹی سنٹرل لائبریری
شعری مجموعہ — چکڑ پلی حیدرآباد
کتاب کی رسم اجرائی۔

99- خصاحت منگ جلیل — ۷/جنوری ۱۹۹۴ — مہمان خصوصی:
کی حیات بشخصیت۔ اور — جمعہ، ۶ بجے شام — پروفیسر مغنی تبسم
فن پر ڈاکٹر تلی — اردو گھر
احمد جلیلی کی تصنیف کی — محل پورہ
اجراء کی تقریب
زیر اہتمام ولد اکیڈیمی

رسم اجراء: منا۔
محبوب حسین جگر
جائنٹ ایڈیٹر
"سیاست"

۱۵۰۔ مخدوم محی الدین کی چھیاسی ۸۶ / فروری ۱۹۹۶ء کنوینر:
وین سال گرہ شام ۶ بجے ڈاکٹر منی تبسم
زیر اہتمام ایوان اُردو ہنجہ گٹہ
ادارہ شعر و حکمت حیدرآباد
مخدوم سوسائٹی
انجمن ترقی پسند مصنفین
حیدرآباد لٹریری فورم
صدارت: ڈاکٹر راج بہادر گوڑ

۱۵۱۔ رقص تنہائی 9 فبروری 1996 صدارت

شعری مجموعہ پروفیسر حفیظ تبسم

علی اصغر ابوالکلام آزاد آڈیٹوریم

صدارت حبیب سید شاہ۔ محمد قادری ❁ باغ عامہ۔ حیدرآباد

102۔ یوم محمد قلی قطب شاہ ۲۰/مارچ ۱۹۹۴ء پروفیسر مغنی تبسم
پینتیسواں سالانہ اجلاس بروز یکشنبہ بوقت
زیر اہتمام ادارہ ادبیات پانچ شام
اردو حیدرآباد بمقام ۔ "باغ فیض اثر"
"گنبدان قطب شاہی"
گولکنڈہ ۔

103 - ادارہ ادبیات اردو ۲۱ ۔ ۲۲/مارچ ۱۹۹۴ کنوینر:
حیدرآباد لائبریری ہال۔ آرکیالوجی ڈاکٹر مغنی تبسم
یوم محمد قلی قطب شاہ اینڈ میوزیمس ڈپارٹمنٹ اینڈ میوزیمس ڈپارٹمنٹ
تقاریب گن فاؤنڈری حیدرآباد
سمینار
"دکنی کلچر کے چند پہلو
حیدرآباد کے خصوصی
حوالے سے"

104۔ رسم اجراء ۱۱/اپریل ۱۹۹۴ء مقرر:
"حرف روشن" ۵ بجے شام پروفیسر مغنی تبسم
مجموعہ کلام بمقام ۔ مولانا ابوالکلام
پیرزادہ وحی قادری آزاد اورینٹل ریسرچ
زیر اہتمام ۔ مکتبہ شعر و حکمت انسٹی ٹیوٹ باغ عامہ
حیدرآباد حیدرآباد۔

زیر صدارت: پروفیسر سید
سراج الدین
اجرا بدست: ڈاکٹر محمد ضیا

الدین احمد شکیب یکشنبہ ۵/جون ۱۹۹۴ء مقررین:
استاد ادبیات اُردو وثقافت شام ساڑھے چھ بجے پروفیسر مُنی تبسم
105۔ شعورِ آگہی بمقام۔ اُردو ہال
(منظوم ڈراموں کا مجموعہ) حمایت نگر
مصنف: رفعت سروش (دہلی) حیدر آباد
تقریب رسم اجراء
زیرِ اہتمام
انجمن ترقی پسند مصنفین
آندھرا پردیش
رسم اجرا بدست۔
جناب علی احمد جلیلی صاحب

106۔ جلسہ سیرت سیدنا امام حسینؓ ۳/جولائی ۱۹۹۴ء مہمانِ خصوصی:
وستار بندی بعد نماز عصر پروفیسر ڈاکٹر مُنی تبسم
مدرسہ حفاظ زینا پولڑی فارم۔ بمقام مدرسہ حفاظ
حمید اللہ نگر
شمس آباد
(بیادگار الحاج سیٹھ حبیب)
زیرِ انتظام:
مالکان حبیب اینڈ کمپنی
بیگم بازار حیدر آباد

107۔ ادارہ ادبیات اردو ۲۷/جولائی ۱۹۹۴ء مُنی تبسم
اور بروز چہار شنبہ پانچ بجے شام
عابد علی خاں ایجوکیشنل ٹرسٹ اُردو گھر مغل پورہ

کے زیر اہتمام

جلسہ تقسیم اسناد اُردو دانی

108۔ زندہ دلان حیدرآباد ۱۶/ستمبر ۱۹۹۴ء صدارت:

حیدرآباد لٹریری فورم بروز جمعہ ۶½ ساعت شام پروفیسر مغنی تبسم

کے زیر اہتمام بمقام: پریس کلب،

طنز و مزاح کے ممتاز شاعر روبرو نظام کالج

طالب خوندمیری

کا

مجموعہ کلام

"سخن کے پردے میں"

رسم اجراء بدست:

جناب نریندر لوتھر

109۔ خصوصی امدادی پروگرام، ۲۶/تا ۲۸ اکتوبر ۱۹۹۴ء دوسری نشست:

یونیورسٹی گرانٹس کمیشن ۲۷/اکتوبر ۱۹۹۴ء

شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی جمعرات ۱۰ بجے دن

حیدرآباد آئی۔سی۔ایس۔آر

سہ روزہ قومی سمینار کانفرنس ہال،

عثمانیہ یونیورسٹی

صدارت: پروفیسر مغنی تبسم

آخری نشست: ۲۸/اکتوبر

جمعہ ۴ بجے شام دربار ہال،

ویمنس کالج، کوٹھی حیدرآباد۔

مشاعرہ: صدارت: پروفیسر مغنی تبسم

110- بہ تقریب رسم اجراء ۲۴/ڈسمبر ۱۹۹۴ء صدارت:
"دھرتی کا دکھ" بروز ہفتہ پانچ بجے شام ڈاکٹر معنی تبسم
فلاورز ون ایجوکیشنل اکیڈیمی بمقام: ابوالکلام آزاد
کے زیر اہتمام ریسرچ انسٹی ٹیوٹ
منفرد افسانہ نگار فریدہ زین آڈیٹوریم باغ عامہ
کا چوتھا افسانوی مجموعہ
رسم اجراء: بدست
ڈاکٹر راج بہادر گوڑ

111- سلور جوبلی کانفرنس ۱۰، ۱۱ اور ۱۲/مارچ مشاعرہ:
کل ہند انجمن ترقی پسند 1995 جمعہ ۱۰/مارچ ۷½ بجے
مصنفین (اردو) گلشن حبیب - اردو ہال شام اردو ہال حمایت نگر
حمایت نگر - حیدر آباد صدارت: پروفیسر معنی تبسم

112- یوم محمد قلی قطب شاہ 1995 ۸/اپریل 1995ء پہلا اجلاس
چھتیسواں سالانہ اجلاس بروز شنبہ پانچ بجے شام ۹/اپریل 1995
زیر اہتمام بمقام "باغ فیض اثر" دس بجے صبح
ادارۂ ادبیات اردو گنبدان قطب "قطب شاہی ایوان اردو پنجہ گٹہ
"ایوان اردو" پنجہ گٹہ روڈ دور میں شعر و ادب اور ابتدائی کلمات:
حیدر آباد - فنون لطیفہ کا فروغ" پروفیسر معنی تبسم
شاہی گولکنڈہ

113- ادارہ ادبیات اردو حیدر آباد منگل ۹/مئی تقریر:
لٹریری فورم، انجمن ترقی پسند 1995ء 6-30 بجے شام پروفیسر معنی تبسم
مصنفین پریس کلب بشیر باغ۔
کے زیر اہتمام حیدر آباد

"کشور ناہید کے ساتھ
ایک شام"

114- جہاں دار افسر — ۲۵/جون ۱۹۹۵ء — افتتاحی خطاب:
شخص اور عکس — بروز اتوار ۴ بجے شام — پروفیسر مغنی تبسم
تقریب رسم اجراء — اُردو گھر مغل پورہ
بدست: مجاہد آزادی
جناب جواد رضوی

115- یوم زور — اتوار ۲۴- سپمبٹر ۱۹۹۵ء — پروفیسر مغنی تبسم
زیر اہتمام — ۱۱ بجے صبح ایوان اُردو — معتمد عمومی
ادارہ ادبیات اُردو حیدر آباد — پنجہ گٹہ روڈ — ادارہ ادبیات اُردو
ڈاکٹر صمدانی الدین قادری زور — حیدر آباد۔ — مخاطب فرمائینگے۔
کی ۳۳ ویں برسی کے موقع
پر ایک ادبی اجلاس

116- Md. Feiyazuddin — On Tuesday, — Speaker :
memorial Trust — 14th November, — Prof Meghni
For educational, — 1995 at 6 P.m — Talassem.
Cultural & Social — at urdu Ghar
uplift ment) — moghalpura
Hyderabad.

117- خورشید احمد جاہی میموریل — ۳۰/نومبر ۱۹۹۵ء — مہمان خصوصی:
اکیڈیمی حیدر آباد۔ — بوقت ۶½ سائمت شام — ڈاکٹر مغنی تبسم
کے زیر اہتمام — بمقام: گاندھی بھون
تقریب رسم رونمائی — حیدر آباد

اُجالوں کی زبان

(شعری مجموعہ)

مصنف: جناب امیر احمد خسرو

بدست: جناب محبوب حسین

جگر

شریک مدیر روزنامہ

"سیاست" حیدرآباد۔

118۔ اردو فیشیول ۱۹۹۵ء ۱۸-۲۳/ڈسمبر ۱۹۹۵ء دوسرا اجلاس

بین جامعاتی ادبی مقابلے ۲۱/ڈسمبر ۱۹۹۵

وقت، ۲ بجے دن

مجلس صدارت:

پروفیسر مغنی تبسم

مشاعرہ

۲۳ ڈسمبر ۱۹۹۵

جمعہ ۵ بجے شام

دربار ہال

ویمنس کالج، کوٹھی

کلام:

ڈاکٹر مغنی تبسم

119۔ اوراقِ ماضی بمقام۔ مولانا ابوالکلام مقرر۔

پروفیسر سید محمد۔ فن اور شخصیت آزاد ریسرچ انسٹی پروفیسر مغنی تبسم

زیر اہتمام نیوٹ بانخطاب۔

ادارہ میرا شہر میرے لوگ ۲۷ جنوری ۱۹۹۶ء جمعرات

صدارت : ڈاکٹر سید نورالحسنین ۶ بجے شام

120- گلوبرس دکن ایجوکیشنل اردو گھر۔ مغل پورہ رسم اجرا بدست:

سوسائٹی حیدرآباد پروفیسر مغنی تبسم

دبیر پورہ حیدرآباد ۸/جنوری ۱۹۹۶ء

کے زیر اہتمام بروز دوشنبہ بوقت

تقریب رسم اجراء ۶ بجے شام۔

"پروفیسر مسعود حسین خاں کی

ادبی خدمات"

مرصنفہ ڈاکٹر ریحانہ سلطانہ

121- رسم اجراء ۲۷/اپریل ۱۹۹۶ء بصدارت:

"کیسے سنائیں" روز شنبہ ۵ ساعت شام پروفیسر مغنی تبسم

مجموعہ کلام استاد سخن اردو گھر مغل پورہ،

جناب حمید رونق حیدرآباد۔

بدست: عالیجناب شاہ

منظور عالم

122- بزمِ سفیران انقلاب حیدرآباد ۷/مئی ۱۹۹۶ء محفل شعر:

کے زیر اہتمام شام کے ۷½ بجے صدارت:

کامریڈز اسوسی ایشن شاخ دار لحمدی گلشن پروفیسر مغنی تبسم

الشفا کی دھدوین چھتہ بازار

سالگرہ۔

123- تقریب رسم رونمائی ۶/جولائی ۱۹۹۶ء مشاعرہ

انتخاب کلام جامی (مرحوم) بوقت ۶½ ساعت شام مہمان شاعر

زیرِ اہتمام بمقام۔ ابوالکلام آزاد ڈاکٹر مغنی تبسم

خورشید احمد جامی میموریل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ
اکیڈیمی حیدرآباد باغ عامہ حیدرآباد
رسم رونمائی :
جناب محبوب حسین جگر

124۔ یوم زور ۲۹/ ستمبر ۱۹۹۶ء کو پروفیسر مغنی تبسم
زیر اہتمام ۱۱ بجے صبح ایوان اردو
ادارہ ادبیات اردو۔ حیدرآباد پنجہ گٹہ حیدرآباد
ڈاکٹر سید محی الدین قادری
زور کی
۳۴ ویں برسی کے موقع پر
ادبی اجلاس

125۔ اقبال اکیڈیمی حیدرآباد ۲۶/۲۷/ اپریل ۱۹۹۷ء دوسرا اجلاس :
دو روزہ سمینار شنب و یکشنبہ بمقام : صدارت :
"حیدرآباد میں اقبال شناسی" مدنیہ منشن روبرو بلڈ پروفیسر مغنی تبسم
بینک نارائن گوڑہ۔
حیدرآباد۔

126۔ ب۔ن۔ ساجد کے ساتھ ایک ۲۶/ جون ۱۹۹۷ء صدارت :
شام بروز جمعرات ۶½ بجے شام پروفیسر مغنی تبسم
بزم "سوکھی ندی" کے زیر اہتمام بمقام :
ادبی اجلاس و مشاعرہ اردو گھر مغل پورہ
حیدرآباد

127۔ مکتبہ شعر و حکمت حیدرآباد دوشنبہ ۲۱/ جولائی ۱۹۹۷ء رسم اجرا :
کے زیر اہتمام بوقت : ۶½ ساڑھے شام بدست ڈاکٹر مغنی تبسم

حسن داد خاں کے بمقام - ابوالکلام آزاد معتمد ادارہ ادبیات اُردو
شعری مجموعہ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ حیدرآباد۔
" ناتمام " باغ عامہ۔
کی رسم اجراء

128۔ قومی کونسل برائے فروغ 17ء، 18ء، 19ء نومبر 1997ء تیسرا اجلاس:
اُردو زبان .. موضوع:

سہ روزہ نئی دہلی ہندوستانی کلاسیکی روایات
سمینار کی بازیافت
"نوآبادیاتی فکر کے منفی ۱۸/نومبر ۱۹۹۷
اثرات:
اردو زبان اور ادبی وقت ۱۲۰۰ بجے دوپہر
نظریات پر"

مقام:
کانفرنس روم راجندر
بھون نئی دہلی

مبصرین:
جناب پروفیسر مغنی تبسم

چوتھا اجلاس:
فروغ اردو کے جامع منصوبہ
پر بحث
۱۸/نومبر ۱۹۹۷ء
وقت: ۶ بجے شام
مقام: انڈیا انٹرنیشنل سنٹر
نئی دہلی۔

شرکا مجلس:

پروفیسر مغنی تبسم

پانچواں اجلاس:

موضوع: فروغ اردو کے

جامع منصوبہ پر بحث (جاری)

19/نومبر 1997ء

وقت 12:00 بجے دوپہر

مقام: کانفرنس روم

راجندر بھون نئی دہلی۔

شرکا مجلس:

پروفیسر مغنی تبسم

129 شعبۂ اردو	20/نومبر 1997	پہلا اجلاس 10½ بجے دن
یونیورسٹی آف حیدرآباد	روز پنجشنبہ	صدارت:
کے زیر اہتمام	بمقام سیمنار ہال۔	پروفیسر مغنی تبسم
ایک روزہ سمپوزیم	اسکول آف ہیومانیٹیز	صدر شعبہ اردو عثمانیہ
"جدوجہد آزادی میں اردو	گچی باولی	یونیورسٹی۔
ادب کا حصہ"		

دوسرا اجلاس

2½ بجے دن۔

صدارت:

پروفیسر عبدالستار دلوی۔

سابق صدر شعبہ اردو

(ممبئی یونیورسٹی)

مہمان خصوصی:

پروفیسر مغنی تبسم

Banjara Hills, with Gham-e-
Hyderabad. Ghazal Society,
on Saturday Hyderabad.
28th March
1998 at
9:00 P.m. Mirza Ghalib's
Bi-Cente Mary
&
Musical Night

134. ادبی تقریب ۹/اگست ۱۹۹۸ء مہمان خصوصی
ڈاکٹر محمد حسین آزر کے مقالہ اتوار ۱/۲ ۴ بجے شام پروفیسر مغنی تبسم
پی۔ایچ۔ڈی بمقام۔ ایوان اُردو
ماہنامہ "سب رس" کی ممتاز پنجہ گٹہ حیدرآباد
کتابیات اور اس کی ادبی
خدمات کی
ادارۂ ادبیات اردو کو
پیش کش

135۔ "تناظر" ۱۷/اگست ۱۹۹۸ء مقرر
(اردو سہ ماہی) بروز دوشنبہ شام ۶ بجے پروفیسر مغنی تبسم
مدیر الحراذی قمر جمالی بمقام۔ اردو ہال
تقریب رسم اجراء گلشن جیب
بدست: جناب بلاج ورما حمایت نگر حیدرآباد

تقریر
پروفیسر مغنی تبسم

136- بابل ریڈی فاؤنڈیشن — لکچر — Urdu Literary award — 26 Sep 1998 — Dr. Mughni at 5:00 P.m. — Talabsum. — By — Shri Lali Yadaljee — on Freedom of Expression

137- مولانا آزاد نیشنل اردو — ۱۱/نومبر ۱۹۹۸ء چہارشنبہ اظہار خیال:
یونیورسٹی - — وقت: پانچ بجے شام — پروفیسر مغنی تبسم
"یوم مولانا ابوالکلام آزاد" مقام: جوبلی ہال،
(۱۱ ویں یوم پیدائش) — پبلک گارڈن،
مہمان خصوصی: عزت مآب — حیدرآباد
پروفیسر اخلاق الرحمٰن قدوائی۔

138- تقریب رسم اجرا — ۱۷/ڈسمبر ۱۹۹۸ء — زیر صدارت:
"سنگ اٹھایا تھا" — بروز پنجشنبہ شام ۶ بجے — ڈاکٹر مغنی تبسم
(افسانوی مجموعہ) مقام۔ اردو ہال
حمایت نگر حیدرآباد
اجرا بدست:
ڈاکٹر راج بہادر گوڑ

139- مکتبہ شعر و حکمت — جمعہ ۵/فبروری ۱۹۹۹ء اظہار خیال:
کے زیر اہتمام — شام چھ بجے — ڈاکٹر مغنی تبسم
بودلیر کی نظمیں — بمقام۔ اردو ہال، حمایت نگر
اردو ترجمہ مظہر مہدی — حیدرآباد
رسم اجرا بدست:
ڈاکٹر زاں پی ایر پاگلی یانو

140۔ حیدرآباد لرایری فورم — ۷/فبروری 1999ء — اظہارِ خیال:
کے زیر اہتمام — ہر روز الوار بوقت ۶½ بجے شام — ڈاکٹر مغنی تبسم
روف خلش کے تیسرے — بمقام: ایوان اردو پنجہ گٹہ
شعری مجموعہ — حیدرآباد
"شاخ زیتون"
کی رسم اجراء بدست:
محترمہ شفیق فاطمہ شعری

141۔ جلسہ اعترافِ خدمات — ۲۶-۲۷/فبروری 1999ء
مغنی تبسم — بمقام: بنجارہ کلب۔
مکرم جاہی روڈ
افتتاح: — حیدرآباد۔
راجہ کماری اندرا دھن راج گیر

صدارت:
ڈاکٹر راج بہادر گوڑ

خطبہ استقبالیہ:
جناب نواب شاہ عالم خاں

142۔

یوم محمد قلی قطب شاہ — 28 فبروری 1999
زیر اہتمام
پروفیسر مغنی تبسم

143۔ ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد چہارشنبہ ۲۴/مارچ رسم رونمائی :
۲ندھراپردیش کے زیراہتمام 1999 بدست ڈاکٹر مغنی تبسم
محترمہ رئیسہ محمد کے مجموعہ ۵½ بجے سائمت شام
مضامین بمقام : ایوان اُردو
"شان امن" پنجہ گٹہ حیدرآباد
کی رسم رونمائی

144۔ نور الانصار میموریل ۳/اپریل 1999ء صدارت:
اکیڈیمی کے زیراہتمام ۶ سائمت شام پروفیسر مغنی تبسم
تقریب رسم اجراء اُردو گھر مغل پورہ۔
"آیھا الناس" حیدرآباد
شعری مجموعہ
مصنف حضرت مولانا
ڈاکٹر راہی فدائی

رسم اجرا بدست:
جناب مضطر مجاز

145۔ زاویہ قادریہ ٹرسٹ رجسٹرڈ ۱۷/ذی الحجہ ۱۴۱۹ھ صدارت:
کا عظیم الشان جلسہ ۵/اپریل 1999ء پروفیسر مغنی تبسم
مشاعرہ۔ بروز دوشنبہ شعبہ اُردو، اردو یونیورسٹی
رسم اجراء ٹملناڈو کے بوقت ۵ سائمت شام
مشاہیر ادب بمقام:
مصنف: حلیم صابر ویدی اُردو گھر مغلپورہ،
مرتب: حیدرآباد
جاویدہ حبیب، ایم۔اے ایم فل

146۔ مکتبہ شعر و حکمت، پنجہ گٹہ، بروز جمعہ 9/اپریل 1999ء رسم افتتاح بدست:
حیدرآباد بوقت 3:30 شام پروفیسر مغنی تبسم
کے زیر اہتمام بمقام اردو ہال، انیس
ممتاز شاعر عمر یر حسین عزیز الرحمٰن ملاک
کے پہلے شعری مجموعہ حمایت نگر، حیدرآباد
"صدائے کرب"
کی رسم اجراء

147۔ ادارہ ادبیات اُردو 13/اپریل 1999 صدارت:
کے زیر اہتمام بروز سہ شنبہ پروفیسر مغنی تبسم
ڈاکٹر علی احمد جلیلی کے تیسرے بوقت 6:30 شام
تنقیدی مجموعہ بمقام: ایوان اُردو، پنجہ گٹہ
غالب ایک مطالعہ حیدرآباد۔
کی رسم رونمائی
رسم رونمائی بدست:
ڈاکٹر حسن الدین احمد

148۔ Society of Friends International بمقام: کوفا گیلری لندن 15/جون 1999ء بوقت: 7 شام
تنظیم "سوفی" کے زیر اہتمام
مشاعرہ
صدارت: مشتاق احمد یوسفی
مہمانِ خصوصی: زہرا نگاہ

شعرا
○ پروفیسر مغنی تبسم
○ راشد آزر
○ صدیقہ شبنم

149 - اپنی اپنی نسل کو زبان کی امانت سونپنے کی شعوری کوشش کرنے کے لئے

مہمانِ خصوصی: محترمہ زبرا نگاہ
اور پروفیسر مغنی تبسم
میں

جمعہ ۱۱ جون ۱۹۹۹ء
بوقت: ساڑھے چھ بجے شام.
بمقام: کانوے ہال،
ریڈلڈین اسکوئر، لندن
ڈبلیو سی ون

"اُردو ورثہ"
کا قیام عمل میں آیا ہے۔

Yamvad:
Mughni
Tabassum

on monday, 19 July 1999, at 3:00 P.m at Gyan Bagh Palace, Gosha Mahal, Hyderabad.

Sahitya Akademi-150
Southern Regional
Office, Bangalor.
Fellow Ship
Presentation
to Beshendra
Sharma Eminent
Telugu poet and
Yamvad
Programme.

ترجمہ و تحریر
پروفیسر مغنی تبسم

152۔ سمپوزیم چہار شنبہ ۲۲/ستمبر صدارت:
موضوع: عمضری اردو افسانہ 1999 پروفیسر مغنی تبسم
اور اسکا تیور شام ۵ بجے
مہمانِ خصوصی: مجروح ڈپارٹمنٹ آف اُردو
سلطان پوری یونیورسٹی آف ممبئی

153۔ ایم۔ زیڈ۔ صدیقی ۲۷/اکتوبر 1999ء رسم اجراء بدست:
ایم۔ اے ایم۔ ایڈ بروز چہار شنبہ ڈاکٹر مغنی تبسم
کے ناول شام ۶ بجے سابق صدر شعبہ اردو
"زہرہ" بمقام اُردو ہال حمایت نگر جامعہ عثمانیہ۔
کی تقریب رسم اجراء حیدرآباد

154 On 26-11-1999 Government of
in Ambedkar Andhra Pradesh
Bhavan, Lower Minorities
Tank Bund Welfare (M.F.&)
Road, Hyd- Department.

Indian Lit:
Urdu: Prof Meghni Tabassum
Topic:
"New Trend & Movements In The Twentieth Century Literature"
5-12-99
Sunday,
10:00 am to
1:00 pm

Roshni - For the Welfare Of Minorities.
Andhra Pradesh-155
Ravindra Bharati Hyderabad.
on 4th & 5th December 1999

State Cultural Council
A Two-Day National Seminar on New Trends in The Twentieth Century Literature"
Chief Guest:
Shri P. V. Narasimha Rao
Former Prime minister of India
President: Shri Hari Chandrabhanu Naidu Khirbhe

157۔ ادارہ ادبیات اُردو حیدرآباد بہ روز جمعہ کنوینر:

تقریب رسم اجرا ۱۴/جنوری ۲۰۰۰ء پروفیسر مغنی تبسم

غالب: شخصیت اور عہد بہ سماعت شام

مصنف بہ مقام دربار ہال،

جناب پون کمار ورما راج بھون سوماجی گوڑہ

ترجمہ حیدرآباد

جناب اسامہ فاروقی

رسم اجرا بدست

ڈاکٹر سی۔ رنگا راجن

گورنر ریاست آندھرا پردیش

158- مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی سہ روزہ سمینار "ترجمہ، املا اور اصطلاحات ڈی لکس کالونی، ٹولی چوکی، صدارت: پروفیسر گوپی چند نارنگ

۲۲-۲۴ جنوری ۲۰۰۰ء بمقام: کانفرنس ہال، نظامت فاصلاتی تعلیم، حیدرآباد

اتوار ۲۳/جنوری ۲۰۰۰ء اجلاس سوم: ۱۰ تا ۲ بجے دن "اردو املا" کلیدی مضمون: پروفیسر مغنی تبسم

مسائل اور عصری تقاضے"

159- حلف اٹھاؤ ادبیات اُردو، فورم ہاؤرن بھاٹ زندہ دلانِ حیدرآباد تقریب رسم اجرا ممتاز شاعر ستار صدیقی کا پہلا شعری مجموعہ "حرف خط کشیدہ" رسم اجرا بدست: پروفیسر سید سراج الدین

۵/فبروری ۲۰۰۰ء ہفتہ ۶ بجے شام ایوانِ اُردو پنجہ گٹہ، حیدرآباد صدارت: پروفیسر مغنی تبسم

160- Visiting Indian Urdu Poet Dr Mughni Tabassum addressing Students Ideal at the School بمقام: قطر 19-2-2000 تقریر: پروفیسر مغنی تبسم

بمنوان: "اردو زبان کا ارتقا"

161۔ حلف اداۂ ادبیات اردو یکم مارچ ۲۰۰۰ء صدارت:
زندہ دلان حیدرآباد چہارشنبہ ۶ بجے شام پروفیسر مغنی تبسم
اقبال اکیڈیمی کے زیرِاہتمام اردو ہال، حمایت نگر
تقریبِ رسم اجرا حیدرآباد
ڈاکٹر بیگ احساس
کا تحقیقی مقالہ
کرشن چندر: شخصیت اور فن
رسم اجرا بدست: عالی جناب
رشید حسن خاں

162- Inaugural address : Prof: Mughni Tabassum Professor of Urdu Osmania University, Hyd.

07-03-2000 Time : 11:00 am

University of Mysore Academic Staff College and Department of Studies in Urdu The first Refresher Course in Urdu Organised for University and College Teachers Director : Prof K.M Rajashekara Chairman &

Co-Ordinator

Prof Masood Hisaj

Professor Mughni Tabassum.

Topics	Date	Time
1. Trends in modern Criticism	7-3-2000	2:15 To 3:45 P.m.
2. Usloobiyathi Tanqueed	8-3-2000	11:45 To 1:15 P.m.
3. Sakhtiathi Tanqueed	8-3-2000	2:15 To 3:45 P.m.
4. Pas Sakhtiathi Tanqueed	9-3-2000	11:45 To 1:15 P.m.
5. Masri Tanqueed	9-3-2000	2:15 To 3:45 P.m.

163۔ "بے پاؤں کا سفر" ۲۵ مارچ ۲۰۰۰ء بہ رسم اجرا بدست:

راجہ دوبے ساعت شام ۶ بجے پروفیسر مغنی تبسم

رسم اجرا بمقام ایوانِ اُردو پنجہ گٹہ

بہ دست پروفیسر مغنی تبسم

"سڑک صرف راستہ نہیں"

سوادھین "رسم اجرا"

164۔ اُردو محرک انقلاب آزادی ہند تاریخ: ۲۶/مارچ ۲۰۰۰ء

فیض احمد فیض میموریل وقت ۱/۲ ۶ ساعت شام

انٹرنیشنل عالمی لائحہ عمل جانب محفل" ایوان اُردو

امریکہ میں اُردو رعنائیاں پنجہ گٹہ حیدرآباد۔ انڈیا

واجبِ قدیم شناگوں کی زبانی

محظمت شہ نشین :

جناب سید شاہ نورالحق قادری،

ایڈوکیٹ صدر اُردو اکیڈیمی

آندھرا پردیش، حیدرآباد

عنانِ صدارت :

پروفیسر مغنی تبسم - نقادِ عہد

فیضی احمد فیضی میموریل انٹرنیشنل

کی ۲۱ ویں صدی کی پہلی شام

ادبی - تہذیبی - انگڑائیاں

۱- معماران اُردو کی آمد

165- اُردو تنقید کے عصری ۳۰/مارچ ۲۰۰۰ء صدارت:

رجحانات پر سیمینار ہال، اسکول آف پروفیسر مغنی تبسم

حیدرآباد یونیورسٹی میں ہیومانیٹز یونیورسٹی کیمپس

قومی سیمینار گچی باولی - حیدرآباد

166- یومِ محمد قلی قطب شاہ ۲۸ مئی ۲۰۰۰ء افتتاح : پروفیسر افضل محمد

تقاریب ۲۰۰۰ء بہ روز یک شنبہ رواُس چانسلر ڈاکٹر

اکتالیس واں سالانہ اجلاس بہ وقت ۶ ساعت شام بی - آر - امبیڈکر اوپن

زیرِ اہتمام ادارۂ ادبیات بہ مقام قطب شاہی مقابر یونیورسٹی، حیدرآباد -

اُردو، حیدرآباد - گول کنڈہ صدارت: جسٹس سید سماوت

اللہ حسینی

(چیرمین اسٹیٹ ہیومانیٹز

کمیشن حکومت آندھرا پردیش)

یوم محمد قلی قطب شاہ تقاریب

صدر: پروفیسر جعفر نظام

نائب صدر: زاہد علی خاں

معتمد: پروفیسر مغنی تبسم

شریکِ معتمد: سید صفی الدین

قادری نور

کنوینر: موہن پرشاد

کنوینر: پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ

167. ہاشم علی اختر کا خیر مقدمی جلسہ تاریخ ۲۱/جون ۲۰۰۰ء صدارت:

ادارۂ ادبیات اُردو ادارۂ ادبیات اُردو ، پروفیسر مغنی تبسم

پنجہ گٹہ ، حیدر آباد

being held on 26.06.2000 at 6:30 P.m Venue: Durbar Hall, Raj Bhavan.

The Governor And Dr. (SMT.) Haripriya Raja Rajan Cordially invite you to attend Urdu Mushaira By Idara-e-Adabiyat-e-Urdu, Hyderabad. in Connection with

168.

Md. Quli Qutub Shah Celebrations (2000)

169۔ مجلس استقبالیہ ۳۰/جولائی ۲۰۰۰ء

اعترافِ خدمات اتوار ساڑھے دس بجے دن

کے زیرِ اہتمام بہ مقام منہروآڈیٹوریم

تقریب اجرا مدینہ ایجوکیشن سنٹر ناملی

"نذرِ معنی تبسم" و حمید آباد

"شعر و حکمت"

صدارت: شیو۔ کے۔ کمار

رسم اجراء "نذرِ معنی تبسم"

جناب شاہد مہدی

(وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ)

رسم اجراء "شعر و حکمت"

جناب مجتبیٰ حسین

مہمانِ خصوصی:

جناب زبیر رضوی

پروفیسر لطف الرحمٰن

خیر مقدم:

پروفیسر سلیمان اطہر جاوید

نظامت:

ڈاکٹر بیگ احساس

مشاعرہ۔ ساڑھے چھ بجے شام

صدارت: پروفیسر شہریار

مہمانانِ خصوصی:

جناب بشیر نواز

جناب نفیس نمازی پوری

نظامت: اسلم فرشوری

کنوینر: محمد حمایت اللہ

170۔ "مشاعرہ" ۱۴/ جولائی ۹ بجے شب صدارت:

ایوانِ اردو پنجہ گٹہ پروفیسر مغنی تبسم

171۔ انجمن شعرائے اردو ہند دوحہ۔ قطر

غزل سمپوزیم مقام: رامادا ہوٹل

اور مشاعرہ بروز جمعرات، ۱۴ ستمبر

بہ اعزاز ۲۰۰۰ء

ڈاکٹر مغنی تبسم وقت ۸:۳۰ بجے شب

(نقاد، شاعر، محقق)

بہ عنوان

"اردو غزل کی عہد بہ عہد

ترقی، اور اردو کی ترویج

میں مشاعرے کا کردار"

صدارت: عزت مآب

آر۔ ایل۔ نارائن صاحب

سفیر ہند برائے قطر چہار شنبہ ۴۰/ ستمبر

172۔ حیدرآباد کلچرل سوسائٹی ۲۰۰۰ء

کے زیر اہتمام بہ مقام:

تقریب سپاس
بہ اعزاز
Indian Culture Centre Doha
ڈاکٹر مفتی تبسم
(لفاظ و شاعر، محقق)

مہمان اعزازی:
ڈاکٹر اوصاف سعید
سکریٹری اول ایمبسی آف انڈیا

173۔ عالمی فروغِ اردو ادب ایوارڈ بہ روز جمعرات ۲۱/ستمبر صدارت:
بہ اعزاز ۲۰۰۰ء مفتی تبسم
محترمہ بانو قدسیہ بمقام: الدفنہ آڈیٹوریم
(پاکستان) دوحہ شیراٹن ہوٹل
جناب جوگندر پال
(ہندوستان)
قسیرا سلیم جعفری انٹرنیشنل
ایوارڈ، بہ اعزاز
جناب چانگ شی شوان
(انتخاب عالم)
(عوامی جمہوریہ چین)

مہمانِ شعرائے کرام:
جناب مفتی تبسم

174۔ جشن بشیر بدر دوحہ
زیر اہتمام: بہ روز جمعرات ۲۱/ستمبر
مجلس فروغ اردو ادب ۲۰۰۰ء

صدارت:

جناب امجد اسلام امجد

صدارت عالمی ایوارڈ:

لیفٹیننٹ جنرل

معین الدین حیدر

وفاقی وزیرِ داخلہ حکومتِ

پاکستان

ہندوستان سے مہمان

شعرائے کرام میں:

جناب مغنی تبسم

175 ادارۂ ادبیات اُردو، حیدرآباد ۸/ اکتوبر ۲۰۰۰ء صدارت:

کے زیرِ اہتمام اتوار ساڑھے دس بجے دن پروفیسر مغنی تبسم

تقریب رسم اجرا بمقام ایوانِ اردو

"فریب زار" (ناول) پنجہ گٹہ حیدرآباد

تصنیف: جناب غلام جیلانی

رسم اجرا بدست:

پروفیسر جعفر نظام

176۔ یومِ زور ۲۲/ اکتوبر ۲۰۰۰ء صدارت:

پروفیسر مغنی تبسم

177۔ تقسیم غالب انعامات ۱۷/ نومبر ۲۰۰۰ء خطبۂ افتتاحیہ:

اور افتتاح دہلی پروفیسر مغنی تبسم

بین الاقوامی غالب سیمینار

178۔ غالب انسٹی ٹیوٹ ۱۸/نومبر ۲۰۰۰ء مقالہ :
کے زیر اہتمام دہلی پروفیسر مغنی تبسم
بین الاقوامی غالب سمینار
موضوع
"مرزا محمد رفیع سودا
(غالب کے پیش رو)"

179۔ غالب انسٹی ٹیوٹ ۱۹/نومبر ۲۰۰۰ء پانچواں اجلاس
کے زیر اہتمام دہلی صدارت :
بین الاقوامی غالب سمینار صبح ۱۰ بجے پروفیسر مغنی تبسم
موضوع
"مرزا محمد رفیع سودا
(غالب کے پیش رو)"

180۔ رسم اجرا
"اردو تحریک آزادی سے قبل"
مصنفہ : شفیعہ قادری

182۔ ادارۂ ادبیات اردو ۳/مارچ ۲۰۰۱ خطبہ افتتاحیہ :
کے زیر اہتمام ۶ بجے شام پروفیسر مغنی تبسم
پروفیسر گوپی چند نارنگ
کا خصوصی لکچر
بعنوان "ادب کا موجودہ
منظر نامہ — مسائل اور مباحث

183- یوم محمد قلی قطب شاہ ۴/مارچ بروز اتوار تقاریب کا افتتاح:
تقاریب ساڑھے پانچ بجے شام پدم بھوشن پروفیسر شیدن کے کمار
سابق وائس چانسلر
حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی
صدارت: پروفیسر گیان ناتھ
آزاد، صدر انجمن ترقی
اردو ہند نئی دہلی
مہمان خصوصی:
پروفیسر گوپی چند نارنگ
نائب صدر ساہتیہ اکیڈیمی
نئی دہلی۔

184- ادارہ ادبیات اُردو ۱۱/مارچ ۲۰۰۱ء صدارت:
کے زیر اہتمام صبح 10:30 بجے پروفیسر مغنی تبسم
محمد قلی قطب شاہ تقاریب بمقام ایوانِ اُردو
کے سلسلہ میں پنجہ گٹہ، حیدرآباد
"دکنی ادب میں تصوف"
کے موضوع پر ادبی اجلاس

185- زیر اہتمام مکتبہ شعر و حکمت ۱۴/مارچ ۲۰۰۱ صدارت: پروفیسر مغنی تبسم
اعتماد صدیقی کے پہلے چہار شنبہ 6:30 بجے شام رسم اجرائیدست:
شعری مجموعہ بمقام: اُردو ہال محترمہ پدماشری جیلانی بانو
"ریت کا دریا" حمایت نگر، حیدرآباد مہمان خصوصی: انور معظم
کی رسم اجراء

185- کل ہند سیمینار ۱۱ و ۱۷/ مارچ ۲۰۰۱ء پہلا اجلاس
جودھپور مقالہ نگار:
پروفیسر مغنی تبسم
دوسرا اجلاس
صدارت:
پروفیسر مغنی تبسم

186- کتاب "دکنی مناقب" ۱۲/ جولائی ۲۰۰۱ء صدارت:
کا انتساب" ۷:۳۰ بجے شام پروفیسر مغنی تبسم
کی رسم اجراء بمقام- انیس الرحمٰن بلاک رسم اجراء بدست:
اُردو ہال، حمایت نگر جسٹس سعادت اللہ حسینی۔
حیدرآباد صدر نشین ریاستی
اقلیتی کمیشن آندھراپردیش

187- انجمن ترقی پسند مصنفین ۱۴/ جولائی ۲۰۰۱ء بصدارت:
کا اجلاس ۷ بجے شام پروفیسر مغنی تبسم
بمقام اُردو ہال
حمایت نگر، حیدرآباد

188- یادِ مخدوم و شاد ۳۰/ اگست جمعرات صدارت:
ایک بجے دن پروفیسر مغنی تبسم
بمقام سمینار ہال
آرٹس کالج جامعہ عثمانیہ

189- ڈاکٹر مرلی منوہر جوشی کا جمعرات ۶/ ستمبر 2001 صدارت:
ماہرین تعلیم سے خطاب ایک بجے دن، ایوان اُردو پروفیسر مغنی تبسم
حیدرآباد۔

190۔ انجمن ترقی پسند مصنفین 15/ ستمبر شام 6 بجے ۔ صدارت
آندھراپردیش کی بروز ہفتہ پروفیسر مغنی تبسم
عاملہ کا اجلاس بمقام: ادارۂ ادبیات اُردو
پنجہ گٹہ حیدرآباد

191۔ رسم اجراء 3/ فبروری ۲۰۰۲ء
'جہاں دارِ افسر' اردو گھر مغل پورہ'
حیات اور خدمات
مصنف: جسٹس سردار علی
خاں

192۔ رسم اجراء منگل 12/ فبروری ۲۰۰۲ء مغنی تبسم
اردو شعری مجموعہ کو 6:30 بجے شام شخصیت اور شاعری پر
"بہتا ہوا نغمہ" جوبلی ہال باغ عامہ" اظہار خیال
مصنف: ڈاکٹر سی نارائن
ریڈی

193۔ رسم اجراء 8/ مارچ ۲۰۰۲ء
'مٹی مٹی میرا دل" اردو ہال، حمایت نگر
ہندی میں ترجمہ کے ساتھ حیدرآباد۔
مصنف سوادھن

رسم اجراء
شیو کے کمار

194۔ رسم اجراء ۲۹/ مارچ ۲۰۰۲ء مغنی تبسم صاحب
'فشارِ خط' رسم اجراء
جناب رحمٰن جامی کے مجموعہ کلام

195- "جشن شاعر اور یادِ شاعر" ہفتہ 13/اپریل ۲۰۰۲ء کنوینر
خان اطہر کے پروگرام 7 بجے شام پروفیسر مغنی تبسم
نادِ شاعر بابا صاحب
امبیڈکر جینتی 14/اپریل
اتوار ۶ بجے شام یہ
دونوں پروگرام قطب اسٹیڈیم میں پیش کیے۔

196- کادمبنی کلب حیدرآباد 16/جون گیارہ بجے
کے زیرِ اہتمام بمقام ہندی پرچار سبھا
وانی پرکاشن نیشنل پبلیشر ناملی اسٹیشن روڈ کے
نئی دہلی نے دیوناگری فنکشن ہال میں ایک
میں شائع کیا۔ سیمینار منعقد کیا۔

197- مجموعہ کلام "نظارہ" ۱۳/اکتوبر ۲۰۰۲ء صدارت:
کی رسم اجراء 6:30 بجے شام پروفیسر مغنی تبسم۔
آلیم ادب کے زیرِ اہتمام اردو ہال گلشن حبیب
حمایت نگر، حیدرآباد

198- حیدرآباد اکیڈیمی کا ادبی اجلاس ۳/نومبر ۲۰۰۲ء صدارت:
کے زیرِ اہتمام یکشنبہ کے دن پروفیسر مغنی تبسم
"جائزہ" کے عنوان کے بمقام:
تحت ادبی اجلاس ادارۂ ادبیاتِ اُردو
"ایوانِ اُردو"
پنجہ گٹہ، حیدرآباد۔

199- رسم اجراء — بہ روز جمعہ ۲۷/ڈسمبر — کنوینر:
'ہماری زندگی اسلام کی — ۲۰۰۲ء — پروفیسر مغنی تبسم
روشنی میں' — بہ وقت: گیارہ بجے دن
تالیف: — بمقام:
جناب شاہد صدیقی — جگر ہال' روزنامہ سیاست'
صدارت:
جناب زاہد علی خان
صدر ادارہ ادبیات اُردو

200- "آج کی شام مجتبیٰ حسین — ۳۰/ڈسمبر ۲۰۰۲ء — مہمان خصوصی:
کے نام" — بروز دوشنبہ شام چھ بجے — پروفیسر مغنی تبسم
حیدرآباد اکیڈیمی کا ادبی اجلاس بمقام: — جناب زاہد علی خان
صدارت: — روزنامہ سیاست کے گولڈن — ایڈیٹر 'سیاست'
ڈاکٹر راج بہادر گوڑ — جوبلی ہال' حیدرآباد

	کتاب کا نام	جماعت	سنہ اشاعت	ایڈیٹر
۱۔	نکاتِ اُردو	سینیر کیمبرج کی جماعتوں کے لئے	1956	مغنی تبسم
2۔	اُردو کی ساتویں کتاب سرسری مطالعہ	برائے ساتویں جماعت	1995, 96, 97	چیف ایڈیٹر: پروفیسر مغنی تبسم
3۔	اُردو کی دسویں کتاب سرسری مطالعہ ننھا شہزادہ	برائے جماعت دہم	1998	پروفیسر مغنی تبسم
4۔	نگارشات زور	برائے فاضل		پروفیسر مغنی تبسم

کتاب کا نام	سنہ اشاعت	پبلیشر	تالیفات
۱۔ فانی کی نادر تحریریں	ڈسمبر ۱۹۶۸ء	مکتبہ صبا حیدرآباد	ڈاکٹر مغنی تبسم
۲۔ فکرِ اقبال (مقالات ۔ حیدرآباد سمینار)	جنوری ۱۹۷۷ء	کل ہند اقبال صدی تقاریب کمیٹی حیدرآباد	ڈاکٹر مغنی تبسم، ڈاکٹر عالم خوندمیری
3۔ کہانیاں (پہلی جلد)	۱۹۸۰ء	بمبئی	ڈاکٹر مغنی تبسم وحید انور
4۔ فانی بدایونی			مغنی تبسم
ہندوستانی ادب کے معمار	۱۹۹۳ء		
5۔ انگریزی میں معاصر ہندوستانی کہانیاں	۱۹۹۶ء	ساہتیہ اکادمی نئی دہلی	پروفیسر مغنی تبسم، قدیر زماں
6۔ عصری ہندوستانی کہانیاں جلد ۴	۲۰۰۱ء		مغنی تبسم، بلراج کومل
7۔ دکنی لغت و تذکرہ دکنی مخطوطات	جنوری ۲۰۰۲ء		پروفیسر مغنی تبسم

کتابیات

	مصنف	کتاب کا نام	سنہ اشاعت	مقامِ اشاعت
1-	مغنی تبسم	نوائے تلخ	۱۹۴۸ء	محمد صدیق
2-	" "	نانی بدایونی، حیات شخصیت اور شاعری	۱۹۷۹ء	نیشنل نائن پرنٹنگ پریس۔ چارکمان۔ حیدرآباد
3-	" "	نانی کی نادر تحریریں	۱۹۷۵ء	
4-	" "	پہلی کرن کا بوجھ	۱۹۸۵ء	نعمانی پریس، دہلی
5-	" "	مٹی مٹی میرا دل	۱۹۹۱ء	او۔ ایس۔ گرافکس، نارائن گوڑہ
6-	" "	بازیافت (تبصرے)	مارچ ۱۹۶۸ء	
7-	" "	تلگو ادب کی تاریخ پر ایک نظر	۱۹۵۶ء	
8-	" "	نغماتِ اردو	۱۹۵۶ء	
9-	" "	شادی کی آخری سالگرہ	۱۹۸۵ء	
10-	" "	کہانی اور اسی کا فن	۱۹۵۷ء	
11-	" "	آواز اور آدمی	مئی ۱۹۸۳ء	
12-	" "	لفظوں سے آگے	۱۹۹۳ء	
13-	گوپی چند نارنگ	ادبی تنقید اور اسلوبیات	۱۹۸۹ء	ایجوکیشنل بک ہاس الہ آباد
14-	" "	اقبال کا فن	۱۹۸۲ء	ایجوکیشنل بک ہاس الہ آباد
15-	شمس الرحمٰن فاروقی	اردو غزل کے اہم موڑ	۱۹۹۸ء	غالب اکیڈیمی، دہلی
16-	شارب ردولوی	معاصر اردو تنقید، مسائل و میلانات	۱۹۹۴ء	اردو اکیڈیمی
17-	" "	ساختیات اور پس ساختیات	۱۹۸۳ء	اردو اکیڈیمی

18- لطف الرحمن	جدیدیت کی جمالیات	۱۹۹۳ء	شائکہ پبلشنز، جمشید پور
19- وزیر آغا	تنقید اور جدید اردو تنقید	۱۹۸۹ء	مکتبہ جامعہ دہلی
20- یعقوب یاور	ترقی پسند تحریک اور اردو شاعری	۱۹۹۷ء	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی
21- یوسف تقی	ترقی پسند تحریک اور اردو نظم	۱۹۸۰ء	دیا نرائن فکر و فن کلکتہ
22- شمیم حنفی (پروفیسر)	جدیدیت کی فلسفیانہ اساس	۱۹۷۷ء	مکتبہ جامع لمیٹڈ دہلی
23- عقیل احمد صدیقی	جدید اردو نظم نظریہ و عمل	۱۹۹۰ء	ایجوکیشنل بک ہاؤس
24- عبارت بریلوی	جدید شاعری	۱۹۸۳	ایجوکیشنل بک ہاؤس
25- جمیل جالبی (ڈاکٹر)	میرا جی ایک مطالعہ	۱۹۹۲	" " "
26- خالد علوی (ڈاکٹر)	غزل جدید رجحانات	۱۹۹۴	" " "
27- شفیعہ قادری	حیدرآباد کے علمی و ادبی اداریے	۱۹۸۳	مکتبہ شعر و حکمت
28- سید احتشام حسین	تنقیدی نظریات	۱۹۷۴	مرزا از پریس لکھنو
29- " " "	تنقید اور عملی تنقید	۱۹۷۷ء	" " "
30- " " "	تنقید نظریات	۱۹۸۰	نامی پریس لکھنو جلد دوم
31- شارب ردولوی	جدید اردو تنقید اصول اور نظریات	۷ جون ۱۹۶۸ء	ماڈل ٹاؤن، دہلی
32- وحید اختر (ڈاکٹر)	فلسفہ اور ادبی تنقید	مئی ۱۹۸۲ء	پبلشرز کلٹوریہ لکھنو

33 - شارب ردولوی — اردو تنقید کا ارتقاء — 1968ء — اعتماد کتاب گھر دہلی

34 - خواجہ الطاف حسین حالی — مقدمہ شعر و شاعری — — الناظر پریس واقع لکھنو

35 - سید اقبال قادری — رہبر اخبار نویسی — جنوری، مارچ 1989 تک — جے۔کے آفسٹ، پرنٹرز، دہلی۔

37 - ساجدہ زیدی — شخصیت کے نظریات — 1985ء — نرمل اردو بیورو نئی دہلی

37 - مخدوم محی الدین — شاذ تمکنت — ستمبر 1986ء — مکتبہ شعر و حکمت

38 - (مرتبہ) مسعود حسین خان — اردو میں لسانیاتی تحقیق — مئی 1971ء — اورینٹل بک پبلرس اینڈ پبلشرز بمبئی

39 - گوپی چند نارنگ — اردو مابعد جدیدیت پر مکالمہ — 1998ء — اردو اکادمی، دہلی

40 - مشفق خواجہ — تحقیق نامہ — 1991ء — مغربی پاکستان اردو اکیڈیمی لاہور۔

41 علی احمد فاطمی — نئی تنقید نئے اقدار — ستمبر 1999ء — شارپ ٹریک کمپیوٹرز الہ آباد

42 - زینت ساجدہ — تلگو ادب کی تاریخ — نومبر 1960ء — انجمن ترقی اردو حیدر آباد

41 - سید عابد علی عابد — اصول انتقادِ ادبیات — 1960 — مجلس ترقی ادب لاہور

42- پروفیسر ظہیر احمد صدیقی — جدید شاعری — ۱۹۹۳ء — ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ

43- عابد علی عابد — اسلوب — ۱۹۷۶ء — ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ

44 - دیوبندر اِستر — فکر اور ادب — ۱۹۵۸ء — مکتبہ قمر اردو، اردو بازار دہلی

45 - احمد آصف جامی — عہد عثمانی میں اردو خدمات — ۱۹۷۹ء — اکمل فائن آرٹ جامع مسجد محبوب چوک، حیدر آباد

46 - وزیر آغا — معنی اور تناظر — دسمبر 1998 — مکتبہ جدید پریس لاہور

47 - علی احمد جلیلی — نقد و نگاہ — 1997 — اعجاز پرنٹنگ پریس چھتہ بازار، حیدر آباد

48 - طارق سعید — اسلوبیاتی تنقید تناظر و جہتی سے قرۃ العین حیدر تک — ۱۹۹۳ء — ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ

49- ابواللیث صدیقی — غزل اور متغزلین — ۱۹۶۸ء — بھارتی پبلیکیشنز گڑھیا مٹیا محل دہلی

50- مظفر شہ میری — اردو غزل کا استعاراتی نظام — ۱۹۹۴ء — معراج پبلیکیشنز - بالاجی کالونی، نزد ہنی

51 Mansur Rahman Faruqi — The Secret Mirrors — 1981 — Marion Shahdara, Delhi-

52 جابد علی سید — لسانی و عروضی مقالات — ۱۹۸۹ء — مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد

Sahitya Akademi - 1993 A History of urdu Literature Ali Jawad- 52 Zaidi

53- جمال الدین جمال اردو شاعری میں مرقومہ اوزان ۱۹۹۸ء بیسمنٹ الکریم مارکیٹ، اردو بازار لاہور۔

54- ابو ظفر عبدالواحد آہنگ شعر ۱۹۷۸ء اردو اکیڈیمی، آندھرا پردیش حیدرآباد۔

55- گیان چند تحریریں ۱۹۶۴ سرفراز قومی پریس۔ لکھنو

56- محمد نورالدین خاں تاریخ وادب ۱۹۹۲ دائرہ پریس چھتہ بازار حیدرآباد۔

57 یوسف سرمست تحقیق و تنقید ۱۹۹۹ شارپ کمپیوٹرس، محبوب بازار کامپلکس، چادرگھاٹ، حیدرآباد

58- Ogden, C.K and Richards, I. A, The Meaning of Meaning, London 1923

59- Principls of Literary Criticism London, 2nd ed. 1926.

60 Stauffer, Donald, The Nature of Poetry, New York, 1946.

61. Stead C.K, The New Poetics, London, 1964

62. Wellek, Rene and Warren, Austin, Theory of Literature, London, 1961

63. Witner H.L. and Kontisky, K. (eds.) Personality in the Making, New York, 1950.

64 - ممتاز حسین . اردو شاعری میں ۱۹۷۷ء اردو سماج، جامعہ نگر، جدیدیت کی روایت نئی دہلی

65 - یونس جاوید حلقہ ارباب ذوق ۱۹۸۴ مجلس ترقی ادب مکلب روڈ لاہور

66 - فتح محمد ملک تعصبات ۱۹۷۳ مکتبہ فنون، لاہور

67 - رشید امجد نیرا جی ۱۹۹۵ مغربی پاکستان اردو شخصیت اور فن اکیڈمی - لاہور

68 - جمیل جالبی تاریخ ادب اردو ۱۹۷۷ء ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی
جلد اوّل
(قدیم دور)
آغاز سے ۱۷۵۰ء تک

69 - وزیر آغا نئے تناظر ۱۹۷۹ء اردو رائٹرس گلڈ۔ الہ آباد

70 - عصمت جاوید (مترجمہ) ادبی تنقید ۱۹۷۸ء اردو رائٹرس گلڈ الہ آباد۔